رقصِ بسمل ہے
(افسانے)
زاہدہ حنا

رقصِ بسمل ہے

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم
بہ ہر سُو رقصِ بسمل بود شب جائے کہ من بودم

خسرو

زاہدہ حنا

رانا چیمبرز۔ سیکنڈ فلور۔ (چوک پرانی انار کلی)۔ لیک روڈ۔ لاہور

☎ 37231490 - 37310944

ھماری کتابیں.....

خُوبصورت، معیاری اور

کم قیمت کتابیں

تزئین و اہتمام اشاعت

صفدر حسین

alhamd_publication@yahoo.com

ضابطہ:-

اشاعت	: مارچ 2011ء
مطبع	: حاجی حنیف پرنٹرز' لاہور
سرورق	: انعام راجا
تعداد	: پانچ سو
قیمت	: 300 روپے

نیلم حسین کے نام

مصنفہ کا پتہ

E-1 جنید پلازہ۔ راشد منہاس روڈ
گلشن اقبال بلاک 6 کراچی

E-Mail: zahedahina@gmail.com

ترتیب

آنکھوں کو رکھ کے طاق پہ دیکھا کرے کوئی

خوابوں کا بھنور جال ہے اور ختم نہ ہونے والی نیند کا پاتال۔ دل کی دھڑکن، مانیٹر کے اسکرین پر وحشیانہ رقص کرتا ہوا نگتہ، ناگ لوک سے زندگی مجھے ادھر بلاتی ہے جدھر رنگ ہیں، روشنی ہے، راگ ہیں، رقص سجا ہے۔ چراغاں کی چکاچوند سے پرے حاضرین ہیں، ناظرین ہیں۔

وقت، میرِ رقص۔ زندگی اسی کے اشارے پر رقصاں۔ میں سمراٹ سمے کے سامنے سر جھکاتی ہوں اور ریشم میں، رسمساتے ہوئے پنجوں پر چلتی ہوئی روشنی میں آتی ہوں۔ رنگ بھوم کے فرش پر سفید لباس میں لچکتا ہوا میرا بدن۔ ریشمی جوتوں کی بندش میں پھڑکتی ہوئی میری پنڈلیاں۔ وقت کی وردی میرے لیے بج رہی ہے۔ زندگی کے سیج میرے لیے سج رہی ہے۔ میں ...... زویا زیتوف، پرائما بیلے رینا۔ دائرے کھینچتی ہوئی دامنی۔ میں روپ بدلتی ہوئی شہرزاد، جولیٹ اور سنڈریلا ہوں۔ کبھی آنکھوں کی سوئیوں کے ساتھ سوتی ہوئی حسینہ ہوں۔ کسی منظر میں ڈار سے بچھڑا ہوا پرندہ ہوں۔ موسیقی کی لہروں پر تیرتا ہوا، تت کی تہہ میں اترتا ہوا راج ہنس ہوں۔

فرش کو چھوتا ہوا دبیز ریشمی پردہ سرک رہا ہے۔ دیکھنے والے سروقد کھڑے ہوتے جاتے ہیں اور ان کی ہتھیلیوں سے داد کے جھرنے پھوٹتے ہیں۔ شنگرفی مخملیں پردے کی سینکڑوں سلوٹوں کے پیچھے سے میں ناظرین کی نگاہوں میں طلوع ہوتی ہوں۔ پھول میرے قدموں میں گر رہے ہیں، تیز فرشی روشنیوں میں سانس لے رہے ہیں۔ میں

کورنش بجالاتی ہوں، تالیوں کی امنڈتی ہوئی آواز پر سروِرواں کی طرح تیرتی ہوں۔ اور شکن در شکن پردے کے پیچھے غروب ہو جاتی ہوں۔

غروب کی یادیں، بھوکے بھیڑیے۔ یسوع مسیح کے بعد کا برس ایک ہزار نو سو اکیانوے۔ اگست کا بیسواں دن۔ خزاں بڑھتی چلی آتی ہے۔ دریائے ماسکو کا کنارہ۔ نووآرباتسکی پل۔ ہاؤس آف سوویٹس۔ ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں۔ ہزاروں لوگ سڑک پر دھرنا دیے بیٹھے ہیں۔ میں پہچانی جارہی ہوں۔ سپاہیوں کے سر میرے لیے جھک رہے ہیں۔ ایک ٹینک کے دہانے میں ہنستا ہوا گلدستہ مجھے اپنی طرف بلاتا ہے۔ آٹوگراف کے لیے سگریٹ کے پیکٹ اور نوٹ بکیں میری طرف اچھالی جارہی ہیں۔ شہرت کی شراب اور ہنر کا حساب میرے اندر ہے۔ میں ڈھلے ہوئے فولاد کی چکنی سطح پر دائرہ بناتی ہوں۔ تن کی کمان کھنچی ہوئی، حسن پر سان رکھی ہوئی۔ میں اترا رہی ہوں، مجھے داد دینے والے اترا رہے ہیں۔ ہم خوش گمانیوں میں گم کہ نیرنگیٔ زمانہ ہمیں کبھی چھو کر نہیں گزرے گی۔ وقت مسکراتا ہے اور اپنی کمان چڑھاتا ہے۔ ہم اور ہماری آنکھوں میں سانس لیتے ہوئے خواب اس کا شکار۔

مہابلی وقت کی تیر اندازی پر زمین و آسماں حیراں، شہر ویراں، انسان سر بہ گریباں، بادل جن کے مجرئی تھے ان کی گردنوں میں رسیاں۔ چوک میں کھڑا ہوا مارکس زمیں بوس۔ لینن سر بہ زانو۔

جیب بھرے جہاں گردوں کے جھنڈ ہمارے شہروں پر اترتے ہیں۔ نیلامی آغاز ہوتی ہے۔ ہماری نخوتوں اور عصمتوں کی، دیا سلائی کی ایک ڈبیا، ایک غلیظ بوسہ۔ ایک وقت کا کھانا، ایک رات کا عوض۔ اسکاچ کی بوتلیں اور ہماری کنواریوں کے بدن۔ کل تک ہماری عنایتوں کے طلبگار، آج ہمارے خریدار۔ ہم تماشا، ساری دنیا تماشائی۔ بالشوئی ہال، مایا کووسکی، پشکن اور گوگول تھیٹر، ہماری رقاصاؤں اور ہمارے اداکاروں کی عبادت گاہیں، سیاحوں کے عشرت کدے۔

جہاں پناہ وقت نے ہمیں پھیلایا اور پھر سمیٹ لیا۔ کیا ہم اسی سزا کے مستحق تھے؟

ہماری خطائیں کیا بے شمار تھیں اور ہمارے گناہ کیا ان گنت؟

یرمیاہ کی آواز درو بام پر نوحہ کرتی ہے۔ وہ خاتون اقوام بیوہ ہوئی۔ وہ رات کو زار زار روتی ہے۔اس کے آنسو رخساروں پر بہتے ہیں۔اس کے سب پھاٹک سنسان ہیں۔ اس کے کاہن آہیں بھرتے ہیں۔اس کی کنواریاں مصیبت زدہ ہیں اور وہ خود غمگین۔

میں اس نوحے کو سنتی ہوں اور زاری کرتی ہوں۔ ہمارے دلوں سے خوشی جاتی رہی۔ ہمارا رقص ماتم سے بدل گیا۔ رقص، راکھ۔ خواب، خاک۔ شہرت آنی جانی۔ پیروں کی چلت پھرت، انگلیوں کی نرت بھولی بسری کہانی۔

خوابوں کے ریزے کسی کہانی میں بیان ہونے والی آنکھوں کی سوئیاں نہیں جنہیں کوئی شہزادہ نکالتا جائے اور سوتی ہوئی شہزادی جاگتی جائے۔ زندگی کو ایک قرمزی خواب ماننے اور رقص کو اسی خواب کی توسیع جاننے والی میں، زویا زینوف، پرائما بیلے رینا کن قدموں سے چل کر منچ پر جاؤں۔ ذو معنی اشارے کس طرح دیکھوں۔ کسی غیر زبان کے وہ جملے سننے کے لیے ہمت کہاں سے لاؤں جنہیں سمجھنے کے لیے کسی عورت کو کسی مترجم کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ریشمی جوتے طاق پر۔ دماغ کے خلیے، بھڑکتے ہوئے چراغ۔اعصاب، ٹوٹی ہوئی طنابیں، ڈاکٹر ولادیمیر اولیانوف، تین نسلوں سے ہمارا مسیحا۔ اسی نے مما کو پیدا کیا اور پھر مجھے بھی۔ اب وہی دواؤں سے، دلاسوں سے مجھے زندہ رکھنے پر مصر۔

''جس خواب کے سوگ میں تم سب کچھ ترک کیے بیٹھی ہو، وہ اور میں ہم عمر ہیں۔''

''جانتی ہوں اور اسی نتیجے پر پہنچی ہوں کہ سب کچھ لاحاصل ہے۔''

''تم پرائما بیلے رینا۔ ہماری عظیم رقاصہ اور تم بھی حاصل اور لاحاصل کا فرق نہیں جانتیں؟ دم توڑتے ہوئے راج ہنس کا روپ دھارنے والی غم کی طاقت سے واقف نہیں؟''

''رقص میرے بدن سے اور خواب میری آنکھوں سے رخصت ہو گئے۔''

''بدن سے رقص جدا ہوسکتا ہے لیکن خواب آنکھوں میں ہی رہتے ہیں۔ پرانے خواب، نئے خوابوں کو جنم دیتے ہیں۔''

''مجھے تو ہر طرف اندھیرا نظر آتا ہے۔''

''اپنے اندر امید کو زندہ رکھو۔ وہی اندھیرے میں جگنو بن کر تمہیں راستہ دکھائے گی۔''

''یہ سب کتابی باتیں ہیں۔''

''آج رات اپنی کھڑکی سے آسمان کو دیکھنا۔ تمہیں کئی ستارے ٹوٹتے ہوئے نظر آئیں گے لیکن آسمان پھر بھی جگمگاتا رہے گا۔ سات ستاروں کی ناؤ رات کے نیلگوں سمندر میں اسی طرح چلتی رہے گی۔''

میں کلینک سے نکل کر سڑکوں پر پھر رہی ہوں۔ مجھے ڈاکٹر ولادیمیر اولیانوف، مما اور پاپا کے ساتھ گزاری ہوئی بھولی بسری راتیں یاد آرہی ہیں۔ ہم وولگا کے کنارے ہیں۔ پاپا اور ڈاکٹر اپنے چاقوؤں سے خشک ٹہنیاں کاٹ رہے ہیں۔ میں زمین پر گرے ہوئے سوکھے پتے جمع کررہی ہوں۔ مما شکار کی ہوئی مچھلیاں صاف کررہی ہیں۔ یخنی میں ابلتی ہوئی پلمینی کی خوشبو ہے۔ کھانے کے بعد مما اور پاپا ٹہلتے ہوئے شاید دور نکل گئے ہیں۔ میں ڈاکٹر کے زانو پر سر رکھے لیٹی ہوں اور ستاروں کو تک رہی ہوں جو اونچے اونچے پیڑوں کی شاخوں پر ٹکے ہوئے ہیں۔

شام ڈھلے دل کی بے قراری مجھے بالشوئی ہال تک لے جاتی ہے جس کی پیشانی رومن وضع کے آٹھ ستونوں پر قائم ہے۔ اس پیشانی پر حسن زندگی روشنی اور شاعری کا دیوتا اپالو ہے، چار برنجی گھوڑوں کے رتھ میں سوار۔ ایک پیڑ کی اوٹ سے میں اپنی عبادت گاہ کو دیکھتی ہوں جس پر جہاں گردوں کے غول منڈلا رہے ہیں۔

اپنے کمرے کی کھڑکی سے مجھے ٹوٹتے تارے نظر آتے ہیں۔ وولگا کا کنارہ ہے اور گرتے ہوئے تاروں کی بجھتی ہوئی روشنی۔ رات سے دریا کی سرگوشیاں ہیں۔ ہواؤں کے جھولے میں خوشبو کی مدہوشیاں۔ دل کا جنگل ہے۔ خواہشوں کے خشک پیڑ ہیں۔

میں ان کی ٹہنیاں تراشتی ہوں اور الاؤ جلاتی ہوں۔

روشن الاؤ کے حاشیے پر ایک ننھی پری رقص کر رہی ہے۔

''کون ہو تم؟''

''میں ندیژدا ہوں۔ آپ مجھے نہیں پہچانتیں؟''

''کون ندیژدا؟''

''آپ کی امید۔''

اس کی آواز میرے دل میں اتر جاتی ہے۔ میں بے قرار ہو کر بانہیں پھیلاتی ہوں ''میں تم پر نثار ندیژدا۔ آؤ میرے پاس آ جاؤ۔'' وہ ہنستے ہوئے میری بانہوں میں آ رہی ہے۔ میں روتے ہوئے اسے چوم رہی ہوں۔ ندیژدا۔ امید۔ نئی زویا۔ میں اپنی بیٹی خواب کلیسا کے نام کروں گی۔ زمانہ مجھ پر نامہربان ہوا، اس پر مہربان ہوگا۔ ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا۔ میری تخلیق، میری توسیع، میری تعبیر۔

تم جیت گئے اور تم ہار گئے ڈاکٹر ولادیمیر اولیانوف۔ تم مجھے زندہ رکھنے کے خواہاں اور تم ہی نے میری آنکھوں میں وہ خواب رکھ دیا جس کی قیمت زندگی ہے۔ برسوں پہلے تم نے بتایا تھا کہ میں اپنی زندگی دے کر ہی ماں بن سکتی ہوں۔ میرا دل پیدائش کے لمحے سے چھدا ہوا۔ تقدیر کا تیر اس میں پہلی سانس سے اترا ہوا۔ ایک نئی زندگی کے بارے میں پہلے کبھی سوچا بھی نہ تھا لیکن اب جبکہ سب کچھ رائیگاں ہے، جان دے کر نئی زندگی کی خریداری کا فیصلہ کس قدر سہل ہے۔

کچھ دنوں پہلے مجھ پر فدا ہونے والوں کی کمی نہ تھی لیکن اب ان میں سے کوئی نظر نہیں آتا۔ میری نگاہوں میں ریڈیو ماسکو کی اردو سروس سے وابستہ احمر کا چہرہ گھوم جاتا ہے۔ مما ''رادوگا کتاب گھر'' سے متعلق۔ احمر ان کے شعبے میں روسی سے اردو کا مترجم۔ صبح و شام ہمارے گھر آنے والا۔ میرا نروس بریک ڈاؤن ہوا تو اس نے اپنا ہر فارغ لمحہ میرے ساتھ گزارا۔ ہونٹوں سے کچھ نہ کہہ کر سب کچھ آنکھوں سے کہا۔ جاں نثار مہمان۔ دل شکستہ میزبان۔

میرا فیصلہ سب کو حیران کر دیتا ہے۔ رجسٹریشن آفس میں یکجائی کی کارروائی کے بعد شب کو ضیافت ہے۔ دوست ہیں، چند رشتہ دار ہیں۔ مما بھی موجود ہیں، دل کا غبار چہرے پر پھیلا ہوا۔ ڈاکٹر ولادیمیر اولیانوف کی پیشانی پر شکن ہے۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر ایک طرف لے جاتا ہے۔ ''میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں لیکن ماں بننے کی غلطی ہرگز نہ کرنا۔ جان سے چلی جاؤ گی۔''

میں اسے دیکھتی ہوں اور مسکراتے ہوئے سر ہلاتی ہوں۔ ہنستا ہوا احمر شیمپین کی بوتل کھولتا ہے۔ جھاگ اس کے ہاتھ پر گر رہا ہے۔ خوشیاں شیمپین کا ابال۔ احمر نہیں جانتا، ڈاکٹر ولادیمیر اولیانوف نہیں جانتا کہ آج سے میں وعدہ آن پہنچنے کا انتظار کروں گی۔

کئی مہینوں بعد دل کا پہلا دورہ۔ مفلسی نے ہم سب پر اپنے پنکھ پھیلا دیے ہیں۔ علاج اب عیاشی ہے سو میں چند ہی دنوں میں گھر آ جاتی ہوں۔ چند دنوں کی ندیژدا مجھ میں پرورش پا رہی ہے۔ ندیژدا۔ امید۔ زندگی کا جگنو۔

میں ایک اجنبی ڈاکٹر کے کلینک کا رخ کرتی ہوں۔ ''اس بوجھ سے فوراً نجات پاؤ، ورنہ مر جاؤ گی۔'' وہ سنک پر ہاتھ دھوتے ہوئے کہتا ہے۔ میں فرمانبرداری سے سر ہلاتی ہوں اور رخصت ہو جاتی ہوں۔

ہفتے مہینوں میں بدل رہے ہیں۔ ڈاکٹر ولادیمیر اور مما مجھ سے بے پناہ ناراض ہیں۔ ان دونوں نے احمر کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ وہ بھی ان کا ہم زباں۔ میں اسے جھوٹی تسلیاں دیتی ہوں۔ ''ڈاکٹروں کا کیا ہے کچھ بھی کہہ دیتے ہیں۔ دل کی اسی حالت کے ساتھ میں نے آٹھ برس کی عمر سے رقص سیکھا ہے۔ روزانہ گھنٹوں ریاض کرتی رہی ہوں۔ پیرس، لندن، نیویارک اور دِلّی کے دورے کیے ہیں۔

احمر کی سمجھ میں نہیں آتا۔ میری مانے یا ڈاکٹر کی۔ وہ ہر دم مجھے اپنی توجہ کے حصار میں رکھتا ہے۔

سورج ساتویں برج میزان میں آیا۔ چوتھی اکتوبر 1993ء۔ کیوتوزوسکی پروسپکٹ

کا علاقہ ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں سے بھرا ہوا۔ ماسکو کی سڑکوں پر شہریوں اور فوجیوں کے درمیان جھڑپیں کئی دن سے جاری۔ ''ہاؤس آف سوویٹس'' جسے اب ''وہائٹ ہاؤس'' کہتے ہیں اس کے حاشیے پر اونچے اونچے پیڑوں کی قطار۔ تانبے کی رنگت کے پتوں کا رقصِ خزاں۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا۔ فضا تناؤ طیش اور تحیر سے بھری ہوئی۔ تین اکتوبر کو ایک اور ''خونیں اتوار'' ہماری تاریخ کا حصہ بن چکا۔ پارلیمنٹ میں پناہ لینے والوں پر کھانا اور پانی بند۔ بجلی کٹ چکی۔ اس کی کھڑکیوں میں شمعیں جھلملاتی ہیں۔ ٹیلی وژن ہاؤس کے سامنے آدھی رات کو مارے جانے والوں کی لاشیں اٹھائی نہیں گئیں۔ خدا معلوم کس کس کے لہو کی لالہ کاری ہے۔

رات میں احمر دیر تک جاگتا رہا تھا، اب سو رہا ہے۔ میری بے قراری مجھے منہ اندھیرے نووآرباتسکی برج تک لے آتی ہے۔ صبح کے سات بج رہے ہیں اچانک دریا کے کنارے سے گولیاں چلتی ہیں۔ وہائٹ ہاؤس کی کھڑکیوں سے اس کا جواب دیا جاتا ہے۔ ٹینکوں کے دہانے گولے اگل رہے ہیں۔ سب مشین گنیں چل رہی ہیں۔ کھڑکیاں ریزہ ریزہ۔ نچلی منزلوں پر گہری آگ۔ کچھ فاصلے پر وہ ٹیکری ہے جس پر کھڑے ہو کر نپولین بونا پارٹ نے ماسکو کو جلتے ہوئے دیکھا تھا۔ آج ٹیکری پر کوئی نپولین نہیں اور شہر جل رہا ہے۔ کپتان کی بیٹی۔ مردہ روحیں۔ اینا کرینے نینا۔ کرامازوف برادران۔ بیتے دن اور کنوارے کھیت جل رہے ہیں۔ حکایتوں کی تفسیریں اور روغنی تصویریں جل رہی ہیں۔ زمینِ کوئے جاناں آج پہچانی نہیں جاتی۔

پل پر کھڑے ہوئے کئی لوگ مارے جاچکے۔ احمر مجھے ڈھونڈتا ہوا وہاں آجاتا ہے۔ ''چلو گھر چلو۔'' وہ مجھے اس فلیٹ میں لے جاتا ہے جسے وہ ''گھر'' کہتا ہے۔

پانچویں اکتوبر۔ ہم دونوں فلیٹ کی کھڑکیوں سے دریا میں جھلکتی ہوئی روشنیاں دیکھ رہے ہیں۔

''میں گھر جانا چاہتی ہوں۔''

وہ چونک کر دیکھتا ہے۔ ''ہم گھر میں ہی تو ہیں۔''

''میں تمہارے گھر کی بات کر رہی ہوں۔''

''وہ تو کراچی میں ہے۔''

''ہاں ...... میں وہیں جانا چاہتی ہوں۔'' رہیے اب ایسی جگہ چل کے جہاں کوئی نہ ہو۔ ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو۔

ترکِ وطن، پاتال کا سفر۔ ہوائیں اور فضائیں اجنبی۔ چہروں سے شناسائی نہیں، لفظوں سے آشنائی نہیں۔ احمر کے گھر والے میرے ناز اٹھاتے ہیں۔ ریڈیو ماسکو سے احمر کا معاہدہ ختم ہونے میں ابھی کچھ دن ہیں۔ میں اس کے جانے سے پہلے ایک شاندار تقریب میں بہت سے لوگوں کے درمیان دلہن بنی ہوئی۔ احمر کے کئی دوست ڈاکٹر ہیں۔ وہ مجھے دیکھ کر پریشان ہوتے ہیں۔ وہ بھی ڈاکٹر ولادیمیر کے ہم زبان، ہم خیال۔

احمر کے بابا کی اسٹڈی، میرے لیے ایک حیرت کدہ۔ مارکس اور لینن ماسکو کی شاہراہوں پر زمیں بوس۔ یہاں وہ دونوں ایک اونچے طاق پر بیٹھے ہوئے مسکراتے ہیں۔ کتابیں قطار در قطار۔ مارکس ازم۔ لینن ازم۔ روسی ادب۔ زمانہ اس کمرے میں تھما کھڑا ہے۔

ندیژدا کی آمد میں چند ہفتے۔ ہر لمحہ مشکل سے گزر رہا ہے۔ ہر گھڑی اذیت کی گھڑی ہے۔ پیدائش کے لمحے سے میرا چھدا ہوا دل، ہم دونوں کی سانسوں کا بوجھ اٹھاتے ہوئے تھکنے لگتا ہے۔ میں ڈاکٹروں میں گھری ہوئی۔ آکسیجن ماسک پہن کر روزانہ گھنٹوں گہرے سانس لیتی ہوئی۔ زندگی کی رہ جانے والی ساعتوں کا شمار کرتی ہوئی۔ خواہش کرتی ہوئی کہ موت مجھے میری امید، میری ندیژدا کو دیکھنے کی مہلت ضرور دے۔

ندیژدا کی آمد کے لمحے، آپریشن کے سوا چارہ نہیں اور انیستھیسیا کا استعمال ممکن نہیں۔ میرے بدن کو انجکشن سے سن کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹروں کے اور میرے درمیان ایک سفید اسکرین۔ تھکی ہوئی آنکھوں سے میں نقاب میں چھپے ہوئے چہرے، سروں کی

جنبش ہاتھوں اور آنکھوں کی حرکت اور چمکتے ہوئے نشتر دیکھتی ہوں۔ انجکشنوں کا اثر ختم ہو رہا ہے۔ درد میرے وجود کے چیتھڑے اڑا رہا ہے۔ میں اپنی کراہیں سن رہی ہوں۔ پھر ایک ننھی سی چیخ۔ ندیژدا کی ایک جھلک اور پھر گہری نیند۔

میں کچھ جاگ رہی ہوں۔ کچھ سو رہی ہوں۔ سانس دہری دھار کا خنجر ہے۔ ندیژدا میرے پہلو میں ہے۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اسے چھوتی ہوں، لرزتے ہوئے ہونٹوں سے اسے چومتی ہوں اور بے اختیار مہابلی وقت کے سامنے ماتھا ٹیک دیتی ہوں۔ زندہ رہنے کے لیے کچھ اور مہلت۔ ندیژدا کو دیکھنے اور چاہنے کے لیے کچھ اور ساعتیں۔ فلک جاہ، گردوں پناہ وقت میرے جھکے ہوئے سر پر نظر ڈالتا ہے اور میری طرف سے پیٹھ پھیر لیتا ہے۔

مانیٹر کے اسکرین پر وحشیانہ رقص کرتا ہوا نقطہ تھم رہا ہے۔ زندگی جلاوطن کی جا رہی ہے۔ مما اور احمر ابھی تک نہیں آئے۔ احمر کی ماں اسے گود میں لے کر مجھ پر جھکی ہوئی ہیں۔ وہ اسے میرا چہرہ دکھا رہی ہیں۔ میں تیرتی ہوئی اس کی طرف بڑھتی ہوں۔ ''تم خواب کلیسا کے نام کی گئیں۔'' میں اسے بتاتی ہوں ''اندھیری رات میں تم امید کا جگنو ہو۔'' وہ مسکراتی ہے، میں اسے خوابوں کی ردا اوڑھا رہی ہوں۔

مانیٹر کے اسکرین پر گہری تاریکی ہے۔ نقطہ اندھیروں میں ڈوب گیا۔ سکھ کے دریا میں دائروں ایسی نیند ہے اور میں ان دائروں میں اتر رہی ہوں۔ خواب برف کا بستر۔ نیند برف کی چادر۔ مما اور احمر کا انتظار ہو رہا ہے۔ میں برف میں سو رہی ہوں۔

چاروں طرف ہجوم ہے۔ میں تماشا، لوگ تماشائی۔ سیاہ پوش مما میرے سرہانے دو زانو۔ برف رخساروں، برف پیشانی اور برف آنکھوں کو چومتی ہوئی۔ انا پاولوا کے ساتھ اس کا راج ہنس کا سٹیوم گیا تھا تو پھر میں زویا زیئوف، پرائما بیلے رینا، زاد سفر کے بغیر کیسے چلی جاؤں؟ میں اپنے ریشمی جوتے، راج ہنس کی پوشاک اور سنڈریلا کی گرگابیاں مانگتی ہوں لیکن میری آواز کسی تک نہیں پہنچتی۔

ہتھوڑے کی آواز سینے میں کیل کی طرح اتر رہی ہے۔ شاہ بلوط سے بنے ہوئے

منچ پر اڑان بھرنے والی، دیودار کے جنگل سے جلاوطن لکڑی کے تابوت میں سمارہی ہے۔ عروسی جوڑے کا زرتار دوپٹہ مجھ پر جھلملا رہا ہے۔ کوئی اوڑھے چنزیا سوت ہے۔ میں اجنبی شانوں پر سفر کررہی ہوں۔ نماز آخر پڑھی جارہی ہے۔ سلام پھیرنے والے گواہ رہیں کہ خوابوں کو خدا جانئے والی خیال کی سلامتی کے ساتھ رخصت ہوئی۔ خاک خاک میں۔ راکھ راکھ میں۔ آپ اپنی آگ کے خس وخاشاک ہوگئے۔ ابدی مکان کی گہرائی اور تماشائی۔ ہتھیلیوں سے داد کے جھرنے نہیں پھوٹتے۔ ہاتھ خاک کا پردہ گراتے ہیں۔ کھیل اپنے انت کو پہنچ رہا ہے۔ آنکھوں کو رکھ کے طاق پہ دیکھا کرے کوئی، وقت، میر رقص کا اشارہ، دھرتی کا چھوٹتا ہوا کنارہ۔ خوابوں کا بھنور جال اور ختم نہ ہونے والی نیند کا پاتال۔

پانیوں پر بہتی پناہ

برسات کی بوجھل ہوا کٹھل، کیلے اور آم کے پتوں میں کسمسائی اور کنارے سے بندھی ہوئی ناؤ لہروں پر ڈگمگائی۔

کندن حسین نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ گہرے بادلوں کی چادر تھی اور اس کے سائے میں تنہائی تھی۔ دریا پر بچھی ہوئی اور لہروں میں گھلی ہوئی۔ خوف تھا اندھیرے کی کوکھ سے نکلا ہوا اور فضا میں پھیلا ہوا۔

ناؤ کے دوسرے کونے سے رحیم چاچا کے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی اور کنارے پر بولتے ہوئے جھینگروں اور مینڈکوں کی آواز کے ساتھ رل مل رہی تھی۔ اسے اپنا گھر یاد آیا۔ دو کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ جس کی اینٹوں اور دیواروں کو اندیشے کبھی چھو کر نہیں گزرے تھے، جس میں بنگالی، ہندوستانی اور مغربی موسیقی تیرتی تھی، کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں، ایک الماری کے اوپر رکھا ہوا نٹ راج۔ ایک طاق پر سیلونی مہاتما بدھ مسکراتے ہیں اور دوسرے طاق پر کارل مارکس کی مورتی۔ دیواروں پر مغل منی ایچرز ہیں، زین العابدین کے پرنٹ ہیں، کوی گرو اور قاضی نذرل کے پورٹریٹ ہیں اور اس کی اپنی تصویریں ہیں۔ سنسان منظروں اور ویران کھنڈروں کے ساتھ۔

ان تصویروں کی اور اب کی تنہائی میں کیسا فرق تھا۔ پہلے کی تنہائی ...... اداسی تھی؛

دکھ اور درد میں گندھی ہوئی اور اب کی تنہائی...... خوف کا آسمان تھا اور دہشت کا دشت بے اماں، جس میں دور دور تک بچھی ہوئی اندیشوں کی بارودی سرنگیں تھیں۔ کوئی اسے پہچان نہ لے۔ اس کی جان کے دشمنوں تک یہ خبر نہ پہنچ جائے کہ وہ فلاں جگہ دیکھی گئی ہے، پھر اسے گھیر لیا جائے جیسے سندر بن میں رہنے والے شیر اور چیتے گھیرے جاتے ہیں اور ان کا شکار کیا جاتا ہے...... ان کی کھالیں مہنگے داموں بکتی ہیں اس کا سر سونے کے بھاؤ بکے گا......

اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اماں ٹھیک ہی کہتی تھیں کہ جس پر جیسی گزرنی ہوتی ہے اس کی پہلے سے عادت ہو جاتی ہے۔

تنہائی کے ساتھ رہنے کی اسے پرانی عادت نہ ہوتی تو وہ یہ میلوں لمبے دن اور کوسوں لمبی راتیں کیسے گزارتی؟ لیکن تنہائی کے پہلے دور میں اس کی خوف سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ دوستوں اور دشمنوں کی اور خود اپنی نظر میں وہ بہادر تھی، نڈر تھی، خوف کا کوئی بادل کبھی اس پر سے سایہ کرتا ہوا نہیں گزرا تھا جبکہ اب وہ مہینوں سے خوف کے حصار میں تھی۔ سانس روکے ہوئے، اپنے سائے سے بھی ڈرتی ہوئی، اپنے گھر کی چہار دیواری کی پناہ میں سونے کی لذت سے محروم۔ دوستوں کی دوسراہٹ کی سرشاری اس سے چھن گئی تھی اور اپنی کتابوں کو چھونے کی خواہش اس کی انگلیوں کی پوروں پر سسکتی تھی۔ اس کی ہڈیوں کے گودے میں دہشت بیٹھ گئی تھی اور رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو میں خوف کا زہر گھل گیا تھا۔

اس نے بہت دنوں پہلے ایک کہانی پڑھی تھی۔ شاید آئزک آسیموف جس میں ایک مفرور انسان کے اندر خوف اور امید کی ساری لڑائی اس کی شریانوں اور وریدوں میں لڑی گئی تھی۔ اس کے تمام خواب شریانوں میں روپہلی اور سنہری مچھلیاں بن کر رہتے تھے اور خوف اندیشوں اور وسوسوں کا سیاہ جال پھیلائے ان خوابوں کو شکار کرتا رہتا تھا۔

ان دنوں اکثر اسے محسوس ہوتا کہ وہ اس کہانی کا کردار بن گئی ہے۔ خوف اس کے خوابوں کو نگل رہا ہے، دہشت کے اندھے جال میں اس کا دم گھٹ رہا ہے۔

گہرا سانس لینے کی کوشش کرتے ہوئے اسے خاکستری رنگ کا وہ لفافہ یاد آیا جو کئی ہاتھوں سے گزر کر رحیم چاچا تک پہنچا تھا اور جو انہوں نے کئی دن پہلے اسے لا کر دیا تھا۔ سلمیٰ کا خط وصول کر کے اسے اچنبھا سا ہوا تھا۔ وہ دونوں یونیورسٹی میں ساتھ پڑھے۔ سلمیٰ سلامت حسین فارن سکریٹری کی بیٹی، مہالکھ پتی مانک میاں کی منگیتر۔ کندن حسین کی ودھوا ماں نے ریڈیو پر خبریں پڑھ کر اور کویتائیں لکھ کر اسے تن تنہا پالا۔ کندن سائیکل رکشہ پر یونیورسٹی جانے کا خواب نہیں دیکھ سکتی تھی۔ سلمیٰ سلامت حسین گاڑی پر آتی۔ آخری دنوں میں کچھ دوستی سی ہوگئی تھی لیکن اب اتنی گہری بھی نہیں کہ اتنے برے وقت میں سلمیٰ اسے اتنی محبت سے یاد کرے۔

سلمیٰ سلامت حسین نے کندن کی طرف دوستی کا ہاتھ پہلی مرتبہ اس وقت بڑھایا تھا جب کندن کی ایک کہانی انگریزی میں ترجمہ ہو کر GRANTA میں چھپی اور ساری یونیورسٹی میں اس کی دھوم مچ گئی حالانکہ اس سے پہلے کی کتنی ہی کہانیاں بنگلہ میں چھپ چکی تھیں۔ سلمیٰ کا خط پڑھ کر اسے وہ دن یاد آئے جب وہ اخبار میں کام کرتی تھی، اس کا دوسرا ناول شائع ہو چکا تھا، بہت سے لوگ اس سے ناراض تھے۔ اس کے خلاف بیان دیے جا رہے تھے، سزائیں تجویز ہو رہی تھیں۔ تب ایک دن سلمیٰ کا فون آیا اور کندن کے انکار کے باوجود اس نے اپنی کوٹھی پر اس کے ساتھ ایک شام کا اہتمام کر لیا۔ اب وہ سلمیٰ سلامت حسین کی بجائے سلمیٰ مانک میاں تھی۔ اس کی بیس کمروں والی دو منزلہ کوٹھی دولت اور اقتدار کا مقناطیس محل تھی جس کی طرف امیر کبیر، سفیر، وزیر، تاجر، شاعر، کلاکار اور پترکار کھنچے چلے جاتے تھے۔

اس کی یاد سلمیٰ کو دوبارہ اس وقت آئی جب اس کے تیسرے ناول میں بہت سے

لوگوں کو اپنے چہرے نظر آئے۔ کندن کا ناول آئینہ نہ تھا جو توڑ دیا جاتا، سو اسے جلایا جانے لگا۔ ان ہی دنوں میں سے کوئی دن تھا جب سلمیٰ اس سے ملنے اس کے دفتر چلی آئی۔ دوپہر کا وقت تھا، گرمی تھی اور وہ اسے اٹھا کر ڈھاکہ کلب لے گئی۔ اس کے پاس انگلینڈ کے وہ اخبار تھے جن میں کندن کے ناول پر تبصرے تھے، اس کی تصویریں تھیں۔

اس روز ڈھاکہ کلب میں سلمیٰ مانک میاں نے اسے اپنے دوستوں سے ملایا۔ بڑے بڑے نام، اونچے اونچے عہدے۔ اس نے انہیں انگلینڈ کے اخبار دکھائے۔ یونیورسٹی کے دنوں کو یاد کرتی رہی جب سب ساتھ تھے اور کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ ان کی کلاس فیلو، ان کی اپنی کندن، انٹرنیشنل سیلے بریٹی ہونے والی ہے۔ اس نے اپنے دوستوں کو کندن کی وہ عادتیں بتائی تھیں جن کا علم خود کندن کو نہ تھا اور وہ اپنی ہنسی چھپاتی رہی تھی۔

رحیم چاچا نے جب سے سلمیٰ مانک میاں کا خط اسے لا کر دیا تھا، اس کے دن اور اس کی راتیں کشمکش میں گزر رہی تھیں۔

اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ وہ اس طرح دو دل ہوئی تھی۔ جب بھی وہ کوئی فیصلہ کرنے لگتی رحیم چاچا کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے ابھر آتا۔ پھر اس نے سوچا کہ سلمیٰ کو رحیم چاچا کے بارے میں لکھے گی۔ اسے بتائے گی کہ وہ ان کی ناؤ میں رہتی ہے جو پنساری کی تیرتی ہوئی دکان ہے جس میں کبھی کبھار وہ مسافروں کو بٹھا کر اس گھاٹ سے اُس گھاٹ اتار دیتے ہیں لیکن ان کا زیادہ وقت سودا بیچتے ہوئے گزرتا ہے۔ کسی کنارے سے انہیں پکارا جائے اور وہاں کئی عورتیں، بچے اور مرد کھڑے ہوئے اپنا اپنا سودا مانگ رہے ہوں تو وہ...... کندن حسین...... جس کا نام سویڈن سے انگلینڈ تک چھپتا ہے، جس کی کتابیں دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر ساری دنیا میں بک رہی ہیں، اپنے دیش میں جس کی کتابیں جلائی جا رہی ہیں، جس کے سر کی قیمت دو لاکھ ٹکا ہے اور جو اپنے خون کے پیاسوں سے

چھپتی پھر رہی ہے، وہی کندن حسین اپنے ہاتھ سے کتاب یا گھٹنے پر دھری ہوئی کاپی اور قلم ایک طرف رکھ کر ساڑی کا پلو اڑس کر چائے کی پڑیا باندھنے لگتی ہے۔ رحیم چاچا کی "نہیں۔نہیں" کے باوجود گڑ، چاول یا دال تولنے لگتی ہے۔ ایسی کسی دکان سے تو اب سلمیٰ مانک میاں کے نوکر بھی کچھ نہیں خریدتے ہوں گے تو پھر وہ سلمیٰ کو کس طرح سمجھا سکتی ہے کہ اپنے اندر نقب لگا کر بیٹھ جانے والے خوف سے لڑتے ہوئے وہ شہر میں کسی دوست کے مکان کو جائے پناہ سمجھنے کی بجائے رحیم چاچا کے ساتھ کیوں ماری ماری پھر رہی ہے جن سے اس کا کوئی ناتا نہیں، جنہوں نے اس کی کوئی کہانی نہیں پڑھی، جو اس کا فلسفہ نہیں سمجھتے۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ سلمیٰ مانک میاں کو بوڑھے سانتیا گو کا لافانی کردار یاد دلائے گی جس پر ان سب نے یونیورسٹی میں کتنی بحثیں کی تھیں۔ وہ لکھے گی کہ خلیج بنگال کے رحیم چاچا کو سمجھنا ہے تو خلیج میکسیکو کے بوڑھے مچھیرے سانتیا گو کو یاد کرو جو سمندر کی سفاکی سے لڑا تھا، جس کے ہاتھ اپنے عظیم تر، حسین تر اور شان دار شکار کو سنبھالتے ہوئے، شارک مچھلیوں کے جبڑوں سے اپنے شکار کو بچاتے ہوئے زندگی کے درد سے تڑختے تھے، جو فطرت کی نرمی اور اس کی قہرمانی کو سمجھتا تھا اور ہوائیں جس سے کلام کرتی تھیں ...... بوڑھا سانتیا گو بھی ادب، تاریخ اور فلسفہ نہیں جانتا تھا اور رحیم چاچا بھی اسی جیسے ہیں، اسی لیے نڈر اور بہادر ہیں، صابر اور شاکر ہیں......

سوچتے سوچتے تھک کر اس نے رات کی سیاہ آنکھوں میں جھانکا جن میں سے نکل کر پانچ سروں والے عفریت منہ زور سانڈنیوں پر سوار اس کی طرف بڑھے چلے آتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تلوار، تیر، بھالے اور خنجر تھے، ان کے شانوں پر کمانیں اور کمر میں کمندیں تھیں۔ وہ اندھا دھند بھاگنے لگی پھر بھاگتے بھاگتے تھک گئی۔ وہ کندن حسین سے ہرنی بنی لیکن انہوں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا...... اس نے سہمی ہوئی فاختہ کا روپ دھارا اور اڑتی چلی گئی...... ان کی رفتار کے آگے اس کی اڑان بھی گرد تھی...... وہ

مچھلی بنی اور جھیل میں اتر گئی، پانچ سروں والے سانڈنی سوار پانی میں اترے اور جل مانس بن گئے، اپنی دُمیں پھنکارتے ہوئے، اپنے ہاتھوں میں بڑے بڑے سیاہ جال لہراتے ہوئے۔ تب خوف نے اسے پتھر کا کیا اور وہ زور زور سے رونے لگی۔

اس کی آنکھ اپنی ہی آواز سے کھلی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اسی لمحے تیز ہوا چلی اور ناؤ ڈگمگائی۔ زمین پر رہنے والی کے لیے بہتے ہوئے پانی پر رہنے کا تجربہ کتنا عجیب تھا، طبیعت کیسی گھبراتی تھی۔ کتنی مرتبہ اس نے پلٹ کر گھر جانا چاہا تھا، وہ اپنا مقدمہ لڑنا چاہتی تھی، کسی شہر میں اینٹ اور گارے سے بنے ہوئے مکان میں رہنا چاہتی تھی لیکن ہر بار کسی نہ کسی کونے سے اس کے دشمن نکل کر سامنے آ گئے تھے۔ ان کے منہ سے بہتے ہوئے زہر کے گرداب تھے اور الزام و اتہام کے تیروں کی باڑھیں تھیں۔ تب ہی اسے پلٹ کر اس ناؤ میں آنا پڑا تھا جو اس کے لیے پانی پر بہتی پناہ تھی۔

کہاں چاندنی راتوں میں دوستوں کے ساتھ دریاؤں اور باغوں کی سیریں، کھلے ہوئے کمل، گندھوراج اور روجنی گندھا کی اوس سے بھیگی ہوئی پتیاں، کشن بھوگ، گوپال بھوگ اور جامن کے جھومتے ہوئے چھتنار پیڑ، ہوا سے لچکتے ہوئے ڈھاک، کٹھل اور کیلے کے پتے، سپاری اور تاڑ اور نیرل کے کنج اور پان کے پنواڑ میں جگنو بھرے ہوئے، چمپا اور شیفالی اور کرشنا چوڑا کی ڈالیوں سے پھول گرتے ہوئے اور ان کے درمیان وہ سب پھولوں کی سگندھ سے مہکتے ہوئے، خوشی کی مدرا سے مست بہکتے ہوئے اور کہاں خوف کی بو سے ٹھٹھری ہوئی راتیں اور وسوسوں کی دلدل میں دھنستے ہوئے دن۔

اب ہر طرف دہشت کو اوڑھے ہوئے تنہائی تھی۔

تنہائی کے اس تالاب میں چند آوازیں تھیں جو دائرے بناتی تھیں اور اسے ان دائروں کی جانب بلاتی تھیں۔ پیڑوں اور پتوں سے پون کے لپٹنے، کنارے کی طرف تیرتی ہوئی مرغابیوں کے پروں کو جھٹکنے، پھولوں پر مدھو مکھی کے گونجنے، دھان کے کھیت

میں ٹڈوں کے پھدکنے، جامن اور کٹھل کی ٹہنیوں کے ٹوٹنے کی آوازیں اب اس سے باتیں کرتی تھیں۔ وہ ناؤ کی گگر سے ٹیک لگائے بیٹھی ہے۔ کشتی کا پہلو بانس کے جھنڈ سے رگڑ کھا رہا ہے، کبھی ندی میں کوئی موڑ مڑتے ہوئے ہوا کے ساتھ لہریں لیتے ہوئے دھان کی پنیری کا کھیت سامنے آ گیا ہے اور ناؤ درمیان سے گزر رہی ہے۔ دھان کی لچکتی ہوئی پنیری کا ہرا سمندر اس کے چہرے کو چھو رہا ہے اس سے کچھ کہہ رہا ہے۔ چند لحظوں بعد وہ آوازیں تھم جاتی ہیں اور ناؤ پھر سے ندی میں بہتی چلی جا رہی ہے۔

ناؤ کے دوسرے کونے سے رحیم چاچا کے خراٹوں کی آواز تسلسل سے آ رہی تھی جو کبھی اس کی طرف بڑھتے ہوئے قاتل قدموں کی چاپ اور کبھی زہریلی پھنکاروں کی بازگشت میں ڈھل رہی تھی۔

اسے وہ دن یاد آیا جب اس نے دھوپ سے جھلسے ہوئے، بھوک سے سوکھے ہوئے اور دکھ سے سہمے ہوئے رحیم چاچا کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ ان کی ایک ہی بیٹی تھی جو انہوں نے اپنے سگے بھتیجے کو بیاہی تھی جس نے اسے دان دہیز نہ لانے کی سزا میں جلا کر مار دیا۔ بیٹی سوکھی لکڑی کی طرح جل گئی تو رحیم چاچا فریاد لے کر تھانے گئے جہاں سے وہ دھتکارے گئے پھر جانے کس نے انہیں کندن کے اخبار کا پتا بتا دیا۔ وہ سوکھی ہوئی آنکھیں اور چھلکتا ہوا دل لے کر کندن تک پہنچے تو اس نے اخبار میں گُم گُم کی تصویر اور اس کی بپتا چھاپ دی اور ان کے بھتیجے کو گرفتار بھی کرا دیا۔ لیکن پھر برادری کا دربار بیٹھا۔ رحیم چاچا کا نر خون جس سے بھائی کی نسل آگے چلے گی، بیٹی؟ رحیم چاچا کا مادہ خون جو خاک میں مل چکا۔ رحیم چاچا نے گمچھے سے اپنے آنسو پونچھے، دربار کے فیصلے کے سامنے سر جھکایا اور تھانے جا کر بیان لکھوایا کہ ان کا بھتیجا بے گناہ ہے۔ اصل میں تو ان کی گُم گُم کی ساڑی کا پلو چولہے میں جا گرا تھا...... قاتل چھوٹ کر آ گیا۔ قاتلوں اور مقتولوں کی نسل آگے چلانے کے لیے۔ کندن غصے سے پاگل ہو گئی۔

''آپ نے ایسا کیسے ہونے دیا؟ گُم گُم کا خون معاف کیسے کردیا آپ نے؟''

رحیم چاچا زمین پر بیٹھے روتے رہے کچھ دیر بعد انہوں نے اپنا چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا ''گُم گُم جل گئی ...... تم تو ہو...... تم پر کوئی آفت آئی تو میں کسی دربار کا حکم نہیں مانوں گا۔''

کہنے والا اور سننے والی دونوں نہیں جانتے تھے کہ آنے والے دن ان کے لیے کیا لے کر آرہے ہیں۔

تنہائی کے جال میں یادیں رو ہو مچھلی کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھیں۔

وہ جمعہ کی ایک حبس زدہ دوپہر تھی جب کسی نے کندن کے فلیٹ کا دروازہ پیٹ ڈالا۔ جھنجھلائی ہوئی کندن نے دروازہ کھولا تو سامنے سوکھے اور سہمے ہوئے رحیم چاچا کھڑے تھے۔ ننگے پیر، ننگے سر، ہونٹوں پر پپڑیاں، سانس پیٹ میں نہیں سما رہا تھا۔ ٹوٹے پھوٹے جملوں میں انہوں نے بتایا کہ وہ جمعہ پڑھنے مسجد گئے تھے جہاں خطبے میں اس کے قتل کا فتویٰ دیتے ہوئے اس کے سر کی قیمت دو لاکھ ٹکا لگائی گئی ہے اسی لیے وہ اپنی پھٹی ہوئی جوتیاں اور جمعہ چھوڑ کر اس کے گھر آئے ہیں۔

وہ ان کی بات سن کر ہنس دی تھی ''ارے چھوڑیے بھی رحیم چاچا۔ دو لاکھ ٹکا تو بہت ہوتا ہے۔ بھلا کسی کو کیا پڑی ہے کہ میرے قتل پر اتنے روپے خرچ کرے۔''

رحیم چاچا نے پہلی مرتبہ غصے سے ڈانٹا اور بلند آواز میں کہا ''جلدی کرو۔ انہوں نے گُم گُم کو جلا دیا تھا، وہ تمہارا سر کاٹ دیں گے۔ جلدی کرو۔''

''لیکن رحیم چاچا میں اپنا گھر، اپنی کتابیں چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں؟'' اس نے حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

''کوئی بدلیش تھوڑا ہی جا رہی ہو...... دو چار دن میں لوٹ آنا۔''

''لیکن رحیم چاچا......''

انہوں نے اس کی بات کاٹ دی تھی ''میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تم پر آفت آئی تو میں کسی دربار کا حکم نہیں مانوں گا۔''

اس نے انہیں سمجھا بجھا کر واپس بھیجنا چاہا تو وہ اس کے قدموں میں گر گئے اور آخر کار اسے اپنے چند جوڑے سمیٹ کر ان کے ساتھ جانا ہی پڑا تھا۔

اس روز جمعہ پڑھ کر نمازیوں کا جلوس اس کے سر کی قیمت آپس میں بانٹ لینے کے لیے جب اس کے فلیٹ پہنچا تو انہیں اس لیے ناکام لوٹنا پڑا کہ وہ بوڑھی گنگا کنارے رحیم چاچا کی ناؤ میں تھی۔ اسی روز سے وہ اس کے کسٹوڈین بن گئے تھے۔ اس روز کے بعد کئی مرتبہ اس نے اپنے گھر پلٹنا چاہا لیکن ہر بار اسے یہی معلوم ہوا تھا کہ اس کے گھر جانے والے ہر راستے پر موت کا پہرا ہے۔ کہانیوں کی چھل پائیاں اور دیو اس جنم میں کسی سنگھٹن، کسی پریشد کے صدر اور نائب صدر تھے، کسی اخبار کسی رسالے کے ایڈیٹر اور ڈپٹی ایڈیٹر تھے۔ فلاں کا سر اتار دو...... فلاں کی کتاب جلا دو...... فلاں کی زبان گدی سے کھینچ لو...... فلاں کی انگلیاں کتر دو......

رحیم چاچا اس کے ہیرو تھے، جان کی امان چاہنے والیاں شہزادوں کی پناہ میں جاتی تھیں، وہ رحیم چاچا کی حفاظت میں تھی۔ اس کے دوستوں سے رابطے کرنا، اس کے کولیگ امان الرحمٰن کے پاس اس کے نام آنے والے خط سمیٹ کر لانا۔ یہ سب کچھ ان کی ذمہ داری تھی۔ وہ جنہوں نے زندگی میں کبھی ہزار ٹکا اپنی مٹھی میں نہیں پکڑا تھا، وہی اس کے رکھوالے تھے جس کے سر کی قیمت فتوؤں کے بازار میں دو لاکھ ٹکا تھی۔

ان کے ساتھ رہتے ہوئے اسے مہینوں ہو چکے تھے۔ وہ اس سے کم کم کلام کرتے لیکن جب بھی دہشت کی دلدل اسے نگلنے لگتی، وہ خوف کی خندق میں گرنے لگتی جانے کس طرح انہیں معلوم ہو جاتا اور وہ اس کے قریب آ بیٹھتے پھر چند جملے بول کر اسے کبھی دلدل اور کبھی خندق میں سے نکال لاتے۔

یوں بھی سورج نکلتا تو خوف، کاؤنٹ ڈراکیولا کی طرح دن کے تابوت میں جا سوتا اور رات کی پہلی سانس کے ساتھ ہی زندہ ہو کر اس کی شہ رگ میں اپنے دانت اتار دیتا۔ وہ اس کی ہمت کو کترنے لگتا' اس کی طاقت کو رگوں سے نچوڑ لیتا۔ اس کے لبادے سے کریہہ صورت، سبز رنگ چمگادڑیں نکلتیں اور اس پر جھپٹ پڑتیں۔ وہ اپنے قلم کی نوک سے ایک چمگادڑ کو مارتی تو اس کے خون کے قطروں سے دس اور چمگادڑیں پیدا ہو جاتیں اور اس کی آنکھوں کو نوچنے کے لیے اپنے پنجے بڑھاتیں۔

کندن کا دم گھٹنے لگا تو اس نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر گہرا سانس لینا چاہا...... فضا میں ہر طرف چڑیوں کی چہکار تھی۔ آسمان پر پو پھٹ چکی تھی اور آسمان کا اجالا پانی میں گھل رہا تھا۔ کندن کو پھریری سی آئی۔ یہ پہلا دن تھا جب صبح ہونے کے بعد بھی خوف اس کے تن اور من سے جدا نہیں ہوا تھا۔

اس کی نگاہوں کے سامنے کل دوپہر کی پچھل پائی سرخ آنکھیں نکالے، اپنی مڑی ہوئی ایڑیوں پر ناچنے لگی۔ یہ کل کی دوپہر تھی یا کالی دیوی ...... جس کی زبان سے خون ٹپکتا تھا، جس کی تینوں آنکھیں نشے میں دھت شرابی کی طرح لال تھیں، جس کے گلے میں کھوپڑیوں کا ہار تھا، جس کے ایک ہاتھ میں پھندا، دوسرے میں پھٹوانگا، تیسرے میں کھڈک اور چوتھے میں کٹا ہوا سر تھا۔

کل اس نے ان انسانوں کو دیکھا تھا جن کے سروں کی جگہ ہانڈیاں تھیں اور ان میں نفرت ابلتی تھی۔ اسے جلاتی ہوئی، اس کی روح پر آبلے ڈالتی ہوئی۔ ان کے منہ کے اندر پھنکارتے ہوئے دومونہے سانپ تھے اسے ڈستے ہوئے، خوف کا زہر اس کے اندر اتارتے ہوئے۔

اپنے خلاف ہونے والے مظاہروں کے بارے میں کندن نے اخباروں میں پڑھا تھا، ٹرانزسٹر پر ان کی خبریں سنی تھیں، لیکن کل پہلی مرتبہ خود سے کی جانے والی نفرت

سے اس کا سامنا ہوا تھا۔کل اسے جھلتا اور کپکپاتا ہوا بخار چڑھا تھا اور ان مہینوں میں اسے پہلی مرتبہ کسی ڈاکٹر کی ضرورت پڑی تھی۔ وہ سوچتی رہی تھی، کیا کرے؟ کیا نہ کرے؟ پھر اسے خیال آیا تھا کہ چھوٹے موٹے ڈاکٹروں کے پاس اخبار پڑھنے کی اور ان میں چھپنے والی تصویروں کو دیکھنے کی فرصت بھلا کب ہوتی ہے جو ان میں سے کوئی اسے پہچانے، سو اس نے رحیم چاچا سے کہا۔ وہ اپنا جمعہ چھوڑ کر کہیں سے ایک جانکار رکشے والے کو ڈھونڈ لائے اور کندن کو بٹھا کر اس ڈاکٹر کی طرف چل پڑے جس نے کبھی گُم گُم کا علاج کیا تھا اور گھاٹ سے تین میل دور رہتا تھا۔

تیز بخار کے باوجود جانی پہچانی سڑکوں سے گزرنا، مانوس عمارتوں کو پھر سے دیکھنا کندن کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ رکشہ ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ ایک جلوس ان کے راستے میں آ کھڑا ہوا۔ بخار کی شدت سے کانپتی ہوئی کندن نے پہلے اسے کوئی عام سا جلوس سمجھا لیکن چند ہی لمحوں بعد وہ جان گئی کہ یہ اس کے خلاف ہر دوسرے تیسرے دن نکالے جانے والے جلوسوں میں سے ایک ہے۔

سڑک لوگوں کے غصے اور ان کی ناراضگی سے چھلک رہی تھی۔ لہراتے ہوئے ہاتھ، آگ لگاتے ہوئے نعرے۔ مردہ باد...... مردہ باد۔ اس نے ساڑی کا آنچل منہ پر کھینچ لیا اور رکشے کے ایک کونے میں سمٹ گئی۔

”کوئی مجھے دیکھ نہ لے...... کوئی پہچان نہ جائے......“

بڑی سڑک سے ملنے والی گلی میں اس کا رکشہ سب سے آگے تھا اور وہ اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے لوگوں کے دلوں میں بھڑکتی ہوئی نفرت کی تپش اپنے تن پر محسوس کر سکتی تھی۔ سامنے آگ کا دھارا تھا اور پیچھے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے رکشوں کی قطاریں۔ نہ آگے جانے کی راہ، نہ پیچھے پلٹنے کا راستہ۔

”کندن حسین کو پھانسی دو...... پھانسی دو۔“

وہ دیکھ رہی تھی، وہ سن رہی تھی۔ اس کے تن کا ریشہ ریشہ دیکھ رہا تھا، اس کے بدن کا رواں رواں سن رہا تھا۔ رحیم چاچا اپنے سمٹے ہوئے وجود کو پھیلا کر اس پر چھا جانے کی، اسے چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی انگلیوں میں دبی ہوئی بیڑی کانپ رہی تھی۔ پھر اس انسانی دھارے میں ہلچل مچ گئی۔ پولیس نے جلوس کے اگلے حصے پر لاٹھی چارج کیا تھا۔ اس نے آنسو گیس کے گولے چلنے کی آواز سنی۔ دھارا پلٹ رہا تھا، لوگ بھاگ رہے تھے، گلیوں میں گھس رہے تھے۔ لوگ کھانس رہے تھے، وہ بھی کھانس رہی تھی۔ حلق میں کڑواہٹ بھر رہی تھی۔ اس کی' رحیم چاچا، رکشے والا، بھاگنے والے، سب ہی کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بڑی سڑک لوگوں سے خالی ہوگئی۔ سڑک پر اینٹیں، پتھر، بھاگنے والوں کی چپلیں اور ایک چھاتا رہ گیا جو قدموں کے نیچے آ کر روندا گیا تھا۔ اس کی تیلیاں ٹوٹ گئی تھیں، کپڑا پھٹ گیا تھا...... چھاتے کی مڑی تڑی اور کچلی ہوئی لاش۔

لرزتی ہوئی کندن نے اسے دیکھا۔ ان ہزاروں لوگوں کو اگر معلوم ہو جاتا کہ ان کی نفرت کا نشانہ بننے والی اس وقت ان کے درمیان ہے تو کیا وہ اسے روند نہ دیتے؟ اس سے پہلے کتنی ہی عورتیں گزرے ہوئے چند برسوں میں پتھر برسا کر اور کوڑے مار کر ہلاک کی گئی تھیں کیونکہ وہ محکوم و بے بس تھیں اور خود اس کا جرم اپنے سماج کے بارے میں وہ سب کچھ لکھ دینا تھا جو اب تک نہیں لکھا گیا تھا...... کیا وہ اس کے گلے میں رسی باندھ کر اسے سڑکوں پر گھسیٹتے نہ پھرتے؟

وہ پتر کار تھی۔ اس نے اس سے دس اور بیس گنا بڑے جلوس دیکھے تھے۔ اخبار کے لیے ان کی رپورٹنگ کی تھی اور اب ہفتوں سے اپنے خلاف نکلنے والے جلوسوں کا حال پڑھ رہی تھی۔ بی بی سی کی بنگلہ سروس میں بیس ہزار تیس ہزار کے جلوس کی پھنکارتی ہوئی آوازوں کی ریکارڈنگ سن چکی تھی۔ خوف ہر لحظہ اس کے اندر کنڈلی مارے بیٹھا رہتا،

اسے ڈستا رہتا لیکن اب جبکہ اس نے خود سے کی جانے والی نفرت کو کچلے ہوئے سانپ کی طرح پھنکارتے دیکھا تو اس نفرت نے اس کے تن بدن سے توانائی کو اور رگوں سے لہو کو نچوڑ لیا تھا۔ خوف کی چمگادڑیں اس کی شہ رگ سے چمٹی ہوئی تھیں، وہ تڑپ رہی تھی، کانپ رہی تھی۔ وہ جسے اپنے حوصلے، اپنی ہمت پر مان تھا، جس کا خیال تھا کہ وہ خوف کو شکست دیدے گی، وہی خود سے کی جانے والی نفرت کے سامنے لرز رہی تھی، گھٹی ہوئی چیخیں اس کے حلق میں قیدی پرندوں کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ رحیم چاچا اسے جھنجھوڑ رہے تھے، اپنی بوڑھی بانہوں میں سنبھال رہے تھے، دلاسہ دے رہے تھے۔ انہوں نے رکشے والے سے پلٹنے کو کہا تھا اور اسے واپس ناؤ میں لے آئے تھے جہاں پہنچ کر وہ ٹوٹے ہوئے پنکھ والی مینا کی طرح گر پڑی تھی۔ انہوں نے جڑی بوٹیاں ابال کر اسے زبردستی پلائی تھیں اور ایک کونے میں بیٹھے چپ چاپ اسے دیکھتے رہے تھے۔

شام ڈھلی تو رحیم چاچا نے بھات اور مچھلی کی تھالی اس کے سامنے لا کر رکھ دی۔ اس کا بخار ٹوٹ گیا تھا لیکن خوف نے بھوک کو نگل لیا تھا اور معدے میں دہشت کی گرہیں تھیں ...... وہ چپ چاپ سمٹی سکڑی لیٹی رہی ...... بہت دیر بعد رحیم چاچا مچھلی بھات کی بھری ہوئی تھالی خاموشی سے اٹھا کر لے گئے۔

رات آئی پر نیند کو ساتھ نہ لائی۔ رحیم چاچا نے روز کی طرح پھونک مار کر لالٹین بجھائی اور ناؤ کے دوسرے کونے میں جا سوئے۔ کچھ دیر میں ان کے خراٹے اس تک آنے لگے اور اس کے ساتھ ہی ہجوم اس پر جھپٹ پڑا، اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے لگا۔ ہر طرف لوگ تھے، ان کی نفرت تھی اور اس نفرت کی چمکتی ہوئی دھار تھی۔ اس کے لیے کہیں کوئی شوستا کو وچ نہیں تھا، اس کی پانچویں سمفنی نہیں تھی جس نے دہشت اور خوف اور نفرت کے مارے ہوؤں کی رگوں میں بہتے ہوئے تمام وسوسوں اور واہموں کو نچوڑ لیا تھا۔ نہیں ...... اس کی رگوں سے خوف کی فصد کھولنے والا ایسا کوئی راگ نہ تھا۔

تب اسے سلمیٰ مانک میاں کا خط یاد آیا۔ پہلے پہل وہ اس خط کو نکال کر پھر سے پڑھنے کی خواہش سے لڑتی رہی لیکن دہشت باڑھ پر آئے ہوئے دریا کی طرح اسے نگل رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر لرزتی ہوئی انگلیوں سے لالٹین کی لو بڑھائی اور اس کی روشنی میں اٹیچی کیس سے خاکستری رنگ کا وہ لفافہ نکالا جس میں سلمیٰ مانک میاں کا خط تھا، اس کے بھجوائے ہوئے پانچ ہزار ٹکے کے نئے کرارے نوٹ تھے۔

سلمیٰ مانک میاں نے لکھا تھا کہ میں اور مانک دونوں ہی تمہارے لیے پریشان ہیں۔ ہم دونوں چاہتے ہیں کہ مولویوں کے چنگل سے بچ کر تم یورپ یا امریکہ نکل جاؤ جہاں کی حکومتیں تم سے ہمدردی رکھتی ہیں، جہاں کے اخباروں نے تم پر بہت کچھ لکھا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ تم کہاں ہو، کس حال میں ہو اسی لیے پانچ ہزار ٹکا بھی بھیج رہی ہوں۔ میرا خط ملتے ہی میرے پاس چلی آؤ، بڑے فوجی افسر، بدیشی ڈپلومیٹ اور بی بی سی کا نمائندہ سب ہی جانتے ہیں کہ تم میری سکھی' میری کلاس فیلو ہو...... میں نے انہیں بتایا ہے کہ تم سے میرا رابطہ ہے۔ وہ سب تمہیں یہاں سے نکالنے میں ہماری مدد کریں گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انٹیریئر منسٹر مانک میاں کا ہم نوالہ ہم پیالہ ہے۔

یہ سلمیٰ مانک میاں کے لکھے ہوئے لفظ تھے یا لائٹ ہاؤس کی کھڑکی میں روشن لالٹین جو اندھیرے میں جہازوں کو راستہ دکھاتی ہے؟ جہازیوں کو زمین کے قریب ہونے کی خبر دیتی ہے؟ اس نے خط کو پھر سے کئی مرتبہ پڑھا پھر لفافے کو تکیے کے نیچے رکھ کر لالٹین کی لو نیچی کردی اور تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ تکیے کے نیچے سے لائٹ ہاؤس کی روشن کھڑکی اسے راستہ دکھا رہی تھی۔

آدھی رات کے بعد تکیے کے نیچے سے آوازیں آتی رہیں ...... کوئی اسے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ بیس کمروں والا دو منزلہ چمبک محل اسے پکار رہا تھا۔

اسے ماں سے سنی ہوئی اس چمبک پہاڑ کی کہانی یاد آئی، طوفان جس کی طرف کسی

جہاز کو دھکیل دیتا تو اس کے تختوں کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھنے والی کیلیں، میخیں اور فولادی پتر سب بے قراری سے اس پہاڑ کی طرف کھنچے چلے جاتے اور اپنے جوڑوں پر سے کھل جانے والے تختے جو کبھی ''جہاز'' کہلاتے تھے کسی سمندری گرداب میں پھنس کر ریزہ ریزہ ہو جاتے۔

اب جبکہ پو پھٹ چکی تھی اور رات رخصت ہو چکی تھی تب بھی اسے ڈراتی ہوئی اور اس کا گلا دباتی ہوئی نفرتیں اسے سلمیٰ مانک کی طرف دھکیل رہی تھیں۔ اس نے بے قرار ہو کر دریا میں ہاتھ ڈالا۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ اس نے چلو میں پانی بھرا اور منہ پر چھپکا مارا۔ جلتی ہوئی آنکھ ٹھنڈی ہونے لگی۔ اسی وقت آہٹ سی ہوئی۔ کندن نے پلٹ کر دیکھا۔ رحیم چاچا نے چائے کا پیالہ اس کے سامنے رکھا اور اپنا پیالہ سنبھال کر ناؤ کے فرش پر اکڑوں بیٹھ گئے۔

رحیم چاچا نے گرم چائے کا گھونٹ لیا، بیڑی کا گہرا کش لگایا اور کندن کی طرف دیکھا۔ کندن نے نگاہیں جھکا لیں۔ اس کی نظروں میں سینکڑوں لوگوں کے قدموں سے روندا جانے والا چھاتا ابھرا۔ ٹوٹی ہوئی تیلیاں، پھٹا ہوا کپڑا۔ اسے سردی لگنے لگی۔ خوف کا بھنور اسے نگلنے لگا۔ ڈوبتی ہوئی کندن حسین نے خاکستری لفافے کو تکیے کے نیچے سے نکال کر مضبوطی سے تھام لیا۔

''سلمیٰ سکھی ...... سلمیٰ سکھی۔'' ڈوبتی ہوئی کندن حسین نے سلمیٰ مانک میاں کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

رحیم چاچا نے لفافے کی طرف اور اس کی طرف دیکھا۔

''تمہیں اب بھی ڈر لگ رہا ہے؟''

''ہاں۔ رحیم چاچا۔'' کندن کی آواز کمزور تھی۔

''طوفان گزر جانے کے بعد بھی مجھے ڈر لگے ہے تو میں اپنا نوکا لے کر دریا میں

دور تک نکل جاؤں ہوں ...... طوفان کو ڈھونڈتا ہوا ...... مرجانے والے انسانوں اور جانوروں کی لاشیں دیکھتا ہوا۔ پھر دریا میرے دل سے سارا ڈر، سارا بھئے دھو دے ہے۔"

"لیکن میں کون سا نوکا لے کر کس دریا میں نکلوں؟" کندن نے بے بسی سے پوچھا۔

"کیسی لکھنے والی ہو کہ "مردہ باد ...... مردہ باد سے ڈر گئیں۔ بھئے سے بچنا چاہتی ہو تو لکھو اور خوب لکھو۔" رحیم چاچا کے لہجے میں غصہ تھا، جھنجھلاہٹ تھی۔ انہوں نے اپنی بجھی ہوئی بیڑی کو چٹکی سے ہوا میں اڑا دیا۔

کندن نے حیرت سے اُس ان پڑھ بوڑھے کو دیکھا جس کی ساری زندگی مسجدوں میں سجدے کرتے گزری تھی لیکن جس نے اس کی قضا ٹالنے کی لیے اپنی نماز قضا کردی تھی، جسے غربت نے کبھی ہزار ٹکے کی جھلک بھی نہیں دکھائی تھی اور جو اس کے دو لاکھ ٹکوں کے مول والے سر کا رکھوالا تھا۔ اس کے سامنے زمینوں اور زمانوں میں سانس لیتا ہوا، زندگی کے زاویوں کو سمجھتا ہوا غیر فانی بوڑھا اکڑوں بیٹھا تھا اور نئی بیڑی سلگا رہا تھا۔

دس لاکھ برس پہلے ظاہر ہونے والے انسان کی ہزارہا نسلیں کندن حسین کے سامنے سے ماتم کرتی ہوئی گزر گئیں۔ ہم مٹی میں ملائے گئے ...... ہم آگ میں جلائے گئے ...... ہم پانی میں بہائے گئے ...... سب ہی چلے گئے تھے، سب ہی کو چلے جانا تھا۔ کائنات کا دل بہلانے کے لیے کوئی دوسری کائنات نہ تھی، وقت کی دوسراہٹ کے لیے کوئی دوسرا وقت موجود نہ تھا۔ جب کائنات اور کہکشائیں اور کواکب تنہا ہیں اور مر رہے ہیں تو پھر کندن حسین تمہاری کیا حیثیت، کیا حقیقت ہے؟ تم تنہائی سے اور موت سے کیوں خوفزدہ ہو ...... مقدر سے بھلا کیا ڈرنا؟

اس نے نظر بھر کر اس بوڑھے کو دیکھا جسے طوفان سے ڈر لگے تو اسی کی تلاش میں

نکلتا تھا اور خوف کو دریاؤں کے پانی سے دھوتا تھا۔ اسے بوڑھا سانتیاگو یاد آیا جس نے کہا تھا ''مرتے دم تک میں مقابلہ کروں گا۔''

اس نے خاکستری لفافے سے پانچ ہزار ٹکے کے نوٹ نکالے اور رحیم چاچا کی طرف بڑھا دیے۔

''انہیں آج ہی امان الرحمٰن کو واپس کر آئیں۔ اس سے کہہ دیں کہ یہ سلمٰی مانک میاں کی امانت ہے، اسی کو لوٹا دی جائے۔'' اب اس کے ہاتھ میں وہ خط رہ گیا تھا جو چمپک محل سے بھیجا گیا تھا اور طوفان میں گھرے ہوئے کسی بھی جہاز کو کھینچ کر ٹکڑے ٹکڑے کرسکتا تھا۔

وہ خط اس نے ہولے سے پانی میں ڈال دیا جس نے اسے پل چھن نگل لیا۔

معدوم ابنِ معدوم......

بجلی سرِ شام چلی گئی تھی اور ابھی تک نہیں آئی تھی۔

پُرسے کے لیے آنے والے ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے تھے۔

کرنل معصوم حسین گول کمرے میں اب تنہا تھے۔

چاندی کے شمع دان میں جلتی ہوئی شمعوں کی روشنی ہواؤں کی زد میں تھی۔ جھکے ہوئے کندھوں والا مرلی دھر دبے قدموں اندر آیا، چائے کی جھوٹی پیالیاں سمیٹ کر کشتی میں رکھیں، ایک نظر مالک پر ڈالی اور مُچھے سے آنسو پونچھتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

کرنل معصوم حسین کی تھکی ہوئی نگاہ دیوار پر بھٹکی، خاکستری رنگ کی ہرن کی کھال۔ گہری سیاہ اور شنجرفی روشنائی سے لکھے ہوئے نام۔ ان کا، جعفر اور علی اکبر کا نام۔ نگاہ دیوار سے اتر کر راکھ سے بھرے ہوئے اگردان پر رکی، اگر کی سوگوار خوشبو کمرے میں حلقہ باندھ رہی تھی۔ چاند کو شام کے بادل سے اٹھا لائے حسین ...... نوجواں کو...... ارے ہاں نوجواں کو...... سہ دری کی کائی لگی محرابوں پر، گول کمرے کی دیواروں پر چھریوں کا ماتم ہوتا رہا۔

کرنل معصوم نے پنجشاخے کی بجھتی ہوئی روشنی میں اپنی بوڑھی ہتھیلیوں پر تقدیر کے لکھے کو پڑھنے کی کوشش کی پھر کھدر کے سفید کرتے کی آستین پر بیٹھے ہوئے پتنگے کو انگلی کے اشارے سے اڑا دیا۔ پتنگا ان کی انگلی کی ضرب سے بچتے ہوئے زور سے

ہنسا...... دیوار سے چپکی ہوئی چھپکلی نے آنکھیں مچکائیں، کرنل معصوم کو دیکھا، پھر اس پتنگے کو جو قریب آ بیٹھا تھا اور ہنسے جا رہا تھا۔ اس کی زبان لپکی اور پتنگے کو چٹ کر گئی۔ چھپکلی سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر دیمک محلہ تھا۔ چھت اور دیوار کی درز میں گہرے بھورے رنگ کی لکیر کھینچتا ہوا۔ عصائے سلیمانی کو، تخت بلقیس کو محلوں اور مقبروں کو کھا جانے والی دیمک، گھر کی دیواروں، دروازوں اور چوکھٹوں کو کھا رہی تھی۔ دیمک محلے کی آبادی نے ہرن کی اس کھال کو دیکھا جو ناموں سے بھری ہوئی تھی اور دیوار پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس پر لکھے ہوئے بیشتر ناموں کے بدن بجو کھا چکے تھے اب ان کے نام کھائے جانے والے تھے۔ وقت کی انگشت شہادت، انسان کا شجرہ لکھ رہی تھی۔ معدوم ابنِ معدوم ابنِ معدوم۔

امام باندی کی بے سری آواز نے پھر ان کا تعاقب کیا...... ارے ہاں لاش اکبر کی جو جنگل سے اٹھا لائے حسین ...... اٹھا لائے حسین ...... سہ دری میں اور برساتی میں جلتی ہوئی گیس بتیوں نے امام باندی کا ساتھ دیتے ہوئے سسکی بھری۔

ان کی نگاہوں میں جعفر حسین کا چہرہ ابھرا، ان کا اکلوتا بیٹا جو پٹنہ انجینئرنگ یونیورسٹی سے انجینئر بن کر نکلا تھا، ٹاٹا نگر میں جسے ملازمت مل گئی تھی اور جو اپنی پھوپھی کے بے حد اصرار پر صرف دس دن کے لیے کراچی گیا تھا۔ بتول فاطمہ جانتی تھیں کہ بھائی کانگریسی ہیں، سرحد عبور نہیں کریں گے، اسی لیے انہوں نے معصوم حسین سے تو کچھ نہیں کہا تھا لیکن بھتیجے کو بلانے کے لیے ڈاک بٹھا دی تھی۔ ''میاں تمہاری اماں، تمہارے باوا تو ہماری خوشی میں شریک نہیں ہونے کے...... ان کے لیے تو موئی کانگریس ان کا کنم ہے۔ تم ہی آ کر بہن کو رخصت کرو۔ اور ہاں جب آئیو تو چاندی کا طشت اور چاندی کی چھوٹی بڑی منجھولی پانچ مچھلیاں لیتے آئیو۔ یہاں تو کوئی مچھلی نما عطردان سے آشنا ہی نہیں۔ نہ کوئی کٹک کا نام جانتا ہے جہاں کے چاندی کے کام پر انگریز میمیں بھی فدا تھیں۔ میں تو میاں، ولایت تک ہو آئی لیکن ایسا نفیس و نازک کام نہ دیکھا، نہ سنا۔ خیر میاں مچھلیاں آئیں نہ آئیں، تم خود آ جاؤ،

بس یہ جانو کہ پھوپھی کی آنکھوں کے کواڑ اکلوتے بھتیجے کے لیے کھلے ہیں۔''

معصوم حسین نے بیٹے کے جانے کی مخالفت کی تو سپہر آرا نے سمجھایا ''ارے خوشی سے جانے دیجیے، جعفر بھلا ننھا نادان ہے ارے جب ہم یہاں ہیں، وہ ہماری ہر چیز کا اکلوتا وارث ہے، تو باؤلا ہوا ہے کہ وہاں کا ہو رہے؟''

کچھ سپہر آرا کے دلاسے، کچھ جعفر حسین کی ضد، معصوم حسین چپ ہو گئے تھے۔

سپہر آرا نے انہیں چاندی کا طشت اور اس میں جگجگاتی ہوئی مچھلیاں دکھائیں، بدن کا وہ لوچ کہ سچ مچ کی مچھلیوں کا گمان ہوا۔ آنکھوں کی جگہ یاقوت، کھٹکے سے کھل جانے والے سروں سے عطر کی لپٹیں اٹھتی ہوئی۔

''جاؤ میاں، جیسے پیٹھ دکھا رہے، ویسے منہ دکھائیو۔'' ماں نے بیٹے کو امام ضامن کی ضامنی میں دیتے ہوئے دس دن کے لیے رخصت کیا لیکن پھر وہ دس دن کبھی تمام نہ ہوئے۔ سطوت کے مانجھے کی شام جعفر نے جب جگمگاتے ہوئے جھاڑ کے نیچے ڈھولک کوستی ہوئی ثروت کو دیکھا تو اس کی رگوں میں دوڑتا ہوا لہو ماہتابی کی طرح جل اٹھا۔ ہارسنگھار کے پھول کی ڈنٹھیوں سے رنگا ہوا ململ کا کلف لگا زرد کرتا، زرد دوپٹہ، اس پر ٹنکی ہوئی گوٹے کی نازک سی بیل، جھاڑ کی روشنی ثروت کے چہرے پر چراغاں کرتی ہوئی۔ ثروت نے ایک ادا سے سر کو جھٹکا، انگلیاں ڈھولک پر تھرکیں اور پھر اس کی آواز کا عطر سارے میں پھیل گیا...... کانوں تری بالیاں سوہیں اور موتیوں کی جوڑی، کھٹکے، تیرے زیب بنو...... بازو بند ڈھیلے......

جعفر نے زندگی سر جھکا کر نصابی کتابیں پڑھتے اور کل پرزوں کے نقشے کھینچتے گزاری تھی۔ حسن کی اور آواز کی اور خوشبو کی یہ چکا چوند، یہ تال میل، یہ لہر بہر تو اسے چھو کر نہیں گزری تھی۔ وہ ساحل پر کھڑا ڈوبتا گیا...... سیچوں تری شال دوشالے اور تکیوں کی جوڑی...... بنڑا تیرا زیب بنو......

جعفر کے لیے زندگی اسی لمحے آغاز ہوئی۔

پھوپھی نے بھتیجے کو بیٹی پر واری صدقے ہوتے دیکھا تو نہالوں نہال ہو گئیں۔

''دیکھتی ہوں بھیا اور بھابھی اب کیسے نگوڑ ماری کانگریس کے کلیجے سے لگے بیٹھے رہتے ہیں۔ ارے اکلوتا پوت جہاں رہے، بوڑھے ماں باپ بھی وہیں کھنچے چلے آتے ہیں۔'' انہوں نے میاں سے کہا جو سٹلمنٹ کمشنر تھے اور جن کے قلم کی جنبش سے لوگ فقیر سے امیر ہو رہے تھے۔ ان کے اشارۂ ابرو سے جعفر بجلی اور پانی کے محکمے میں انجنیئر ہوا اور پھر ان ہی کی رضا سے بہن نے بھائی کو خط لکھ کر بھتیجے کی اعلیٰ ملازمت کی مبارکباد دی اور اس کو اپنی دامادی میں لینے کی خواہش کا اظہار کیا۔

کرنل معصوم حسین نے بہن کا خط پڑھا اور سپہر آرا کو پڑھوائے بغیر اس کے پرزے کر دیے۔ بیوی سے کہا تو بس اتنا کہ ''جعفر اب واپس نہیں آئے گا۔'' سپہر آرا نے رو رو کر جل تھل کر دیا۔ لیکن معصوم حسین کی آنکھوں سے ایک آنسو نہیں ٹپکا۔ بہن کے کئی خط آئے ''بس چند دنوں کے لیے آپ اور بھابھی آ جائیں، جعفر میاں کو اپنے ہاتھ سے سہرا باندھیں۔''

سپہر آرا بیٹے کی شادی میں شرکت کے لیے کیا کیا نہ تڑپیں لیکن معصوم حسین کی ''نہیں'' ...... ''ہاں'' میں نہ بدل سکی۔

''وہ کوہ ندا ہے سپہر آرا۔ وہاں جانے والے لوٹ کر نہیں آتے'' کرنل معصوم نے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا تھا۔ کرنل معصوم اور سپہر آرا کے خواب و خیال میں بھی کبھی نہیں آیا تھا کہ اکلوتا بیٹا جیتے جی یوں چھٹ جائے گا۔ وہ جو ہر ایک کے وطن چھوڑ کر چل پڑنے پر ہنستے تھے، اب دنیا ان کی ہنسی اڑاتی تھی۔ جعفر نے کراچی میں کلیم کیا اور معصوم حسین کے حصے میں کسٹوڈین کے قبضے کا زخم آیا۔ باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا ...... گوشت کا ناخن سے جدا ہو جانا ...... جدا ہو جانا۔ اپنے دوستوں اور سیاسی حلیفوں کو وہ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ ''جعفر نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟'' ہر رات یہ سوال ان کے سینے میں خنجر اتارتا۔ وہ چھوٹی بہن سے ہر رات یہ پوچھتے ''تمہاری بیٹی کے لیے وہاں رشتے بھلا کم تھے؟ میرے بیٹے پر غاصبانہ قبضہ کیوں کیا تم نے؟''

آہستہ آہستہ سپہر آرا کو صبر آ گیا، انہوں نے پاکستان سے آنے والی بیٹے بہو

کی تصویروں سے اپنے گھر کی دیواریں بھردیں اور پھراس کے یہاں اولاد کے لیے آس پاس اور دور دراز کی درگاہوں میں منتیں مانگتی رہیں۔ سالہا سال کی منتیں مرادیں رنگ لائیں بھی کب کہ جب ڈھاکہ ڈھے چکا تھا، ہندوستان اور پاکستان کے درمیان خط و کتابت بند تھی، فون نہیں ہوسکتا تھا، سفر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پوتے کی پیدائش کی خبر لندن سے آئی تو وہ ہونٹوں سے ہنستی اور آنکھوں سے روتی رہی تھیں۔

سرحدیں کھلیں تو سپہر آرا نے بیٹے کو خط لکھا کہ میاں دو چار دن کے لیے ہی سہی آکر مل جاؤ، پوتے کا منہ دکھا جاؤ لیکن جعفر بھی اپنے باپ کا بیٹا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مجھے بلانے کی بجائے آپ لوگ کیوں نہیں یہاں آتے؟ یہاں میرے پاس کیا کچھ نہیں ہے۔ میری حیثیت، میری عزت، میری دولت پر لوگ رشک کرتے ہیں لیکن آپ لوگ سو برس پرانے مکان کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں جس کی بنیادوں میں دیمک لگ چکی۔

بیٹے کا خط باپ نے پڑھا تو دل میں ہوک سی اٹھی۔ جی چاہا کہ ایک خط لکھیں جس میں اسے یاد دلائیں کہ دیمک تو عصائے سلیمانی میں بھی لگ گئی تھی پھر ہم کیا اور ہمارا گھر کیا۔ لیکن انہوں نے اس کے جانے کے بعد اسے کبھی خط نہیں لکھا تھا تو اس چھوٹی بات کے لیے قلم کیا اٹھاتے۔

ہر رات سونے سے پہلے یہی خیال انہیں ستاتا تھا کہ ان کے کسی حریف نے نہیں، خود ان کے اپنے خون نے انہیں شکست دی تھی۔ سالہا سال تک وہ اپنے قریبی سیاسی حلقے میں ایک مشکوک فرد رہے تھے۔ ان کی اپنی پارٹی کے کئی لوگ ہنس ہنس کر ان پر طنز کے تیر چلاتے رہے تھے۔ ''ارے بابو ایک ہی ٹھوتو بیٹا رہا ہمرے کرنل بھیا کا۔ دیکھ لیہو ایک دن ای بھی پُھر سے اُڑ جیہیں۔''

کیدار ناتھ شرما، محفل میں دوست، پارٹی میٹنگ میں دشمن، برسوں ان کے سامنے ہنس ہنس کر اس مصرعہ کی تکرار کرتے رہے تھے کہ ''بھیا کا جانا ٹھہر گیا ہے، صبح گئے یا شام گئے۔'' انہوں نے کیدار ناتھ شرما سے کبھی کچھ نہیں کہا تھا اور کہیں نہیں گئے

تھے۔ اپنا سر اٹھائے ہوئے اپنی مٹی پر چلتے رہے تھے۔ اپنے باغات کی دیکھ ریکھ کرتے رہے تھے، گنگا کا پانی پیتے رہے تھے اور گندک کی سیر کرتے رہے تھے۔ عصائے پیری نہیں رہا تو کیا ہوا؟ ان کے کمرے کی ایک دیوار پر چھڑیوں کی قطاریں تھیں۔ افقی انداز میں آنکڑوں میں رکھی ہوئی۔ اس کا دستہ ہاتھی دانت کا ہے، اس پر چاندی کا مٹھ ہے، یہ ملک شام سے آئی ہے، اسے میں نے لندن میں خریدا تھا۔ وہ اپنی چھڑیوں کی تفصیل اپنے دوستوں کو بتاتے اور جب بھی غیر ملکی دورے پر جاتے وہاں سے چھڑی ضرور خرید لاتے۔ ان کی خلیری بہن نے جو عمر میں ان سے بڑی تھیں، ایک بار چیخ کر کہہ ہی دیا تھا ''ارے بھیا کاہے کو لکڑیوں کا یہ ڈھیر لگاتے ہو؟ کوہ طور سے عصائے موسیٰ خرید لاؤ تب بھی عصائے پیری کی جگہ نہ لے سکے گا۔''

کرنل معصوم نے اپنی خلیری بہن کو دیکھا تھا اور تیکھے لہجے میں بول پڑے تھے۔ ''آپ کا گمان ہے بوبو۔ یہ میرا شوق ہے اور بس۔'' اور پھر تیزی سے سہ دری کی سیڑھیاں اتر گئے تھے۔

اپنے زمانے کے آدرش وادی، کرنل معصوم حسین، آزاد ہند فوج میں نیتا جی کے ملٹری سکریٹری۔ برطانوی راج کے آخری دنوں میں لال قلعے میں قید رہے تھے۔ شہنواز خاں ڈھلوں اور سہگل کے ساتھی۔ لال قلعہ جہاں ان سب کے لیے پھانسیاں گڑنے والی تھیں، لال قلعہ جہاں برطانوی راج کا جاہ وجلال اپنے عروج پر تھا۔

کرنل معصوم نے اپنے سر کو جھٹکا۔ انہیں وہ وقت یاد آیا جب نیتا جی اور آزاد ہند فوج کے دوسرے افسروں کے ساتھ انہوں نے بھی رنگون میں جلاوطن کیے جانے والے آخری مغل بادشاہ ابوالمظفر سراج الدین ظفر کی قبر پر حاضری دی تھی پھول چڑھائے تھے اور مٹی کے اس ڈھیر کو سلامی دیتے ہوئے عہد کیا تھا کہ ہندوستان انگریز کی غلامی سے آزاد ہوا تو بوڑھے بادشاہ کی چونا لگی ہڈیوں کو سرکاری اعزاز کے ساتھ دلی لے جا کر دفن کیا جائے گا۔ ہندوستان کی خاک سے اٹھنے والا اپنی اصل کو لوٹے گا۔ لیکن سارے خواب بکھر گئے تھے، وہ جو اپنی رضا کے خلاف جلاوطن کیا گیا

رنگون میں تا ابد آرام پر مجبور تھا اور وہ جنہوں نے اپنی رضا سے ترک وطن کیا، گردنوں میں خود ساختہ جلا وطنی کا ہیکل پہنے، اس کے بوجھ سے دہرے...... در بہ در، خاک بہ سر...... سارے خواب خاک میں مل گئے تھے۔

انہیں وہ دن یاد آئے جب علی اکبر پانچ برس کا تھا اور پہلی مرتبہ ان کے گھر آیا تھا۔ وہ بیٹے سے ناراض تھے، بہو ان کی سگی بھتیجی تھی پھر بھی اس کی صورت دیکھنے کے روادار نہ تھے، لیکن پوتے کے سامنے موم ہو گئے تھے۔ وہ انہیں سارے میں نچائے نچائے پھرتا۔

''دادا جانی میں دریا میں نہاؤں گا۔''

وہ فرمائش کرتا اور وہ اسے لے کر گھاٹ پر جاتے، سیڑھیاں اتر کر اس کے ساتھ ڈبکیاں لگاتے۔ وہ ان پر چھینٹے اڑاتا تو نہالوں نہال ہو جاتے۔ باغ میں جاتا تو پیڑوں میں بنے ہوئے گھونسلوں میں جھانکنے کے لیے ان کے کندھے پر چڑھ جاتا اور اس کے ننھے ننھے پیر انہیں اپنے شانوں پر کھلے ہوئے پھول لگتے۔

سپہر آرا دادا پوتے کی چہلیں دیکھتیں تو ان کی آنکھیں روشن ہو جاتیں۔ لیکن ہفتے بھر میں ہی دادی کی آنکھوں کی روشنی بجھ گئی اور دادا کے شانوں پر کھلے ہوئے پھول مرجھا گئے۔ بہو کراچی جانے کے لیے دِلّی چلی گئی تھی اور وہ علی اکبر کی دید سے بھی محروم ہو گئے تھے۔

علی اکبر نے جا کر دادا جانی کو اپنی ٹیڑھی میڑھی تحریر میں خط بھیجا اور اس خط نے کرنل معصوم اور سپہر آرا کی زندگی میں ایک نیا رنگ بھر دیا۔ دونوں اسے خط لکھتے، اس کے جواب کا انتظار کرتے۔

وہ راجیہ سبھا کے ممبر ہوئے تو علی اکبر اے لیول میں تھا۔ اس کا فون آیا۔ ''دادا جانی کاش میں بھی آپ کے پاس ہوتا۔'' اس کا جملہ سن کر ان کا دل خون ہو گیا تھا۔ جعفر نے انہیں اور علی اکبر کو کیسی لذتوں سے محروم کر دیا تھا۔

علی اکبر لندن چلا گیا، وہاں سے اس کے خط آتے رہے، وہ انہیں اور دادی

بیگم کو فون کرتا رہا۔ لندن اسکول آف اکنامکس سے اس نے گریجویشن کیا اور چھٹیاں گزارنے کراچی جانے سے پہلے پٹنہ چلا آیا۔ پانچ برس کا بچہ کڑیل جوان ہو چکا تھا، دادا دادی کا بس نہیں چلتا تھا کہ اسے بھونرے میں جا چھپائیں۔

وہ علی اکبر کو لیے ہوئے سارے میں پھرتے رہے۔ اسے بتاتے رہے ''میاں یہ سب کچھ تمہارا تھا، تمہارے پرکھوں کی بنائی ہوئی کوٹھی، ان کے لگائے ہوئے باغ، ان کی لکھی ہوئی، اکٹھا کی ہوئی کتابیں۔ مخطوطے، مصوری کے نمونے، ان کے خریدے ہوئے چاندی اور چینی کے برتن۔''

پھر انہوں نے اسے وہ مکان اور باغ بھی دکھائے جن کا جعفر نے کلیم کیا تھا اور جن میں اب پاکستان سے آئے ہوئے شرنارتھی رہتے تھے۔

وہ گول کمرے کی دیوار پر آویزاں ہرن کی کھال کو دیکھتا رہا تھا اور اس پر لکھے ہوئے ناموں کو پڑھتا رہا تھا۔

''دادا میاں اس پر تو میرا نام بھی لکھا ہے۔'' اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

''اور اس پر تمہارے بیٹے کا نام بھی لکھا جائے گا۔''

''لیکن دادا میاں ہمارا شجرہ تو یہاں ہے۔''

''میری جان، جب میں نہیں رہوں گا تو یہ سب چیزیں تمہاری ہوں گی۔ یہ شجرہ، یہ کتابیں، توشہ خانے میں بھرے ہوئے چاندی اور چینی کے برتن۔''

''اپنے جانے کی باتیں مت کریں دادا میاں ...... اور میں یہاں سے کچھ نہیں لے جاؤں گا۔ میں ایم ایس کرلوں اور میری برٹش نیشنلٹی ہو جائے تو پھر میں آپ کے پاس آ کر رہوں گا۔ میرا ایک گھر یہاں ہوگا۔''

معصوم حسین نے اپنی مٹھیاں بھینچ کر اپنے آنسو روکے تھے۔ ''میاں جب تمہارے ابا نے پاکستانی نیشنلٹی لی ہے تو ابتدا میں وہ بھی یہی کہا کرتے تھے۔''

سپہر آرا چپ نہ رہ سکی تھیں ''یہ تمہیں ولایت جانے کی کیا سوجھی؟ پاکستان اب تمہارا گھر ہے۔''

''وہاں میرا مکان ہے دادی بیگم۔ وہاں ہماری ہوا اکھڑ چکی۔ یہاں سے جانے والوں کی بڑی بڑی جائیدادیں اپنی بنیادیں چھوڑ چکیں۔ تب ہی تو سب کے بچے باہر پڑھ رہے ہیں۔ تب ہی تو سب گرین کارڈ کے خواب دیکھتے ہیں۔ یہاں سے جانے والے اپنا مقدمہ ہار گئے ہیں دادی بیگم۔''

علی اکبر کی آواز کی تلخی نے معصوم حسین کے دل کے قتلے کر دیے تھے۔ ان کا جی چاہا تھا کہ جعفر حسین کو خط لکھیں کہ ''تم ہار گئے جعفر میاں لیکن تمہاری ہار پر میں خوش نہیں ہوا ہوں۔ باپ بیٹوں کی شکست پر خوشیاں نہیں مناتے، چراغاں نہیں کرتے۔''

ان ہی دنوں راجیہ سبھا کا اجلاس شروع ہونے والا تھا، وہ علی اکبر اور سپہر آرا کو دِلّی لے گئے۔ ساؤتھ اکسٹنشن میں جو فلیٹ انہیں ملا ہوا تھا وہ علی اکبر کی موجودگی سے پہلی مرتبہ واقعی آباد ہوا۔ وہ اسے راشٹرپتی بھون لے گئے، انہوں نے اسے پارلیمنٹ ہاؤس کی سیر کرائی۔ علی اکبر نے وزیٹر گیلری میں دادی بیگم کے ساتھ بیٹھ کر اپنے دادا میاں کو بولتے ہوئے سنا۔

دِلّی سے رخصت ہوتے ہوئے علی اکبر نے اچانک ان سے پوچھا تھا ''آپ کا قد چھ فٹ ہے نا دادا میاں؟''

''ہاں میاں، لیکن اس وقت تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟''

''اس لیے دادا میاں کہ آپ چھ سو برس سے اس زمین پر ہیں۔ تو آپ اس برگد کی طرح ہوئے جو زمین سے جتنا اوپر نظر آتا ہے...... اس سے کہیں زیادہ گہرائی میں اور کہیں زیادہ دور تک پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ آپ کو اور دادی بیگم کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ آپ یہاں گڑے ہوئے ہیں، اور ہم؟ ہم سبز شیشے میں سانس لیتے ہوئے منی پلانٹ کی طرح ہیں...... جس کا زمین سے کوئی ناتا، کوئی رشتہ نہیں۔''

''بری بات ہے علی اکبر، ایسی باتیں مت کرو۔ پاکستان تمہارا ملک ہے، کراچی میں تمہارا گھر ہے...... گھر کے لیے منہ سے بدفال نہیں نکالو۔'' سپہر آرا نے سہم کر کہا تھا...... کراچی سے اب خون میں بھیگی ہوئی خبریں آتی تھیں۔

''کس شہر اور کس گھر کی بات کرتی ہیں دادی بیگم! وہ غزل شاید آپ نے بھی سنی ہو...... برق زمانہ، دور تھی لیکن مشعل خانہ دور نہ تھی'' وہ گنگنانے لگا...... ''ہم تو ظہیرا اپنے ہی گھر کی آگ میں جل کر خاک ہوئے''۔ سپہر آرا کے دل پر آرے چل گئے۔ یہ غزل انہوں نے بارہا سنی تھی اور اسے سنتے ہوئے جب بھی اس شعر تک پہنچی تھیں انہیں جعفر کی یاد پہروں رلاتی تھی اور اب اسی کا خون ان کے سامنے اس شعر کو گنگنا رہا تھا۔

''ارے میاں مجھے کیا سناتے ہو؟ ہم کم نصیب تو اس شعر کی چلتی پھرتی تصویر ہیں...... لیکن سوچو تو سہی، یہ بھی کوئی زندگی ہوئی کہ گھر میں آگ لگے تو اسے بجھانے کی بجائے آدمی اپنے سارے رشتوں ناتوں کو آگ میں گھرا ہوا چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ یہ سوچے بھی نہیں کہ رہ جانے والے راکھ ہو جائیں گے۔''

علی اکبر دِلّی سے چند دنوں کے لیے کراچی چلا گیا، پھر اسے لندن واپس جانا تھا...... وہ چلا گیا تھا اور دادا دادی کے دلوں میں وہم اور وسوسے کے بھونر جال چھوڑ گیا تھا۔

چند مہینوں پہلے وہ لندن اسکول آف اکنامکس سے ایم ایس کا امتحان دے کر نمٹا تو کراچی روانہ ہونے سے پہلے اس نے فون کیا ''دادا جان میں ان دنوں اکثر آپ کو خواب میں دیکھتا ہوں۔ آپ کے ساتھ سیر کو نکلتا ہوں۔ یاد ہے نا جب آپ مجھے کندھے پر چڑھا کر گوریا کے انڈے دکھاتے تھے۔''

انہوں نے اس کی بات کاٹ دی تھی ''تمہارے یہاں تو لوگ گوریا کو چڑیا کہتے ہیں۔''

''لیکن دادا جانی میں نے تو ہمیشہ گوریا ہی کہا۔ میں جب پہلی مرتبہ آپ لوگوں کے پاس آیا تھا تو دادی بیگم نے مجھے اس گوریا کی کہانی سنائی تھی جو چاندی کی کٹوری میں دودھ ملیدہ لاتی تھی۔ میں، اس کہانی کو اور دادی بیگم کے کھلائے ہوئے دودھ ملیدے کے ذائقے کو کبھی نہیں بھولا، ہاں دادا جانی تو میں خواب میں چھوٹا ہو جاتا ہوں

اور آپ کے کندھے پر چڑھ کر آم توڑنا چاہتا ہوں لیکن آم اونچے ہوتے چلے جاتے ہیں، میرے ہاتھ نہیں آتے۔''

ان کا دل جو اس کی محبت سے ہر لحظہ لبریز رہتا تھا، چھلک گیا تھا۔ ''بیٹا ہم دونوں چراغ سحری ہیں ہمیں آ کر منہ تو دکھا جاؤ۔''

''دادا جانی۔ چند دنوں کے لیے کراچی جا رہا ہوں، یوں سمجھیں کہ وہاں سے سیدھے آپ کے پاس آؤں گا۔ چاہے دو چار دن کے لیے ہی آؤں۔ پھر مجھے لندن واپس آنا ہوگا، ملازمت کے سلسلے میں، اس کے بعد تو میرا آنا جانا لگا رہے گا۔''

وعدے وفا نہیں ہوئے تھے، اس کے خاک ہونے کی خبر انہیں ''زی ٹی وی'' کے نیوز بلیٹن سے ہوئی تھی۔ اسکرین پر جعفر کا بے روح چہرہ، ڈھلکے ہوئے شانے، جھکی ہوئی گردن، گہوارے کے ہتھے پر لرزتی ہوئی انگلیاں اور گہوارے میں علی اکبر۔ باپ...... بیٹے کو کندھے پر اٹھائے ہوئے۔

جعفر نے بچپن میں علی اکبر کو اپنے کندھے پر اٹھایا تو ہوگا، اس وقت یہ دن بھلا کب اس کے وہم و گمان میں ہوگا۔ وہ لرزنے لگے، خاک میں ملنے والے کا آخری دیدار، گلابوں سے ڈھکا ہوا جاں ہار، در بہ دری ختم ہوئی۔ دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں۔ نیوز کاسٹر بتا رہی تھی کہ گھر والوں کے بیان کے مطابق علی اکبر دو لاکھ روپے بنک میں جمع کرانے نکلا تھا جبکہ پولیس کا کہنا تھا کہ وہ لندن سے آیا تھا، ''را'' سے اس کے روابط تھے۔ اسے رکنے کا اشارہ کیا گیا تو گاڑی روکنے کی بجائے اس نے فائر کھول دیا اور پولیس کی جوابی فائرنگ سے ہلاک ہوگیا...... رنگون میں سونے والے نے کہا تھا کہ جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے اور یہ 1994ء تھا۔ دو لاکھ روپوں کے بارے میں پولیس نے لاعلمی ظاہر کی تھی، ہاں اس کی گاڑی سے اسلحہ ضرور برآمد کرلیا تھا۔ نیوز کاسٹر یہ بتانا نہیں بھولی تھی کہ علی اکبر کا ہندوستان کی راجیہ سبھا کے ممبر کرنل معصوم حسین سے کیا رشتہ تھا۔

خاندان کے افراد اور احباب تو خبر کے نشر ہوتے ہی آ پہنچے تھے اور دوسرے دن

سے لوک سبھا، ودھان سبھا اور راجیہ سبھا کے ممبروں اور پارٹی کے اراکین کا تانتا بندھ گیا۔ چیف منسٹر خود نہ آئے ان کا تعزیتی بیان آیا، وہ راجا کنور سنگھ جینتی میں گئے ہوئے تھے، لیفٹنٹ گورنر آئے، وزیر آئے۔ آنے والوں میں کچھ ماتم دار تھے اور کچھ اداکار۔ لبوں پر تعزیت اور آنکھوں میں طنز۔ لوگ فرزند زمین دادا سے اس کے بے زمین پوتے کے پُرسے کے لیے آرہے تھے۔ جعفر نے اپنے آپ کو اور علی اکبر کو بعداز مرگ اپنے بزرگوں کی ہمسائیگی سے بھی محروم رکھا تھا۔ پھلواری شریف میں کائی لگا آبائی قبرستان، جہاں کوئی کسی کے پہلو میں سو رہا تھا اور کسی کو کسی کے پائنتی جگہ ملی تھی۔ قبروں کے سینوں پر اُگی ہوئی گھاس، جہاں قبروں میں اترنے والوں اور انہیں کھانے والے کیڑوں اور بجوؤں کے درمیان بھی پشتوں کا تعلق تھا۔

ان کی نگاہ بھٹکی اور ہرن کی اس کھال کو انہوں نے دیکھا جس پر اب علی اکبر کے بیٹے کا نام کبھی نہیں لکھا جائے گا۔ انسان کا شجرہ، وقت کی انگشت شہادت لکھ رہی تھی ...... معدوم ابنِ معدوم ابنِ معدوم ...... انہیں جھرجھری سی آئی، گھبرا کر پشت کے پیچھے رکھے ہوئے گاؤ تکیے کو انہوں نے سرکایا اور گھٹنوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر، ہونٹوں پر آنے والی کراہ کو دبا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ سپہر آرا کا سامنا کرنے کی ان میں ہمت نہ تھی۔ کل سے آج تک وہ کئی مرتبہ بیٹے اور بہو سے بات کر چکی تھی، بات کیا کر چکی تھی، بس چیخیں مار کر روتی رہی تھی۔ ان کی تو یہ ہمت بھی نہیں ہوئی تھی کہ بیٹے کو بیٹے کا پُرسہ دیں۔

چھڑی کا سہارا لیتے ہوئے وہ گول کمرے سے نکل کر اپنی اسٹڈی کی طرف بڑھے۔ مرلی دھر گول کمرے سے باہر دہلیز پر اکڑوں بیٹھا تھا، گھٹنوں میں سر دیے۔ اس کے قریب ہی فرش پر ایک لالٹین رکھی تھی۔ ان کے قدموں کی چاپ سن کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''سرکار، جنان کھانے میں نا جیہیں؟'' وہ لالٹین اٹھا کر ان کے ساتھ آگے بڑھا۔

''نہیں مرلی دھر۔ ہمت نہیں ہے وہاں جانے کی۔ تم میرا حقہ تازہ کر کے لے آؤ۔''

انہوں نے اسٹڈی کے دروازے پر پڑی ہوئی چق کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مرلی دھر نے لپک کر چق اٹھا دی اور لالٹین کی روشنی میں انہیں راستہ دکھانے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ اندر داخل ہوئے۔

''سرکار، ہم جرا گیس بتی لے آویں۔'' مرلی دھر نے لالٹین ایک اسٹول پر رکھ دی۔

''نہیں مرلی دھر، میرے لیے تم لیمپ جلا دو۔''

مرلی دھر نے سر جھکا کر بنڈی کی جیب سے دیا سلائی کی ڈبیہ نکالی اور دو بتی لیمپ روشن کر دیا۔ کمرے میں اجالا پھیل گیا۔

''جاؤ مرلی۔ حقہ لے آؤ۔''

''ابھی حاجر کرت ہیں سرکار۔'' مرلی دھر تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

کرنل معصوم کی خالی نگاہیں ادھر ادھر بھٹکتی رہیں۔ کتابیں جو ان کے باپ، دادا اور پردادا نے جمع کی تھیں، وہ جو انہوں نے خریدی تھیں۔ فارسی اور ترکی کے مخطوطے۔ لکھنؤ، کانپور، دِلی، لندن، تہران اور برلن کی چھپی ہوئی کتابیں جن کا اب کوئی وارث نہیں رہا تھا۔ انہوں نے ایک گہرا سانس لیا ''عابد رضا بیدار سے کل ہی کہوں گا کہ میاں ان کی فہرستیں بنوانا شروع کردو۔ ان پر اب خدا بخش لائبریری کا حق ہے۔''

وہ کرسی پر بیٹھے رہے پھر انہوں نے میز کی دراز سے اپنا فولڈر نکالا، مراکشی چمڑے کا بہت پرانا فولڈر جسے انہوں نے لندن سے خریدا تھا۔ سونے کے پانی سے لکھا ہوا ان کا نام جس کی چمک اب دھندلا گئی تھی، لفظ کہیں سے اڑ رہے تھے۔

فولڈر کھول کر وہ اس میں رکھے ہوئے کاغذات الٹنے پلٹنے لگے۔ ایک لفافہ فولڈر کی جیب سے نکل کر زمین پر گر پڑا۔ انہوں نے جھک کر لفافہ اٹھایا اور اسے

پہچان کر ان کے ہاتھ کانپنے لگے۔ یہ وہ خط تھا جو پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کرنے کے بعد جعفر نے انہیں لکھا تھا۔ یہ خط ان کی اور سپہر آرا کی زندگی بدل گیا تھا، ان کی خوشیاں نگل گیا تھا۔ انہوں نے لرزتی ہوئی انگلیوں سے لفافے کو کھولا اور اس میں سے جعفر کا خط نکال کر پڑھنے لگے۔ جعفر نے لکھا تھا:

''ابا میاں۔ یہاں رہنے کا فیصلہ میں نے اپنے لیے نہیں اپنی نسلوں کے محفوظ مستقبل کے لیے کیا ہے......''

لیمپ کی زرد روشنی میں انہوں نے دوبارہ اس سطر کو پڑھا' پھر وہ جن کی آنکھوں سے جعفر کے پاکستان چلے جانے پر ایک آنسو نہیں ٹپکا تھا، جنہوں نے علی اکبر کے جانے کی برچھی کھا کر بھی ضبط گریہ کیا تھا ان ہی کی آنکھیں سالہا سال پہلے لکھے جانے والے لفظوں کو دھونے لگیں۔

دیمک محلے کی آبادی نے روتے ہوئے بوڑھے پر نگاہ کی۔ گھروں کو چاٹنے کے بعد نسلوں کو چاٹ جانے کا مرحلہ آن پہنچا تھا۔

❖❖❖

منزل ہے کہاں تیری......

ہزاروں میل کی بلندی پر کٹی آنکھیں ...... دور جدید کی طلسم ہوشربا آسمانوں پر کھلی ہوئی، آنکھیں امریکہ اور فرانس جادو کی ...... جاپان اور انگلستان جادو کی ...... سینکڑوں فٹ کا دائرہ، ہزاروں سیر کا وزن، انہیں دیکھ کر جمشید جادو حسد سے خاک، صرصر جادو غم سے راکھ۔ آسمان کی پیشانی پر اپنے اپنے مدار میں گردش کرتی ہوئی آنکھوں کا رخ ایک ہی جانب ...... ایک ہی عمارت اور اس کے گرد و نواح کو دیکھتی ہوئی ...... دنیا بھر کی ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں آنکھوں کی پتلیوں میں ایک ہی منظر رکھتی ہوئی۔

کائی جمی ہوئی ایک متروک اور اداس عمارت، کبوتروں کی بیٹ سے بھرے ہوئے اس کے ویران گنبد، کیسری چولا پہنے اور بھبھوت ملے ہزاروں انسانوں کے نرغے میں۔ وہ اسے گراتے ہوئے، کدالوں سے، پھاوڑوں سے، ترشولوں اور ترنڈیوں سے۔ سہمے ہوئے کبوتروں کی ٹکڑیاں فضا میں چکراتی ہوئی، کاوا کاٹ کر ڈھیتے ہوئے ان گنبدوں اور محرابوں کی طرف آتی ہوئی جو صدیوں سے ان کا اور ان کی گزری ہوئی نسلوں کا مسکن رہے تھے۔

اجودھیا کی وحشت ناک دوپہر جو ڈاکٹر عالیہ جعفر اور ڈاکٹر مدن موہن کے لیے سنسنائی کی ایک عذاب ناک رات تھی۔

مدن نے اپنے گلاس سے آخری گھونٹ لیا اور سسکنے لگا۔

''آج میرے منہ پر اور لاکھوں کروڑوں کے منہ پر کالک لگ گئی۔ اس کالک کو ہم

اپنے خون سے بھی نہیں دھو سکیں گے عالیہ...... خون سے بھی نہیں......"

وہ دونوں کبوتروں کا سہا ہوا ایک جوڑا، ایک دوسرے کے وجود سے یقین واعتبار کے تنکے چنتا ہوا اور انہیں پر سا دیتی ہوئی رات۔ وقت کی چٹکی سے چھوٹا ہوا تاریخ کا تیر دونوں کے سینے میں ترازو، دیر وحرم کی جنگ میں دونوں بے دست و بازو، بے یارو مددگار، دو دلدار۔ ایک دوسرے سے آنکھیں چرائے ہوئے، ایک دوسرے کے سینے میں چہرے چھپائے ہوئے، انگلیاں امر بیل کی طرح ایک دوسرے کی انگلیوں میں اتری ہوئی، دونوں چپ کی چادر میں لپٹے ہوئے، دونوں دوسراہت کے دوشالے میں سمٹے ہوئے۔ تم مرے پاس رہو، پاس رہو۔

☆☆☆

برف کے نرم گالوں نے پیڑوں کی برہنہ شاخوں کے بوسے لیے اور زمین پر سفید قالین بچھتا گیا۔ مدن کے برابر بیٹھی ہوئی عالیہ نے گاڑی کے شیشے سے پرے دیکھا۔ برف دریائے اوہائیو پر گر رہی تھی۔ وقت کائنات پر برس رہا تھا۔ ڈیڑھ کروڑ، پچاس لاکھ، پچیس لاکھ، پچاس ہزار برس پہلے کے اچک اچک کر چلنے والے، پتھروں کے اوزار بنانے والے، آگ دریافت کرنے والے...... سب ہی وقت کی اس برف کے نیچے چھپ گئے تھے اور اندھے غاروں اور مٹی کی گہرائیوں میں ان کی ہڈیاں، ان کے ڈھانچے رہ گئے تھے۔ وہ جو گزر گئے تھے، وہ جو ابھی آئے نہیں تھے۔ سب ہی پر وقت کی برف گر رہی تھی، سب ہی ظہور کے بعد زمین میں چھپنے والے، یا راکھ بن کر اڑنے والے یا کسی گدھ کے پیٹ میں رہنے والے تھے۔

اس نے سر کو ہولے سے جھٹکا۔ کراچی سے ہو کر آنے والی اس کی دوستوں نے بتا دیا تھا کہ مدن کے نام کا پرندہ اس کے گھر کی منڈیر پر اتر چکا ہے، گھر جانا اس مرتبہ کس قدر مشکل مرحلہ ہو گیا تھا۔

مدن موہن نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے عالیہ کی طرف جھک کر اس کے رخسار کا اچٹتا ہوا بوسہ لیا۔ گاڑی لحظے بھر کے لیے لہرائی۔

''باؤلے ہوگئے ہو......؟ ویسے ہی دیر ہوگئی ہے۔ گاڑی برف پر پھسل کر کسی چیز سے ٹکرا گئی تو میری فلائٹ نکل جائے گی۔'' عالیہ نے خفگی سے مدن کو دیکھا۔

''اس سے اچھی بات بھلا اور کیا ہوگی لیکن جناب آپ کو میرے اس ڈیڑھ سیکنڈ کے کام سے تو فلائٹ نکل جانے کا خیال آ رہا ہے اور ابھی جو آپ نے گھنٹہ بھر ''مال'' میں لگایا ہے، اس وقت یاد نہیں آئی تھی یہ بات؟ ویسے یار تمہاری ہولا جولی کا بھی کوئی جواب نہیں۔ یہ ایئرپورٹ جاتے جاتے تمہیں اچانک گھڑیاں خریدنے کا خیال کیسے آ گیا؟''

عالیہ نے اپنے بیگ کو چھوا جس میں راڈو کی سنہری اور روپہلی دو گھڑیاں زندہ تھیں۔ ''کام میں اس قدر مصروف رہی کہ سب ہی کے تحفے بھگدڑ میں لیے لیکن جب تمہارے ساتھ ایئرپورٹ کے لیے نکلی تو یاد آیا اوشا کے پتا کی فرمائش تو پوری ہی نہیں کی۔ انہوں نے اس کے لیے سارا دان دہیز جمع کرلیا ہے، بس بیٹی اور داماد کی گھڑیاں رہ گئی ہیں۔ کئی مہینے پہلے بھابھی صاحب نے ان کی فرمائش لکھوائی تھی مجھے۔''

''چنانچہ آپ نے ترنت دو عدد قیمتی گھڑیاں اپنی بُغچی میں باندھ لیں۔ سبحان اللہ کیا دیالو دھنوان، کنواری کنیا نادان ہیں آپ۔ ارے بھئی کراچی میں گھڑیوں کی کمی تو نہیں ...... وہیں سے خرید لیتیں آپ۔''

عالیہ نے تیوری پر بل ڈال کر مدن کو دیکھا۔ الہ آباد کے پنڈتوں کا یہ بیٹا جب دیوبندی مولویوں کی طرح سبحان اللہ...... ماشاءاللہ کہتا اور کسی گھائل مرادآبادی یا لاغر رام پوری کے انداز میں آنکھیں بند کر کے ترنم سے ''الٰہی خیر ہو، وہ مہرباں اب ہوتے جاتے ہیں'' گنگناتا تو تنہائی کے صحرا میں بادِشمال دل کے دروازے پر دستک دیتی۔ اپنی آوازوں اور موسموں سے ہزاروں میل کی فضائی مسافت پر ہونا بھی کیسا عذاب تھا۔

''استغفراللہ ...... میری کیا مجال کہ ان کا مذاق اڑاؤں'' مدن کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

عالیہ کے چہرے پر یادوں کی دھند پھیل گئی۔ بچپن میں واحد ان کی ذات تھی جس

سے وہ گھنٹوں باتیں کرتی۔ دوپہر میں سب سو جاتے اور نیند اسے چھو کر نہیں گزرتی تب وہ اپنے بستر سے اٹھتی اور جامن کے پیڑ کے نیچے بچھی ہوئی رلی پر جا بیٹھتی اور سوال پر سوال کیے جاتی۔ وہ اپنی دائیں آنکھ پر محدب شیشہ چڑھائے ہاتھ میں تیل سلی پکڑے کسی گھڑی کے چکر کا سوراخ درست کر رہے ہوتے یا چال کی اور باج کی کمانی کس رہے ہوتے اور اس کے سوالوں کا جواب دے رہے ہوتے۔

''اوشا کے پتا! رات میں اللہ میاں کا ہاتھی تاروں کی سڑک سے نیچے اتر جائے تو؟''

''نہیں رانی...... مہادیو کا ہاتھی کبھی رستہ نہیں بھولتا۔''

''اوشا کے پتا! صبح سے چڑیاں کیوں چہچہاتی ہیں؟''

''بٹیا رانی...... تمہیں اپنا راگ سنا کر جگاتی ہیں۔''

''اوشا کے پتا! دھنک میں سات رنگ کیوں ہوتے ہیں؟''

''یہ سات رنگ نہیں رانی بٹیا...... اندر لوک کے سات راستے ہیں۔''

وہ سوال کرتے کرتے تھک جاتی پر وہ جواب دیتے نہ تھکتے۔

''جامن کے موسم میں جب گدری جامنیں پٹ پٹ ان کے دائیں بائیں گرتیں، وہ انہیں اٹھا کر میرے لیے اپنی صندوقچی میں رکھتے جاتے پھر جیسے ہی میں پھرتی پھراتی ان کے پاس پہنچتی وہ سائیکل والے کے گھڑے سے پانی نکال کر ان جامنوں کو دھوتے اور اخبار کے کسی پھٹے ہوئے ٹکڑے پر انہیں رکھ کر صندوقچی میں سے نمک کی پڑیا نکالتے، اس میں سے چٹکی بھر نمک دھلی ہوئی جامنوں پر برکتے اور پھر انہیں اس اہتمام سے میرے سامنے رکھتے جیسے اودھ کے شاہی رکابدار نے جان عالم پیا کے سامنے خاصہ چنا ہو۔ یقین کرو مدن ان جامنوں کا ذائقہ آج بھی میرے لبوں پر ہے۔'' عالیہ کی آواز اور چہرے پر یادوں کی کہر تھی۔

''مجھے بالکل یقین ہے...... تب ہی تمہارے ہونٹ......''

''مدن، میں تمہیں مار بیٹھوں گی۔''

''اس وقت بھی مجھ سے بس ان کا نام لینے کا گناہ ہوا تھا اور تم نے وہ تمام باتیں نہایت چاؤ سے سنا دیں، جو مجھے ازبر ہیں ...... اور لو آ گیا تمہارا گریٹر سنسناٹی انٹرنیشنل ایئرپورٹ ...... جارہی ہیں آپ مہینے بھر کے لیے گھر، مجھے جوگی بیراگی بنا کر لیکن کیا مجال جو کوئی ڈھنگ کی بات کی ہو۔ خط لکھنے کا وعدہ کیا ہو۔ اوشا کے پتا سے فرصت ملتی تو کچھ توجہ اس حقیر فقیر کی طرف بھی ہوتی۔ اس وقت تو مجھے عین مین رقیب روسیاہ لگ رہے ہیں۔''

عالیہ نے چونک کر سامنے دیکھا۔ ایئرپورٹ کی روشنیوں کو گرتی ہوئی برف نے دھندلا دیا تھا۔ مدن کی کار پارکنگ کی طرف مڑ گئی۔

''ہمیں یاد کروگی؟'' مدن کا لہجہ اب سنجیدہ تھا۔

''تم اپنے آپ کو ''ہم'' تو اس طرح کہتے ہو جیسے کہیں کے راجا صاحب ہو۔'' عالیہ نے اسے چھیڑا۔

ارے بھئی اس ''ہم'' کی بحث میں یاد کرنے والی بات تو رہ جائے گی۔'' مدن نے فریاد کی۔

''ہرگز یاد نہیں کروں گی، یوں بھی تم میں یاد کرنے والی بات کون سی ہے؟'' عالیہ نے بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا اور مدن نے گھور کر اسے دیکھا۔ پھر اس لمحے عالیہ پر آنے والے دنوں نے ہجوم کیا۔ ایک مہینہ ...... چار ہفتے ...... کتنے بہت سے دن مدن کے بغیر گزرنے والے تھے۔ اسے گھبراہٹ ہونے لگی اور اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ مدن کے ہاتھ پر رکھ دیا جو اسٹیرنگ پر جما ہوا تھا اور گرم تھا۔

''تمہارے ہاتھ اتنے ٹھنڈے کیوں ہورہے ہیں؟'' مدن نے چونک کر اسے دیکھا۔

''بس یونہی ...... موسم کا اثر ہے'' عالیہ نے جھوٹ بولا تھا۔ ''تم میرے پیچھے بالکل ٹھیک رہنا۔''

''یہ کیوں نہیں کہتیں کہ ہر گھڑی میرے نام کی مالا جپنا' کسی اور ناری کی طرف نظر

بھر کر بھی نہ دیکھنا۔'' مدن نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔

''بس اب چپ رہو...... میرا دل اُمڈا آ رہا ہے۔'' عالیہ کی آواز نم تھی۔

''ہے ہے...... کیا جگر صاحب یاد آئے ہیں۔ آنسو تھے سو خشک ہوئے، جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے۔ دل پہ گھٹا سی چھائی ہے، کھلتی ہے نہ برستی ہے...... واقعی کیا نقشہ کھینچا ہے۔ بس تمہارا ہی عالم لکھ گئے ہیں مرحوم و مغفور۔'' مدن کی آواز میں شرارت کی لہر تھی۔

کار اس نے پارک کر دی تھی اور اب اپنی سیٹ بیلٹ کھول رہا تھا۔

پھر جب سفر کے سب مرحلوں سے گزر کر وہ دونوں جہاز کو جانے والی راہداری کے دروازے تک پہنچے تو مدن نے اسے کھینچ کر سامنے کھڑا کر لیا۔ اب وہ اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔ ہونٹوں کی ہنسی اور آنکھوں کی شوخی رخصت ہو چکی تھی۔ چہرے پر اداسی اور سوچ کی لکیریں تھیں۔

''میں جانتا ہوں تم کس مشکل سفر پر جا رہی ہو۔ بس وہی فیصلہ کرنا جو تمہارا جی چاہے۔ اپنے گھر والوں کی اور میری خوشی کے لیے اپنی خوشیوں کی بھینٹ نہ دینا۔''

عالیہ نے آنسو پیتے ہوئے سر ہلایا۔

''میں تمہیں ہر روز فون کروں گا۔'' مدن نے عالیہ کی پیشانی چومی، آنکھیں چومیں، ہونٹ چومے۔ طیارے کی روانگی کی آخری اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی، پھر روشن سرنگ نے عالیہ کو یوں نگل لیا جیسے کہانیوں کے اژدھے انسانوں کو سالم نگل لیتے تھے۔ مدن نے مڑ کر شیشے کی دیوار سے باہر کی طرف دیکھا جہاں برف گر رہی تھی اور روشنیوں کو دھندلا رہی تھی۔

☆☆☆

تمام مدارتوں کے بعد جہاز کی روشنیاں گل کر دی گئیں۔ باہر رات تھی اور اندر خواب کا سا عالم۔ کچھ مسافر سو رہے تھے، کچھ سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ عالیہ نے کھڑکی سے باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ رات نے سمندر اور آسمان کو ایک ہی رنگ میں رنگ دیا تھا۔ طیارہ منزل کی طرف جا رہا تھا۔

زمین و آسمان کے درمیان کھنچی ہوئی رات پر ایک نظر ڈال کر عالیہ نے نرم تکیے کو دہرا کر کے سر کے نیچے رکھا اور اونگھنے کی بے سود کوشش کی۔ نیند جو سفر میں ہمیشہ عنقا ہو جاتی تھی، اس بار بھی کہیں پائی نہیں جاتی تھی۔ کچھ دیر بعد تنگ آ کر اس نے شولڈر بیگ کھول کر سگریٹ کا پیکٹ اور دیا سلائی کی ڈبیہ نکالی۔ طیارے کے نیم تاریک ماحول میں لحظے بھر کے لیے ننھا سا شعلہ لپکا اور پھر بجھ گیا۔ اس نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا، پھر دیا سلائی واپس بیگ میں رکھتے ہوئے اس کی انگلیاں دونوں گھڑیوں سے چھو گئیں۔

جانے اوشا کا میاں کیسا ہوگا؟ خاصی اداس ہوگی وہ اپنی شادی پر۔ اس کی نگاہوں میں اپنے چھوٹے بھائی سلیم کا چہرہ گھوم گیا، اوشا جس کے ساتھ کھیل کر بڑی ہوئی تھی اور جس کے گرد پروانہ وار پھرتی تھی، اس کی وارفتگی کو دیکھ کر عالیہ کو گھبراہٹ ہوتی تھی۔

''پھیرے میرے سامنے ہو جائیں تو اچھا ہو۔'' عالیہ نے سوچا۔ ''اوشا کے پتا کس قدر خوش ہوں گے۔''

وہ اس کے سنسان بچپن کا بھرا پرا حصہ تھے۔ مدن اگر ان کا نام لے کر اسے چھیڑتا تھا تو کیا غلط کرتا تھا۔ وہ گھر کی باتیں شروع کرتی تو اس میں سے اوشا کے پتا کی باتیں یوں نکلتی چلی آتیں جیسے کسی جادوگر کی جیب یا آستین سے رنگ برنگ کے ربن نکلتے آتے ہیں، نکلتے ہی چلے آتے ہیں۔ کیسی عجیب بات تھی کہ اسے اماں اور بھائی بہنوں سے زیادہ وہی یاد آتے۔ شاید اس لیے کہ عالیہ پر نچھاور کرنے کے لیے بس ان ہی کے پاس وقت تھا، ورنہ گھر کا ہر شخص اپنے آپ میں اتنا مگن تھا کہ کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی فرصت نہ تھی۔ بچے آپ ہی آپ پل رہے تھے، بڑھ رہے تھے، پڑھ رہے تھے۔

یہ وہی تھے جن سے عالیہ نے صبح شام ''سمے ...... سمے'' سنا تھا پھر وقت اور گھڑیوں میں اس کی دلچسپی اتنی بڑھی تھی کہ اس کے بارے میں کہا جانے لگا تھا کہ وہ بھی اوشا کے پتا کی طرح کسی پیڑ کے نیچے بیٹھی گھڑیاں ٹھیک کرے گی اور ''عزیزہ بنجارہ واچ میکر'' کی ایم ڈی کہلائے گی۔

اوشا کے پتا نے گھڑیاں ٹھیک کرنا سیکھ کر کام ابھی شروع ہی کیا تھا کہ ''شائننگ

اسٹار تھیٹریکل کمپنی آف کراچی'' کی طرف سے ''شیریں فرہاد'' دکھایا جانے لگا۔ اس میں کام کرنے والی ایکٹرس عزیزہ نے ان کا دل کچھ اس طور چرایا کہ وہ ہر رات نپن روڈ پر جمعدار کے تھیٹر کے سامنے نظر آنے لگے اور جب کمپنی نے ساز و سامان سمیٹا تو وہ بھی بڑے بھائی اور بھابھی سے کچھ کہے سنے بغیر، کھارادر کا گھر چھوڑ کر کمپنی کے پیچھے ہو لیے۔

عزیزہ کے عشق نے انہیں کہاں کہاں کی خاک نہ چھنوائی، کبھی لکھنؤ، کبھی لاہور، کبھی کانپور اور کبھی کلکتہ۔ وہ ہر شہر میں منڈوے کے سامنے کسی پیڑ کے نیچے دری بچھا کر اور اس پر لکڑی کا چھوٹا سا بورڈ رکھ کر بیٹھ جاتے جس پر انہوں نے ''عزیزہ بنجارہ واچ میکر'' لکھوالیا تھا۔ اس زمانے میں گھڑیاں ہوتی ہی کتنوں کے پاس تھیں کہ وہ بند ہوتیں اور ان سے ٹھیک کرائی جاتیں۔ کبھی کوئی بھولا بھٹکا جیبی گھڑی یا دیوار گیر گھنٹہ لے کر آجاتا تو اسے وہ دوسرے ہی دن بلا لیتے۔ کہیں یہ نہ ہو کہ کمپنی اچانک سامان باندھنے لگے اور کسی کی امانت ان کے پاس رہ جائے۔

عزیزہ کو شراب کی لت تھی، اس نے چند ہی برسوں میں قبرستان جا بسایا لیکن پھر بھی انہوں نے اپنے گھر کا رخ نہیں کیا۔ وہاں تھا ہی کون۔ ماتا اور پتا کے پھول تو کبھی کے نیٹی جیٹی پر بہائے جا چکے تھے۔ مکان پر بڑے بھائی اور بھابھی کا قبضہ تھا اور دنیا نے انہیں یہ ضرور سکھا دیا تھا کہ قبضہ کرنے والوں کو حقداروں کی واپسی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

بٹوارے کی ہوا چلی تو وہ کانپور میں تھے۔ وہاں کام چل نکلا تھا اور سنگی ساتھی بھی بن گئے تھے۔ انہوں نے بہت سمجھایا کہ وہ ہندو ہیں اس لیے انہیں ہندوستان میں ہی رہ جانا چاہیے لیکن وہ بے قرار ہو کر نکل کھڑے ہوئے۔ لاہور میں بلوائیوں کے ہاتھ سے بچ نکلنے والی ایک بچی ان کے ہاتھ لگی۔ پیشانی پر تپتیا پھول، کلائی پر نام گدا ہوا۔ خوف سے سہمی ہوئی اور بھوک سے بلکتی ہوئی۔ انہوں نے اوشا کو اپنی چادر میں لپیٹا اور اس ٹرین میں سوار ہو گئے جو دِلی سے آنے والے لٹے پٹے مہاجرین کو لے کر کراچی جا رہی تھی۔

اپنا نام عبدالرحمٰن بتاتے ہوئے اور اوشا کی پیشانی کا پھول چھپاتے ہوئے وہ کراچی کینٹ پر اترے اور سیدھے کھارادر کا رخ کیا۔ بھائی بھاوج گھر میں حصہ نہ دیں، سر چھپانے کی جگہ تو دے ہی دیں گے۔ کھارادر کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ بھائی اور بھابھی کا، دوسرے محلے داروں کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ کچھ اپنا سامان سمیٹ کر اور کچھ چھوڑ کر ہندوستان جا چکے تھے۔ بیشتر گھروں پر مہاجرین کا قبضہ تھا اور جن گھروں پر تالے تھے، وہ بھی توڑے جا رہے تھے۔ محلے کے پنساری کی دکان کے سامنے رکے تو اس نے انہیں پہچان کر سر پیٹ لیا۔

''ابے جب جندگی وہاں گجاردی تھی تو اب کائے کو آیا ہے؟ کون تیرا سگا بیٹھا ہے یہاں؟''

''واہ کیوں رہ جاتا وہاں؟ یہ میری جنم بھومی ہے۔ ماتا پتا کا انتم سنسکار ہوا تھا یہاں۔''

''تیرا مستک پھریلا ہے۔ یہاں سے کھسک لے۔ کسی کو پتا پڑ گیا کہ کون ہے تو جنم بھومی پر ہی انتڑیاں نکال لیں گے۔''

وہ اوشا کو کندھے سے لگائے ہوئے آبائی گھر پر آخری نظر ڈال کر وہاں سے چلے آئے تھے۔ ہر فٹ پاتھ پر، ہر پیڑ کے نیچے مہاجرین کا بسیرا تھا۔ راتوں رات جھگیاں اُگ رہی تھیں۔ ایک پیڑ کے سائے میں وہ بھی پڑ رہے۔ چند دن مہاجرین میں تقسیم والا لنگر کھاتے اور اوشا کو کھلاتے رہے۔ کئی دن گزر گئے تو انہوں نے تھیلے سے اپنے چند اوزار نکالے جو کلیجے سے لگا کر لائے تھے۔ ''عزیزہ بنجارہ واچ میکر'' کا بورڈ بٹوارے کی نظر ہوا تھا چنانچہ پھر سے انہوں نے لکڑی کے ایک تختے پر ''کمپنی'' کا نام لکھوایا اور ریگل سینما کے سامنے والی فٹ پاتھ پر بیٹھ گئے۔ چند دنوں بعد کام چل نکلا۔ وہ گھڑیاں ٹھیک کرتے اور اوشا زمانے کی چال سے بے خبر آنے جانے والوں کو دیکھتی رہتی۔ بھوک لگتی تو رو دیتی۔ گاڑیاں اور بسیں ہارن بجاتی ہوئی گزرتیں تو ہنسنے لگتی۔ پکچر دیکھ کر لوگوں کی بھیڑ سینما سے باہر نکلتی تو وہ انہیں دیکھ کر تالیاں بجاتی، تھک جاتی تو رلی پر لیٹ کر

سو جاتی۔

بیگم سید جعفر حسین اپنی گھڑی ٹھیک کرانے کے لیے پل دو پل کو اوشا کے پتا کے سامنے رکی تھیں۔ انہوں نے اوشا کی پیشانی پر کھلے ہوئے پھول کو دیکھا تو اس کے بارے میں پوچھ بیٹھیں۔ معلوم ہوا کہ بچی اور باپ کے درمیان خون کا کوئی رشتہ نہیں اور کھارادر میں اپنے باپ کے گھر کے دروازے سے لوٹایا جانے والا اپنے ہی شہر میں آسمان کے نیچے سوتا ہے۔ وہ اس وقت تو کچھ نہ بولیں لیکن گھر جا کر میاں سے بحث کرتی رہیں کہ متروکہ املاک میں ملنے والی جہازی کوٹھی کے شاگرد پیشہ میں اس شخص کو رہنے کا حق کیوں نہیں جو اپنے وطن میں بے وطن تھا، شہر میں جس کا اپنا گھر تھا اور اس پر دوسروں کا قبضہ تھا، یہ اسی بحث کا نتیجہ تھا کہ اوشا کے پتا اور اوشا کوٹھی کے پچھواڑے رہنے لگے تھے اور ''عزیزہ بنجارہ واچ میکر'' کمپنی ریگل سینما کے فٹ پاتھ سے منتقل ہو کر کوٹھی کے سامنے جامن کے اس پیڑ کے نیچے قائم ہو گئی تھی جو کوٹھی کے اندر تھا لیکن جس کی شاخیں دیوار سے ادھر سڑک تک جھک آئی تھیں۔

یہ تو عالیہ نے سوچا بھی نہ تھا کہ ''وقت'' کو گھڑیوں میں قید سمجھنے کا بچپن کا کھیل اس کا ہاتھ تھام کر فزکس میں پی ایچ ڈی تک لے جائے گا...... واقعی سب کچھ اضافی تھا۔ وقت نسبت کے اعتبار سے آزاد اور جدا ہو کر کوئی وجود نہیں رکھتا۔ ہر شخص کا اپنا ایک وقت ہے جو دوسرے سے جداگانہ ہے اور تب ہی تو اوشا کا اور اوشا کے پتا کا وقت ایک دوسرے سے جدا ہو گیا تھا۔ عالیہ کے ذہن میں اوشا کے پھیروں کی دھندلی سی یادیں تھیں۔ دولہا ٹیکسی میں آیا تھا، گلابی کرتا، گلابی صافہ، آگ تھی اور اس کے گرد پھیرے ہو رہے تھے۔ آؤٹ ہاؤس میں آس پاس کے بچوں کی بھی برات اتری ہوئی تھی۔ عالیہ کی اور دوسرے بچوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ کیسی دلچسپ شادی تھی، یہ تھوڑا ہی تھا کہ ایک مولوی آ گیا اور اس نے کچھ پڑھ دیا۔ نہ آگ جلی، نہ دولہا دلہن ساتھ ساتھ پھرے۔ اوشا ان کی کوٹھی کے آؤٹ ہاؤس سے رخصت ہو کر رام سوامی چلی گئی تھی۔ سال بھر نہیں گزرا تھا کہ ایک روز اوشا کے پتا اپنی دکان بڑھا کر ہانپتے کانپتے

سوبھراج ہسپتال گئے۔ خوشی سے ان کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ چلتے چلتے اماں نے بلا کر کچھ روپے ان کے ہاتھ پر رکھے اور دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ دوسرے دن منہ اندھیرے اوشا کے پتا بخار میں پھنکتے ہوئے واپس آئے تو بغل میں گٹھری سی دبی ہوئی تھی جس میں چیاؤں چیاؤں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ پرانی اوشا تو گزر گئی، وہ نئی اوشا کو ساتھ لے آئے ہیں جس پر ان کے داماد کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ اماں نے لاکھ سمجھایا کہ اس ننھی سی جان کو تم کیسے سنبھالو گے لیکن اوشا کے پتا کچھ بڑبڑاتے رہے۔ ''یہ اوشا کا دوسرا جنم ہے۔ اس کا سمے ختم ہوا اب یہ اس کا سمے ہے۔'' وہ بولتے رہے۔ انہوں نے پہلے دن سے اسے ''اوشا'' کہہ کر پکارا، اسے چادر میں لپیٹ کر ساتھ لے جاتے، ''عزیزہ بنجارہ واچ میکر'' سے آس پاس کے بچوں اور نوکروں کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ اوشا کبھی روتی، کبھی ہنستی، اس جامن کے پیڑ کے نیچے ہی اس نے بیٹھنا، کھسکنا اور چلنا سیکھا تھا۔ اوشا نے جب چلنا سیکھا تو اماں نے اس کے پتا کو سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ اسے ان کے پاس چھوڑ جایا کریں۔ یہ نہ ہو کہ سڑک سے گزرتی ہوئی گاڑی یا موٹر سائیکل اسے کچلتی ہوئی گزر جائے۔ یوں وہ گھر کے بچوں کے ساتھ کھیلتی اور اماں کے اردگرد منڈلاتے ہوئے بڑی ہوئی تھی۔

عالیہ نے سگریٹ کو راکھ دان میں بجھا دیا اور پشت گاہ سے سر ٹکا دیا۔ فضا میں گرجتا ہوا طیارہ وقت کی امان میں تھا۔ اٹلانٹک کی گہرائیوں میں سانس لیتی ہوئی مچھلیاں، لہراتے ہوئے پودے، مونگے کی چٹانیں، سیپیوں کے بطن میں سوتے ہوئے موتی اور تین ہزار برس پہلے غرق ہونے والے براعظم اٹلانٹس کے آثار...... وقت کی امان میں تھے۔

☆☆☆

کراچی اس مرتبہ اسے کچھ زیادہ ہی بدلا ہوا لگا۔ سڑکوں پر سلاخ دار دروازے اُگ آئے تھے۔ ہواؤں میں دہشت گردی تھی اور فضاؤں میں وحشت۔ شہر اب گولیوں کی دھن پر رقص کرتا تھا۔ وطن کو ترک کر دینے پر ملنے والا ہجرت کا تمغہ اب گلے کا طوق

بن چکا تھا۔

سندھی ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی بڑی بڑی کوٹھیاں جن میں ترک وطن کر کے آنے والے ہندی مسلمان براجتے تھے، آباد تو تھیں لیکن شاد نہیں رہی تھیں۔ ایک ایسی ہی کوٹھی میں وہ پیدا ہوئی تھی، ہوش سنبھالا تھا۔ گھر اب پہلے سے بھی بھرا پرا تھا۔ ماں، بڑے بھائی اور ان کے گھر والے، چچا اور چچی کی اولادیں، آبادی سی آبادی تھی۔ گھنٹوں گزر گئے لوگوں سے ملتے ہوئے، پھر اسے اوشا کے پتا یاد آئے، اوشا یاد آئی ...... اوشا تو گھر میں رہتی تھی، سارے کام اسی کے سپرد تھے، پھر وہ نظر کیوں نہیں آئی تھی؟

''کمال ہے...... اب تک ملنے نہیں آئی مجھ سے۔ جٹی ہوئی ہوگی دیوانوں کی طرح کسی کام میں۔'' عالیہ نے سوچا اور پھر بہ آواز بلند اسے پکارا۔ کئی لمحے گزر گئے اور اوشا کسی در، کسی دروازے سے نکل کر سامنے نہ آئی۔

''ماہم جان، باورچی خانے سے ذرا اوشا کو تو بلانا۔'' عالیہ نے بھتیجی سے کہا۔

''اوشا نہیں ہے۔'' بھابھی جان کی آواز ہلکی تھی۔

''یہاں نہیں تو پھر کہاں ہے؟ کیا پھیرے ہوگئے اس کے؟ بھئی کمال ہے ایسی بھی کیا جلدی تھی لگن کی ...... میرا انتظار تو کر لیا ہوتا۔'' عالیہ نے برا مانتے ہوئے کہا۔

''پھوپھو...... اوشا دیدی اب کنویں میں رہتی ہے۔'' ماہم کا لہجہ سنسنی خیز تھا۔

''اوہو ماہم .... ہر وقت کہانیاں مت گھڑا کرو۔'' عالیہ نے چھوٹی بھتیجی کو گھر کا۔

''میں کہانی تھوڑا ہی سنا رہی ہوں ...... سچ مچ وہ کنویں میں ہے۔'' ماہم نے اصرار کیا۔ عالیہ کے اندر برف گرنے لگی۔ اس نے بھابھی جان کی طرف دیکھا اور بھابھی جان نے اسے گھیرے میں لیے ہوئے بچوں کی طرف، پھر یہ بات اسے اشاروں میں بتائی گئی کہ اوشا پر کسی کی نظر کرم ہوئی، اس نظر کرم نے اسے کہیں کا نہ رکھا سو اس نے کوٹھی کے پچھواڑے کنویں میں پناہ لی۔

عالیہ دو برس بعد گھر آئی تھی لیکن یہ بات سنتے ہی سمجھ گئی تھی کہ اس پر کس کی نظر

عنایت ہوئی ہوگی۔

پچھلی مرتبہ اس نے اوشا کو بہت چاؤ سے سلیم کا کمرہ صاف کرتے دیکھا تھا۔ وہ بھاگ بھاگ کر اس کے کام کرتی، اس کے کپڑے کس اہتمام سے استری ہوتے۔ سلیم رات میں دیر سے آتا تب بھی اوشا کے ہاتھ کی توے سے اتری ہوئی گرما گرم چپاتی اس کا نوالہ ہوتی۔ عالیہ نے سلیم کی نظریں دیکھی تھیں اور اس کے ذومعنی فقرے بھی سنے تھے جو وہ آتے جاتے اوشا کی طرف اچھالتا۔ اس نے کئی مرتبہ سلیم کو ٹوکا تھا اور پھر جاتے جاتے اوشا سے پوچھا تھا ''تم نے ''مغل اعظم'' دیکھی ہے نا اوشا؟''

''جی دیدی وی سی آر پر چلی تھی تو دیکھی تھی۔'' وہ ساڑی کا پلو دانتوں سے تھام کر ایک ادا سے ہنسی تھی۔

''ایک بات یاد رکھنا، بادشاہ اکبر کا بیٹا ہی نہیں ہر عہد کا سلیم منافق اور خودغرض ہوا ہے اور اس کی خودغرضی کی قیمت ہر زمانے کی انارکلی نے چکائی ہے۔''

''دیدی کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔'' اوشا نے کہا تھا اور کمرے سے نکل گئی تھی۔

عالیہ کا جی چاہا تھا کہ جاتی ہوئی اوشا کو آواز دے اور کہے کہ تمہاری سمجھ میں تو آتی ہیں، یہ کہو کہ تم سمجھنا نہیں چاہتیں۔

وہ سناٹے میں بیٹھی رہی پھر اس نے اماں کی طرف دیکھا جو تخت پر نیم دراز ہوگئی تھیں اور اپنا دایاں بازو اپنی آنکھوں پر رکھے ہوئے تھیں۔

''آپ نے اوشا کو بھلا اس طرح کیوں مر جانے دیا اماں؟'' اس نے بے بسی سے اماں سے شکوہ کیا۔ چچی اماں اور بھابھی صاحب سے تو کچھ بھی کہنا بیکار تھا۔

اماں کراہتی ہوئی اٹھ بیٹھیں، ان کا رنگ زرد ہوگیا تھا ''میرے مقدر میں یہ کالک بھی لکھی تھی۔'' انہوں نے بے قراری سے اپنے دونوں ہاتھ ملے۔ ''ارے اس کی ماں کا خون تو ڈاکٹروں کے سر تھا لیکن یہ خون تو ہمارے گھر ہوا۔''

عالیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اماں جن کی آنکھیں بات بے بات نم ہوجاتی

تھیں، جو کسی گوریا کے مرجانے کا بھی سوگ مناتی تھیں، اسے کسی کیاری میں دفن کراتی تھیں...... تو جب اوشا کو کنویں سے نکالا گیا ہوگا! وہ تو ان کی بڑی چہیتی، بہت لاڈلی تھی...... عالیہ ساری جان سے لرز گئی۔

اماں ساڑی کا پلو آنکھوں پر کھینچ کر رو رہی تھیں۔ پھر انہوں نے سر اٹھا کر عالیہ کو دیکھا ''ہمارے گھر میں یہ ظلم بھی ہونا تھا۔ میرے اپنے خون نے مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔'' اماں کی آواز، ان کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

''اور اوشا کے پتا کہاں ہیں؟'' عالیہ کو اپنی آواز کنویں میں سے آتی ہوئی سنائی دی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس منہ سے ان کے سامنے جائے گی۔

''ارے بیٹا اسے تو چپ لگ گئی تھی پھر ان ہی دنوں گر گئی بابری مسجد......''

عالیہ نے چچی اماں کی بات کاٹ دی ''آپ بابری مسجد کا تذکرہ کرنے لگیں، میں اوشا کے پتا کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔''

''عالیہ تم چچی اماں کی بات تو پوری ہونے دو۔'' بھابھی جان نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔

''لیجیے چپ ہوگئی میں۔'' عالیہ نے جھنجھلا کر کہا ''پہلے تو آپ لوگوں نے اوشا کو مر جانے دیا، اب اس کے پتا کا قصہ بھی سنا دیں۔''

''وہی تو بتا رہی ہوں۔ ہوا یہ کہ اوشا کا پتا روز کی طرح گدڑی بچھائے صندوقچہ کھولے بیٹھا تھا۔ صبح سے ہی تناتنی تھی، پھر خبر آئی کہ دو مندر جلا دیے گئے۔ میں نے رجو کو بھیجا اوشا کے پتا کو گھر میں بلانے کے لیے لیکن وہ اللہ کا بندہ اٹھ کر ہی نہ دیا۔ بکتا گیا کہ ابھی میرے اٹھنے کا سمے نہیں ہوا ہے۔'' چچی اماں تفصیل میں چلی گئیں۔

''ہاں بی بی اٹھتا تو کیسے، اس کی گھڑی جو آ گئی تھی۔'' اماں نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور چاندی کا کھڑک پوری پاندان اپنی طرف سرکایا۔

عالیہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ شاید سب منتظر تھے کہ وہ کچھ پوچھے گی لیکن اس میں کچھ پوچھنے کی ہمت ہی کہاں رہی تھی۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد چچی اماں، میر باقر داستان گو کی طرح شروع ہوگئیں۔ ''تم جانو اس علاقے میں دو چار ہندو عیسائی گھرانے ہیں۔ سب ہی کو ان کی فکر تھی، پر کرتے تو کیا کرتے۔ لو بھئی دوپہر تلک ایک گاڑی میں لونڈے آپہنچے، ''بابری مسجد کی آن پر، جان ہماری قربان'' کرتے ہوئے ...... سائیکل والا لونڈا تو پہلے ہی اپنی دکان بند کرکے سٹک گیا تھا۔ بس اوشا کا پتا تھا جو اپنی آنکھ پر شیشہ چڑھائے ہوئے جانے کس کی گھڑی ٹھیک کررہا تھا۔''

''ارے اس کے پاس آتا ہی کون تھا جس کی گھڑی ٹھیک کرتا، یہ کیوں نہیں کہتیں کہ اپنی گھڑی کے انتظار میں تھا۔'' اماں نے پان کی کتر منہ میں رکھ کر انگلی پر لگا ہوا کتھا سرخ ٹول میں صاف کیا اور تیزی سے پاندان کا ڈھکن بند کیا۔

''میں بتاتی ہوں ...... میں دیکھ رہی تھی پھوپھو۔'' نازیہ جلدی سے بولی۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ''انہوں نے اوشا کے پتا کے سر پر ہاکی ماری پھر ان کی صندوقچی الٹ دی، سارا سامان سڑک پر پھیل گیا، پھر انہوں نے چھرے مارے۔'' نازیہ کی آواز بھنچی ہوئی تھی اور آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں ''صندوقچی میں میرے تل کے لڈو تھے وہ بھی لال ہوگئے۔''

عالیہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے بے اختیار نازیہ کو سینے سے لگالیا۔ بلیئرڈ کی گیند، سفید رنگ کی، سبز گیند اس سے ٹکرائی اور سفید گیند پاکٹ میں ...... چھٹتی ہوئی ...... اوشا کے پتا پر برف گر گئی۔

''اجی آپ میرے کو شاباشی دیں، ورنہ یہ اپنی نازیہ بی بی بھی ماری جاتیں۔ پرلی گیلری سے ہائے ہائے کرتی کودی پڑ رہی تھیں۔ ارے وہ لڑکے ان کو بھی کرچ کر دیتے ...... وہ کررہے تھے ہندو مسلم فساد، پھر ہو جاتا مسلم مسلم فساد۔'' رجو کے لہجے میں اتراہٹ تھی۔

مسلم مسلم فساد ...... ڈھاکہ، چٹاگانگ، نواکھالی، کابل، قندھار، قاہرہ، تہران اور اب کراچی ...... عالیہ کی چھلکتی ہوئی آنکھوں میں کئی نام ابھرے اور ڈوب گئے ......

کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے، کتابِ ملت بیضا پارہ پارہ تھی......

☆☆☆

گھر آنے کے بعد کی ایک سہ پہر...... اس نے کھلی ہوئی کھڑکیوں سے باہر دیکھا جہاں دوپہر کے سائے لمبے ہوگئے تھے اور ہر طرف خزاں تھی۔ ذات سے باہر اور ذات کے اندر پت جھڑ کا موسم۔ ان کھلی ہوئی کھڑکیوں سے باہر اوشا کہیں نہیں تھی، اوشا کے پتا کہیں نہیں تھے...... انسان حیوانوں کا نوالہ تھے۔

اب سے پہلے وہ نہیں جانتی تھی کہ اجودھیا میں گرائی جانے والی مسجد کی قیمت اس کے گھر میں رہنے والے اوشا کے پتا نے بھی چکائی ہے۔ وہ تو کچھ نہیں جانتی تھی۔ ان کا چہرہ اس کی لبریز نگاہوں میں تیرا اور درد اس کے سینے میں لہریں لینے لگا۔

وہ بے قرار ہوکر اٹھ کھڑی ہوئی۔ انسان کو امان کہیں نہیں ملتی تھی، وہ رشتوں اور رفاقتوں سے محروم کردیا گیا تھا۔ نفرتوں کے اسٹاک ایکسچینج میں بھاؤ بڑھ رہے تھے۔ نسلی امتیاز اینڈ کمپنی، فرقہ واریت انٹرنیشنل، لسان اینڈ لسان برادرز، فرزند زمین اینڈ سنز، سب ہی کے بھاؤ آسمان کو چھو رہے تھے۔ نقد جاں کی قیمت گر رہی تھی اور موت کی قیمت چڑھ رہی تھی۔ ایک آواز کی بازگشت سے زمین و آسمان بھرے ہوئے تھے۔ ''اے لوگو! خدا کے گھروں کی بے حرمتی ہوئی۔'' مسجدیں گرائی جارہی تھیں، مندر جلائے جارہے تھے، گرجا گھروں پر بلڈوزر چل رہے تھے، کچھ مسجدیں تھیں جن کی پیشانیوں سے کلمہ کھرچا جارہا تھا۔ ''اے لوگو، خدا کے گھروں کی بے حرمتی ہوئی، بے حرمتی ہوئی۔''

☆☆☆

ڈرائنگ روم میں کتنے ہی نئے اور پرانے چہرے تھے۔ ستاروں پر کمند ڈالنے کی خواہش رکھنے والے اور اس خواہش میں ہر جائز و ناجائز سے گزر جانے والے۔ بڑے بھیا، بھائی صاحب اور ان کی بیگمات نے اپنے ملنے والوں اور جاننے والوں کو اس کی آمد کے بارے میں پہلے سے بتادیا تھا اسی لیے پہلے دن سے دعوتیں ہورہی تھیں۔

''ہماری تو جیسی گزری، گزر گئی۔ قیامت کی گھڑی تو اب ہمارے بچوں کے سروں

پر کھڑی ہے۔" ایڈیشنل سکریٹری کے عہدے پر فائز ایک قریبی رشتہ دار نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

عالیہ کی نگاہوں میں ان کی کوٹھی، ان کی گاڑیاں، ان کا جاہ و حشم گھوم گیا۔ پچھلے برس وہ مدن کے ساتھ اس کے گھر والوں سے ملنے کے لیے الہ آباد گئی تو ایک چکر اس نے اعظم گڑھ کا بھی لگایا تھا، جتنے رشتہ داروں کے نام اسے یاد تھے وہ ان سب سے مل کر آئی تھی۔ ان ہی میں سے ایک ان بیوروکریٹ کی نحیف و نزار اماں بھی تھیں۔ غریب داماد کے گھر میں ایک جھلنگا چارپائی پر پڑی ہوئی۔ بہن نے بڑے بھائی سے ہر آس اٹھادی تھی لیکن ماں گذشتہ چار دہائیوں سے اس بیٹے کی راہ دیکھتی تھیں جو پلٹ کر نہیں آیا تھا۔

وہ اس کا ہاتھ تھام کر بیٹھی رہیں اور اکلوتے بیٹے اور اس کی بیوی اور بچوں کے بارے میں جانے کیا کچھ پوچھتی رہیں۔

"ارے بٹیین ہواں سے لوگ آوت ہیں تو بتاوت ہیں کہ تمرے پوت کے تو کتوں کو حلوے...... پر میرا جی نہیں مانت ہے۔" وہ اپنی کانپتی ہوئی آواز میں ان رشتہ داروں کی شکایتیں کرتی رہی تھیں جو پاکستان سے لوٹتے تھے تو ان کے بیٹے کے تزک و احتشام کے قصے سناتے تھے۔

"نہیں پھوا اماں، غلط کہتے ہیں لوگ۔ کرار بھیا سرکار میں معمولی نوکر ہیں۔" عالیہ نے سفید جھوٹ بولا تھا۔ وہ کس منہ سے انہیں بتاتی کہ ان کے بیٹے کی ہاؤس کیپر چار ہزار مہینہ تنخواہ پاتی ہے اور جب ہفتے میں ایک بار چھٹی پر گھر جاتی ہے ایک ڈرائیور اسے گھر چھوڑنے اور پھر لینے جاتا ہے۔

"لیکن کرار بھیا ہم کب تک سفر میں رہیں گے؟ ابھی یہاں آ کر ٹکے بھی نہ تھے کہ اب ہم سب امریکہ دوڑے چلے جارہے ہیں۔"

"ارے عالیہ بی بی ہم تو عاشق اقبال ہیں...... انہوں نے کہا تھا "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا"...... تو بھئی ہم تو ان کے کہے پر عمل کر رہے ہیں۔" کرار بھیا

زور سے ہنسے اور عالیہ کے سگے بھائیوں کا قہقہہ ان سے بھی بلند تھا۔
''جی ہاں ان ہی اقبال نے یہ بھی تو کہا تھا کہ ''ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا'' اور یہ بھی کہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' اسے کیوں بھول گئے آپ؟'' عالیہ کے لہجے میں استہزا کی ہلکی سی لہر تھی۔
''بھئی جب انہوں نے اپنا Stand بدل دیا تو ہم بھی بدل گئے۔'' بھائی صاحب مسکرائے اور کئی قہقہے فضا میں گونج گئے۔
''دوسروں کو کیا کہتی ہو، تم خود بھی تو امریکہ میں ہو۔'' رضا بھیا نے ابرو اٹھا کر اسے دیکھا۔
''لیکن میں نے وہاں کی شہریت اختیار نہیں کر لی ہے۔''
''میں تمہیں اس قدر نادان نہیں جانتا تھا۔'' کرار بھیا نے چہرہ گھما کر اسے دیکھا۔
''یہ ملک ہماری قربانیوں کے نتیجے میں بنا اور یہیں ہم تیسرے درجے کے شہری بنا دیے گئے۔ حیرت ہے کہ تم ایک ایسی جگہ واپس آنا چاہتی ہو۔'' ان کے لہجے میں گہری تلخی تھی۔
عالیہ حیرت سے انہیں دیکھتی رہی، زمین میں اتری ہوئی جڑوں، صدیوں پرانی قبروں میں سوتی ہوئی ہڈیوں اور زندہ رشتوں کو ترک کر دینے والے اس کے سامنے تھے۔ پُر رونق چہرے، بے رونق آنکھیں، بلند آوازیں، بے روح لہجے۔ جان کی اماں، خواب کے سراب اور مایا کے موہ میں آنے والے سب ہی تو وہاں تھے۔ اپنی بستیوں کو ترک کر کے شاداں و فرحاں ہونے والے آج حیران و پریشان، نئی زمینوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ وائے تمنائے خام۔
''ارے عالیہ، چلو اٹھو...... کرار، رضا...... چلو سب جنے چلو، کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' بھابھی صاحب نے اعلان کیا۔
کھانے کی میز سلطنت رومہ کے کسی امیر کا دستر خوان نظر آ رہی تھی۔ ان نعمتوں کی قیمت ان لوگوں نے ادا کی تھی جنہیں یہ سب رات کے اندھیرے اور دن کے اجالے میں پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ غداری کے طعنے سننے کے لیے، چھری کے وار سہنے کے لیے۔

جھلنگا چارپائی میں پڑی ہوئی اور مکھیوں کی یلغار سے لڑتی ہوئی پھوا اماں۔ عالیہ کی نگاہوں میں دانے دانے کو ترسا ہوا ان کا بدن گھوم گیا۔

اس نے چاندی کے چمٹے سے سلیم کو مرغی کی بھنی ہوئی ٹانگ اٹھاتے دیکھا۔ اس کا ماں جایا۔ اس کا خون۔ دوپہر میں اس نے سلیم سے بات کرنا چاہی تھی لیکن وہ کترا کر نکل گیا تھا۔

مہمان رخصت ہوئے تو گھر والے ٹی وی لاؤنج میں جم گئے۔ خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ بچوں سے کئی مرتبہ سونے کے لیے کہا گیا لیکن کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلنے کو تیار نہ تھا۔ سب ہی عالیہ کو گھیرے بیٹھے تھے۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ ماہم چیل کی طرح فون کی طرف جھپٹی، پھر اس نے ہاتھ میں تھما ہوا فون ریسیور لہراتے ہوئے چیخ کر کہا۔

''عالی پھوپھو...... امریکہ سے کال ہے۔ مدن انکل ہیں۔''

ماہم کی آواز نے ساری آوازوں کا ستھراؤ کر دیا۔ ہر شخص اچانک چپ ہو گیا اور سب کی نظریں اس پر جم گئیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور تلوار نگاہوں کے پل صراط پر چلتی ہوئی کونے کی میز تک گئی۔ وہاں سے ٹیلی فون سیٹ اٹھایا اور تار کو کھینچتی ہوئی ساتھ کے کمرے میں چلی گئی۔ خون اس کی کنپٹیوں میں سنسنا رہا تھا لیکن اس نے بہت سکون سے مدن کے ساتھ باتیں کیں اور کرتی رہی۔ فون ختم ہوا تو اس نے ٹیلی فون لے جا کر واپس اسی کونے کی میز پر رکھا اور جہاں سے اٹھ کر گئی تھی وہیں جا بیٹھی۔

''کس کا فون تھا؟'' اماں کا لہجہ تیکھا تھا۔

''مدن موہن کا۔''

''یہ مدن کون ہے؟'' چچی اماں کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ عالیہ نے بڑے بھیا اور بھائی صاحب کو اپنی اپنی نشستوں سے اٹھتے ہوئے دیکھا۔

''میرا دوست ہے چچی اماں۔'' عالیہ نے سادگی سے کہا۔

''اب ایسی بھی کیا دوستی...... صبح شام فون چلا آتا ہے۔''

''چھوڑیں ہٹائیں بھی چچی اماں ان باتوں کو۔'' بھابھی جان نے آنکھوں سے

بچوں کی موجودگی کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں ابھی تو بہت وقت پڑا ہے ان باتوں کے لیے۔'' بھابھی صاحب نے لقمہ دیا۔

''کن باتوں کے لیے؟'' عالیہ نے چتون اٹھا کر پوچھا۔ کمرے سے گھر کے مرد پہلے ہی رخصت ہو چکے تھے اور بچوں کو بھابھی جان نے اٹھا دیا تھا۔ اب وہاں اماں تھیں، چچی اماں تھیں، بھابھی جان اور بھابھی صاحب تھیں اور اس کی تنہا ذات تھی۔ اس نے جھک کر بلجیم کرسٹل کے باؤل سے بھنے ہوئے نمکین پستے کا ایک دانہ اٹھایا اور ناخنوں سے اسے کھولنے لگی۔

''بس عالیہ چپ رہو تم۔ زیادہ نہ بولو اور یہ جان لو کہ ہمیں رتی رتی کی خبر ہے'' اماں کی آواز شکستہ تھی ''ہندوستان تک خبر پہنچ چکی ہے جو کسر سلیم نے اٹھا رکھی تھی وہ تم نے پوری کر دکھائی۔ وہاں بھی دو کوڑی کی وقعت نہیں رہی ہماری۔''

''چچی اماں پلیز آپ چپ رہیں۔ طبیعت خراب ہو جائے گی آپ کی۔'' بھابھی صاحب اماں کے لیے پانی لانے کو لپکیں۔

''ارے آپ کیوں دل میلا کرتی ہیں۔ آخر ہم لوگ جو موجود ہیں۔ ہم بات کرلیں گے عالیہ سے۔''

''یہ تو اچھا ہے اماں کہ آپ لوگوں کو ہر بات معلوم ہے، مجھے کچھ بتانا نہیں پڑے گا۔'' عالیہ نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

''واہ بیٹا کیا دیدوں کا پانی ڈھلا ہے تمرا۔'' چچی اماں نے ماتھا پیٹ لیا۔

ٹی وی لاؤنج پانی پت کا میدان بن گیا۔ اسے بتایا جا رہا تھا کہ اس نے مذہب، تہذیب، تاریخ کو روند دیا ہے، خاندان کی آن بان خاک میں ملا دی ہے اور گھر والوں کی ناک کاٹ کر ہتھیلی پر رکھ دی ہے۔

''ہمارے بزرگوں نے ہزار ہا ہندو، مسلمان کیے تھے۔'' چچی جان نے خاندانی تاریخ کے ورق پلٹے۔

''کیے ہوں گے۔ ان کی جگہ میں ہوتی تو ہرگز اس چکر میں نہ پڑتی۔'' عالیہ نے

جلتی پر تیل چھڑکا۔

''چپ رہ نامراد...... میں تو اس گھڑی کو روتی ہوں جب تجھے اور سلیم کو جنم دیا تھا۔'' اماں کی آواز بھرا گئی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا اماں کہ ایسی کون سی قیامت گزر گئی ہے کہ آپ سب لوگ مجھ پر نرغہ کر رہے ہیں۔''

''بھئی ہماری عفت اور ندرت نے تو کبھی زبان نہیں کھولی۔ ایک نے ڈاکٹری پڑھی دوسری نے وکالت، پَر جس کے ساتھ بیاہ دیا، سر جھکا کر چلی گئیں اس کے ساتھ۔'' چچی اماں نے نہایت معصومیت کے ساتھ جیٹھانی کو مورچے پر رکھا۔

''عالیہ تم اسے مسلمان کیوں نہیں کر لیتیں۔'' بھابھی صاحب نے مشورہ دیا۔

عالیہ سنبھل کر بیٹھ گئی ''یعنی مدن مسلمان ہو جائے تو آپ لوگوں کو کوئی اعتراض نہ ہوگا؟''

''اعتراض کی پھر کیا گنجائش رہے گی...... پھر تو ہم فخر سے کہتے پھریں گے کہ ایک کافر کو مسلمان کیا ہے ہماری عالیہ نے...... تمہاری دوست عطیہ نے بتایا تھا کہ پی ایچ ڈی ہے، اعلیٰ خاندان ہے، لاکھوں کماتا ہے، خوش شکل ہے۔'' بھابھی نے مدن کی خوبیاں بیان کیں۔

عالیہ نے ابرو اٹھا کر انہیں دیکھا ''تو کیا آپ لوگوں کے ذہن میں اوشا کو مسلمان کرنے کا خیال اس لیے نہیں آیا کہ وہ اونچی ذات کی نہیں تھی، غریب تھی؟''

اماں جو پانی کے دو گھونٹ پی کر تخت پر نڈھال پڑی تھیں اس کا یہ جملہ سنتے ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔

''ارے بی بی یہاں اس جان ہار اوشا کا کیا ذکر نکل آیا؟''

''میں اس کا ذکر اس لیے کر رہی ہوں اماں کہ آپ سب لوگوں کے ہوتے ہوئے اوشا مر گئی...... اگر وہ لاکھوں کما رہی ہوتی، کسی برہمن کی سپتری ہوتی اور دنیا دکھاوے کو مسلمان ہو جاتی تو نام اس کا فاطمہ یا زینب رکھا جاتا اور جھٹ سے وہ بیاہ لائی جاتی۔ پھر

آپ لوگ اسے کنویں میں نہ کودنے دیتے۔ اسے اس کے مذہب نے نہیں، اس کی غربت نے مارا۔'' عالیہ کی آواز اونچی تھی اور بدن کانپ رہا تھا۔

''قسم ہے خونِ حسینؓ کی، مجھے تو کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ وہ جب کنویں سے نکالی گئی ہے تب بتایا گیا مجھے۔'' اماں مدن کا قصہ بھول کر اوشا کو رونے لگیں۔

''آپ نہ جانتی ہوں گی اماں لیکن کیا گھر میں کسی کو کچھ نظر نہیں آیا تھا؟ وہ اگر سمیتا پاٹل ہوتی، شرمیلا ٹیگور ہوتی تو کوئی اس کے مذہب سے سروکار بھی نہ رکھتا، تب وہ کنویں کی تہہ میں نہیں اس کوٹھی میں رہتی، اس کوٹھی میں۔''

عالیہ کا دل شق ہونے لگا مدن کے لیے، اوشا کے لیے، اوشا کے پتا کے لیے۔ ایسے ہی ان کروڑوں انسانوں کے لیے جن کے خون آلود جغرافیے پر نفرتوں کے قطبین تھے۔ عالیہ کو اس لمحے شدید برف باری کے بعد سڑکوں پر جمی ہوئی برف صاف کرنے کے لیے نکلنے والی گاڑیاں یاد آئیں جو نمک چھڑک کر منٹوں میں برف کی گہری تہہ کو پگھلاتی چلی جاتی ہیں۔ اس کے، مدن کے اور دوسروں کے پاس ایسا نمک کیوں نہ تھا؟

☆☆☆

برف کی سلوں سے ترشی ہوئی نشستیں اسٹیڈیم کی فلڈ لائیٹس میں بلور کی طرح جگمگا رہی تھیں، پگھل رہی تھیں اور ان سے اٹھنے والا کہر ان گیدڑوں، لکڑ بگھوں اور بھیڑیوں کے سروں پر چکرا رہا تھا جو برف سے ترشی ہوئی نشستوں پر بیٹھے تھے اور اپنے اگلے پنجوں سے تالیاں بجا رہے تھے۔ ان کے منہ سے بہتی ہوئی رال ان کی نواب دین شیروانیوں، آسٹن ریڈ قمیصوں، ڈینم جیکٹوں اور کرسچین ڈویر جوتوں پر گر رہی تھی۔

آسٹروٹرف پر ہاکی کھیلی جا رہی تھی۔ بے چہرہ لوگوں کے پیروں کو پَر لگے ہوئے تھے۔ وہ کبھی اس ہاف میں ہوتے اور پلک جھپکتے دوسرے ہاف میں نظر آتے۔ سبز اور کیسری قمیص، بے نقش و نگار چہرے، ان کی آنکھیں نہیں تھیں اور پھر بھی نشانہ کمال کا تھا۔ چہرے کے چکنے پن سے آوازیں پھوٹ رہی تھیں۔ اللہ اکبر...... بجرنگ بلی...... ست سری اکال...... سارے خدا گڈمڈ ہو گئے تھے اور تمام مذاہب ایک دوسرے سے

گتھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان کوئی ریفری نہ تھا اور ان کے درمیان ایک نہیں کئی گیندیں تھیں۔ وہ ان کے پیچھے دوڑ رہے تھے، انہیں اپنی تلواروں، ترشولوں اور کرپانوں سے اچھال رہے تھے۔

اسی وقت ایک گیند زور سے اچھلی اور زناٹے سے عالیہ کے سامنے سے گزر گئی تب عالیہ نے پہچانا کہ وہ گیندیں نہیں، سر تھے، جب کوئی سر گول پوسٹ میں جا پڑتا تو کرپانوں، ترشولوں اور تلواروں والے آسٹروٹرف پر سجدہ ریز ہو جاتے اور اپنے اپنے خداؤں کا شکر ادا کرتے۔ نرالی آسٹروٹرف تھی کہ جس سے پانی کی بجائے خون کی دھارائیں پھوٹتیں۔ گیدڑ، لکڑ بگھے اور بھیڑیے اپنے اگلے پنجوں سے تالیاں بجاتے اور برف کی نشستیں آنسو بہاتیں۔

پھر اسے آسٹروٹرف پہ اوشا کے پتا نظر آئے۔ ایک آنکھ پر شیشہ چڑھا ہوا۔ عالیہ ان کے پیچھے بھاگی لیکن اسی وقت ''وہ مارا'' کا نعرہ اسٹیڈیم میں گونج گیا اور وہ اپنی آنکھ پر چڑھے ہوئے شیشے سمیت گول پوسٹ میں جا گرے۔ اس نے بھاگ کر ان کا کٹا ہوا سر اٹھالیا۔ مدن ...... مدن ...... وہ سسکنے لگی، اور اس کے آنسو ان کے چہرے پر لگی ہوئی مٹی اور بہتا ہوا خون دھونے لگے۔

اس نے بھیگے ہوئے تکیے سے سر اٹھایا۔ اسٹیڈیم کہیں نہیں تھا، گول پوسٹ معدوم ہو چکا تھا اور اوشا کے پتا کا کٹا ہوا خون آلود سر خواب کی دلدل نے نگل لیا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا نم چہرہ ٹھنڈا ہو رہا تھا اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ باہر سے پرندوں کی چہکار سنائی دی۔ اس نے لحاف اپنے اوپر سے ہٹایا، سرہانے رکھا ہوا بیگ کندھے پر ڈالا اور دبے قدموں چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔

بیلے اور موگرے کے کنج میں وہ کنواں تھا جس کی عمر اس کے خاندان کے ترکِ وطن سے کہیں زیادہ تھی اور جس میں اوشا نے پناہ لی تھی۔ اوشا، صبح کی دیوی، قرمزی لباس میں لپٹی ہوئی، سنہرا گھونگٹ کاڑھے ہوئے' وہ دلہن جو ہر جاندار کو سانس عطا کرتی ہے، جو سونے والوں کو جگاتی ہے...... وہی اوشا سہج سہج دیواروں، منڈیروں، پودوں اور

چہکتی ہوئی چڑیوں کے پروں پر اتر رہی تھی، لیکن اس گھر کی اوشا پاتال میں اتر گئی تھی،
وہ جو سب کو جگاتی تھی خود سونے چلی گئی تھی۔ پہلی اوشا نے دوسری اوشا کے روپ میں
جنم لیا تھا، تیسری اوشا کس گھر میں اور کہاں پیدا ہوئی ہوگی؟

عالیہ کو اوشا کی پیشانی پر گدا ہوا تپیا پھول یاد آیا۔ گہرے نیلگوں اور کاہی رنگ کا۔
صبح اس پھول سے طلوع ہوتی تھی۔ تیز ہوا چلی اور سدا بہار کے کئی پھول ٹوٹ کر اس
کے قدموں میں گر گئے۔ زمین ایک گھڑی ہے جو نظام شمسی میں گردش کرتی ہے اور یہ
ہوائیں ہیں جو اس کی گردش کی رفتار پر اثر انداز ہوتی ہیں تو کیا ہوائیں ہماری تقدیر پر
بھی گرفت رکھتی ہیں؟ اس نے بیگ سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا، صبح کی پہلی سگریٹ
سلگائی اور کنویں کی منڈیر پر بیٹھ گئی۔ کائی لگی اینٹیں، ان پر چلتی ہوئی چیونٹیاں اور ان کی
درز سے جھانکتی ہوئی گھاس کی پتیاں۔

عالیہ نے کنویں میں جھانکا۔ مہیب اندھیرا۔ اوشا اسی اندھیرے میں رہتی تھی، اوشا
کے پتا بھی وہیں کہیں ہوں گے۔ اس نے سگریٹ کا گہرا کش لیا، بیگ میں دو گھڑیاں
وقت کا حساب رکھ رہی تھیں۔ وقت نہ دشمنِ جاں، نہ یارِ مہرباں۔ ایک اتھاہ مقناطیسی
کنواں جس کی طرف سب کھنچے چلے جاتے تھے۔ کہکشائیں، ستارے، سیارے، انسان،
عشق، عداوتیں، ترکِ وطن، حب وطن۔ کیا سچ تھا اور کیا جھوٹ؟ سچ اور جھوٹ، خیر اور
شر سب کنویں کی تہہ میں جا رہے تھے۔ اس نے بیگ سے دونوں گھڑیاں نکالیں اور
مہیب اندھیرے کے سپرد کر دیں۔

چھپاک ...... چھپاک۔ وقت ان پر ہنس رہا تھا جو اسے گھڑیوں میں قید کرتے
تھے۔ اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ آسمان پر کوئی طیارہ گرجتا ہوا
منزل کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر صبح کی روشنی میں اس کا چمکتا ہوا بدن دیکھا۔
منزل؟ منزل ہے کہاں تیری؟

رقصِ مقابر

انقلاب زمانہ کا سفاک ہاتھ ماہ و سال کے رتھ پر چابک برساتا ہے اور یکساں رفتار سے چلتا ہوا رتھ تیزی سے دوڑنے لگتا ہے۔ نسلوں، قوموں اور بستیوں کو اس کے پہیے روندتے چلے جاتے ہیں۔ ہر شے کو تہہ و بالا کرتے ہوئے، ہر شہر کو وقفِ بلا کرتے ہوئے۔

میلوں میل کا دائرہ رکھنے والے پتھر کے پیالے میں وقت کا رتھ دوڑ رہا ہے۔ تیز، تیز تر۔ ہوسِ اقتدار کے چقماق سے چنگاریاں گر رہی ہیں اور آگ بھڑک رہی ہے۔ نسلیں جل رہی ہیں، چہرے پگھل رہے ہیں۔ پشتون، ازبک، تاجک، ہزارہ، دھگان اور بنجارے اس آگ کا ایندھن۔

ایک ترک نوجوان، سبزہ خط آثار، ایرانی مینا طوروں میں نظر آنے والا لباس پہنے' سر پر پگڑی، بغل میں کتاب، کمر میں تلوار، اس پتھریلے پیالے کی گگر پر کھڑا ہے جو ہزاروں فٹ کی بلندی پر ہے۔ وہ گردن گھماتا ہے اور اس طرف دیکھتا ہے جہاں آریانا ایئر لائنز کا طیارہ فضا کو چیرتا اور گرجتا ہوا اس پتھریلے پیالے کی سنگلاخ گگر سے چند سو گز اوپر گزر کر اس کے اندر اترنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ پہیے کھل رہے ہیں اور طیارے کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے اعصاب کھنچ رہے ہیں۔ طیارہ اس ترک نوجوان سے چند سو گز کے فاصلے سے گزرتا ہے۔ ہم دونوں کی نگاہیں چار ہوتی ہیں۔ وہ مسکراتا ہے اور میں اخلاقاً مسکرانے کی کوشش کرتی ہوں۔ جہاں زندگی اور موت میں

بال برابر کا فاصلہ ہو وہاں کیسی ہنسی اور کہاں کا اخلاق۔

میری گھبراہٹ دیکھ کر وہ مسکراتا ہے۔ بغل میں دبی ہوئی کتاب نکالتا ہے اور اسے میری نگاہوں کے سامنے لہراتا ہے۔

''یہ میرے لکھے ہوئے اوراقِ پریشاں ہیں۔ دن بھر دشمن کے تعاقب میں رہنے کے بعد جب میں پڑاؤ پر پہنچتا تو کبھی الاؤ اور کبھی مشعلوں کی روشنی میں انہیں لکھتا رہا۔''

وہ اس کی ورق گردانی کرنے لگتا ہے، پھر اسے بند کر دیتا ہے۔

''تم اب آئی ہو، میں نے صدیوں پہلے اسی جگہ پر کھڑے ہو کر منہ اندھیرے طلوعِ ستارۂ سہیل دیکھا تھا، ایک عمدہ شگون اور پھر سورج طلوع ہوا تھا، ایک پُر جلال اور پُر شکوہ وادی سونے کے رنگ میں رنگی گئی تھی۔''

''صدیوں پہلے۔'' مجھے ہنسی آ جاتی ہے۔ ایک سے ایک بڑبولا پڑا ہے اس دنیا میں۔

طیارہ پہاڑوں سے گھری ہوئی وادی کے اندر آ گیا ہے پتھریلی گگر سے بہت نیچے۔ اور تب یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو جاتے ہیں کہ وہ ہندوستانی کہانیوں کے سادھوؤں کی طرح ہوا میں تیرتا ہوا آتا ہے اور طیارے کے اس پنکھ پر بیٹھ جاتا ہے جو میری نشست سے کچھ ہی فاصلے پر ہے۔ مجھے رے بریڈ بری کی ایک کہانی یاد آتی ہے۔ اس میں بھی ایک کردار طیارے کے پنکھ پر آن بیٹھا تھا۔ میں اپنی نشست کو مضبوطی سے تھام لیتی ہوں۔

''میں نے پہلی مرتبہ اس شہر کو دیکھا تو یہ وہ زمانہ تھا جب میں قندر، بدخشاں، ہرات اور دریائے آمو کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ میں نے پہاڑوں کے اس عظیم دائرے میں تپتی ہوئی سنگلاخ چٹانوں کے درمیان اس دریا کو بہتے دیکھا تھا۔'' وہ انگلی سے ایک طرف اشارہ کرتا ہے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس طرف دیکھتی ہوں۔ ''اس روز اس دریا کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے بہتی ہوئی چاندی کی ایک زنجیر ہے جو ان ہیبت ناک پہاڑوں کے پیروں میں پازیب بن گئی ہے اور چاندی کی اس زنجیر کے دونوں

طرف سرسبز و شاداب مرغزاروں کے زمردیں ٹکڑے جڑے ہوئے ہیں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ آدم کے قاتل بیٹے قابیل کی سرزمین ہے اور اس کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ کسی کی حکومت تادیر برداشت نہیں کرتی۔"

میرے سامنے کی قطار میں بیٹھی ہوئی ایک یخیم شحیم عورت جو اپنی وضع قطع سے پنجاب کی لگ رہی ہے کھڑکی کی طرف جھک کر نیچے دیکھتی ہے اور پھر "ہائے ربّا" کہہ کر زور سے سینے پر دو ہتڑ مارتی ہے۔ اس کے برابر بیٹھا ہوا کیسری پگڑی والا سکھ نوجوان آہستہ سے اسے تسلی دیتا ہے۔

میں طیارے کے پنکھ پر بیٹھے ہوئے ترک نوجوان کو نظر انداز کرتے ہوئے نیچے کی طرف نظر کرتی ہوں۔ ہمارے طیارے سے چند سو فٹ نیچے شعلوں کی ایک چھتری سی تنی ہوئی ہے۔ میری ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ جاتی ہیں۔

ترک نوجوان ہاتھ لہرا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ میں جھنجھلا جاتی ہوں۔ یہاں جان پر بنی ہوئی ہے اور یہ ایران توران کی ہانک رہا ہے۔ میں جو دِلّی سے آ رہی ہوں، میں نے منہ اندھیرے کسی ستارۂ سہیل کا نظارہ نہیں کیا کہ اسے نیک شگون جانوں۔ جہادِ ملتِ اسلامیہ کے لیے دولت ریاستہائے متحدہ امریکہ کا نادر روزگار تحفہ، اسٹنگر میزائل اور اسے "ڈی ٹریک" کرنے والے اینٹی اسٹنگر فلیئر۔ ان کی لپک دیکھ کر سب ہی کے اوسان خطا ہیں۔ ہوسِ اقتدار کی چقماق سے گرنے والی کوئی بھی چنگاری کسی بھی لمحے آریانا ایئر لائنز کے اس طیارے کو جلا کر خاکستر کر سکتی ہے۔ طیارے کی فضا میں لتا منگیشکر کی مدھر آواز شاید ہماری حالت کا مذاق اڑا رہی ہے...... گنگا میا میں جب تک کہ پانی رہے، مورے سجنا تری زندگانی رہے...... یہاں کیا سجنی اور کیا سجنا سب ہی کا دم سولی پر ہے۔ ہماری یہ گائیکہ اس وقت بمبئی میں شاید ریاض کر رہی ہو یا کسی گانے کی ریکارڈنگ میں مصروف ہو، اسے بھلا کیا خبر کہ اگر سربلندئ ملتِ اسلامیہ کی خاطر گلبدین حکمت یار کے کسی "مجاہد" کا داغا ہوا کوئی میزائل طیارے کو آن لگے تو اس کی آواز سے بھرا ہوا صرف ایک کیسٹ جل جائے گا لیکن ہم سب چشم زدن میں خاکستر

...... یوں جیسے شمشان گھاٹ میں چتا پھونک دی گئی ہو۔ مانا کہ اس طیارے میں دِلّی سے سوار ہونے والے افغانی ہندوؤں اور سکھوں کی اکثریت ہے لیکن الحمدللہ کہ دس پانچ ہم جیسے مسلمان بھی ہیں۔ اجی ہٹاؤ بھلا اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ بعد از مرگ دفن ہوئے یا جلائے گئے۔ ابھی تو اندیشۂ مرگ سے ہی دم لبوں پر ہے۔ سب کی سانسیں رکی ہوئی، وقت کی گردش تھمی ہوئی۔ طیارے کے پہیے کابل ایئرپورٹ کی زمین کو چھو لیتے ہیں اور سب جیسے کسی طلسم سے آزاد ہو کر جی اٹھتے ہیں۔

میں طیارے کے پنکھ کی طرف نظر کرتی ہوں۔ وہاں نہ کوئی ترک ہے نہ تاجک۔ وہی رے بریڈ بری کی کہانی والا قصہ...... موت کا خوف کیسے کیسے سوانگ رچاتا ہے۔

☆☆☆

ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل کابل، باغ بالا کی چوٹی پر سر اٹھائے کھڑا ہے۔ کمرہ نمبر 119۔ میں بیقراری سے اپنے بستر پر کروٹیں بدلتی ہوں اور پھر اٹھ کر شیشے کی اس دیوار تک جاتی ہوں جس سے کئی میل پرے نشیب میں کابل ایئرپورٹ کی فضائی پٹی نظر آ رہی ہے۔ صبح کا ملگجا اجالا پھیل رہا ہے اور ان میں صنوبر اور بلوط کے اونچے اونچے پیڑ سبزے کی بکل مارے ساکت و صامت کھڑے ہیں۔ ہوا شاید ان کے شانوں پر سر رکھ کر سو گئی ہے۔ شیشے کی دیوار کے دائیں جانب چھدرا سا جنگل ہے۔

دل میں ٹیس سی اٹھتی ہے۔ ہم نے خطوں میں کتنی بہت سی آرزوئیں کی تھیں۔ کتنی بار مجھے کابل بلایا گیا تھا، کتنی ہی بار یہ پیام آیا تھا کہ ہمارے شہر آؤ تو مل کے سیر چمن کو چلیں گے۔ اس کے جنگلوں میں گھومنے کی، اس کی سڑکوں پر چلنے کی آرزو تھی۔ کابل یونیورسٹی کی روشوں پر ٹہلیں گے، خزاں جب پیڑوں کا لباس اتارے گی تو ان مناظر کو دیکھیں گے لیکن وقت اپنی چال چل گیا، اس شہر کا وہ گھر جس میں کئی جوڑ آنکھیں میری منتظر تھیں، وہ گھر کہیں کھو گیا تھا۔ مکینوں نے مکان بدل لیا تھا۔ منتظر آنکھیں دنیا کے میلے میں کھو گئی تھیں۔ اپنا پتا اور نشان بھیجے بغیر۔ جرمنی، امریکا، انگلستان۔ ان محبوب ہاتھوں کی تحریریں صدیوں سے نہیں دیکھیں۔ لیکن آقائے عبدالحئی حبیبی تو کہیں نہیں گئے

ہوں گے اور مادام حبیبی جنہیں ان کے بچوں کی طرح میں بھی ''ببو جان'' کہتی تھی، وہ بھلا کہاں گئی ہوں گی۔ میں انہی سے مل لوں، ان کی قدم بوسی کرلوں۔

کابل ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد سے رات ہونے تک میں آقائے حبیبی کے بارے میں ایک ایک سے پوچھتی رہی ہوں لیکن سب ہی نے اتنے اصرار سے نفی میں سر ہلایا ہے کہ مجھے یقین آ گیا ہے کہ یہ لوگ آقائے حبیبی کے پتے سے واقف ہیں۔ اور نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی الہ آباد میں پنڈت رگھوپتی سہائے فراق گورکھ پوری کا پتہ پوچھے اور اس سے کہا جائے کہ ہم انہیں نہیں جانتے۔ میں نے اپنے کمرے میں ٹیلی فون ڈائریکٹری تلاش کی لیکن افغانستان میں اس نام کی کوئی چیز پائی نہیں جاتی۔ آپریٹر نے رئیس مجلس سنا (اسپیکر) محمود حبیبی کے گھر کا نمبر ملا دیا۔ محمود حبیبی اس خاندان کے بے حد قریبی رشتہ دار لیکن نام پہچاننے سے بھی انکاری۔ وہ مرغلرہ کو نہیں جانتے، انہوں نے حبیب اور میرویس کا نام نہیں سنا۔ جب میں انہیں آقائے عبدالحئی حبیبی سے ان کی رشتہ داری یاد دلاتی ہوں تو وہ غصے سے فون بند کردیتے ہیں۔ کچھ تو ہے کہ جس کی پردہ داری ہے۔

ملک اور شہر جب دو مخالف اور متحارب کیمپوں میں بٹ جائیں، جب چچا، بھتیجے کے اور ماموں، بھانجے کے خلاف ہتھیار اٹھا رہا ہو، جب بھائی، بھائی کی مخبری کر رہا ہو تو رئیس مجلس سنا کو ایک پاکستانی ادیب اور اخبار نویس کے ساتھ یہی سلوک کرنا چاہیے۔ مانا کہ میں صدر افغانستان کی مہمان ہوں لیکن بہ خدا آئی ایس آئی کی ایجنٹ بھی ہوسکتی ہوں یا ایم آئی کی۔ اور جب براستہ دِلّی واپس کراچی پہنچوں گی تو یہود و ہنود کی ایجنٹ قرار پاؤں گی۔ ہیون سانگ اور فاہیان اور ابن بطوطہ ہمارے زمانے میں ہوتے تو دیکھتے کہ سی آئی اے یا کے جی بی کے ایجنٹ کیسے نہیں کہلاتے۔ ان دونوں کے لیے کام کرنے کے الزام سے بچ نکلتے تو انہیں ''را'' کا ایجنٹ ثابت کرنا تو بائیں ہاتھ کا کام تھا۔

کوئی ہولے سے کھنکارتا ہے۔ میں دہشت زدہ ہوکر پلٹتی ہوں۔ مقفل کمرے میں کوئی اندر کیسے آیا؟ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا ہے۔ وہ رائٹنگ ٹیبل کے ساتھ والی

کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا ہے اور مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہا ہے۔ وہی ترک نوجوان ...... لیکن وہ تو واہمہ تھا، نظر کا فریب ...... تو پھر یہ کون ہے اور پتھریلی دیواروں سے گزر کر مجھ تک کیسے آ پہنچا ہے؟ خیالوں کی یورش، اندیشوں کی دوا دوش۔

''دیواریں ......'' وہ ہنستا ہے ...... ''میرا راستہ تو فصیلیں اور دریا اور گہری کھائیاں نہیں روک سکی تھیں، تو پھر اس دیوار کی کیا حقیقت ہے۔'' وہ اپنی انگلیوں کو دیوار پر بجاتا ہے، بغل میں دبی ہوئی کتاب رائٹنگ ٹیبل پر رکھ دیتا ہے اور اب کمر سے بندھی ہوئی تلوار کھول رہا ہے۔ شاید میری گردن اڑانے والا ہے۔ میری خطا؟ میرا قصور؟

''میں تمہیں بتاؤں، جنگ کے دامن سے جدائی بندھی چلی آتی ہے۔ میں نے بھی وہ جدائیاں بہت جھیلی ہیں جن سے تم دل گرفتہ ہو، اور میری وجہ سے ہزاروں، لاکھوں جدائی کے عذاب سے گزرے۔'' اس کی آواز ملول ہوگئی ہے۔

میں غور سے اسے دیکھتی ہوں۔ ''تم عالم الغیب ہو؟''

وہ نفی میں سر ہلاتا ہے۔

''تو پھر یکے از رجال الغیب؟''

وہ مسکراتا ہے ''میرے بارے میں جو جی چاہے فرض کرلو لیکن بس یہ ہے کہ میں تھا، میں ہوں اور میں رہوں گا۔''

''یہ تو کچھ خدائی کی سی دعویداری کا معاملہ ہے۔'' میں ابرو اٹھا کر اسے دیکھتی ہوں۔

''میں روحِ زمانہ ہوں جو کبھی ایک اور کبھی دوسرے نام میں قیام کرتی ہے۔''

''تو اے روحِ زمانہ ان دنوں تم کس نام میں قائم ہو؟'' مجھے اب اس کی باتوں میں لطف آ رہا ہے۔

''تو تم کیا واقعی ابھی تک مجھے نہیں پہچانیں؟'' اس کی آواز میں حیرت ہے۔ ''کل میں روزانہ کی دھواں دھوں سے بیزار ہوکر ذرا سیر کو نکلا تھا کہ تمہارے ہوا پیا پر نظر پڑی۔ اس ہجوم میں بس تم ہی تھیں جو مجھے جانتی تھیں، اسی لیے تم سے کلام کیا۔''

میں اسے غور سے دیکھتی ہوں۔ کھنچی ہوئی غلافی آنکھیں، نکیلی ٹھوڑی۔ ''ہاں شاید تمہیں کہیں دیکھا تو ہے۔'' میں جھینپ جاتی ہوں۔

وہ ایک گہرا سانس لیتا ہے اور پھر میز پر رکھی ہوئی کتاب اٹھاتا ہے اور میرے سامنے لہراتا ہے ''تم نے اسے کئی بار پڑھا ہے۔''

لیجیے صاحب، اسے کہتے ہیں مان نہ مان میں تیرا مہمان، ابھی جناب کا دعویٰ روحِ زمانہ ہونے کا تھا، اب شکایت اس کی ہے کہ میں انہیں پہچان کیوں نہیں رہی اور اس پر بھی اصرار ہے کہ میں نے ان کی کتاب کئی بار پڑھی ہے۔ یہ تو اپنی پوشاک، پگڑی اور پاپوش سمیت آنکھوں میں گھسے آتے ہیں۔ مجھے ہنسی آ جاتی ہے۔ جھوٹے کو گھر تک چھوڑ کر آنا چاہیے۔ میں ہاتھ آگے بڑھا کر وہ کتاب اٹھا لیتی ہوں جس پر مراکشی چمڑے کی جلد ہے۔ میں اسے کھولتی ہوں، اس فارسی مخطوطے کا ہر صفحہ مطلّا اور ہر صفحہ مذہّب ہے۔ پہلی سطر پر میری نظر پڑتی ہے۔

''در سنہ ہشت صد و نو دو نہ، در ولایت فرغانہ بہ سن دوازدہ سالگی پادشاہ شدم۔''

میری انگلیاں لرزنے لگتی ہیں۔ ناممکن۔ میں نگاہیں اٹھاتی ہوں۔ میرے سامنے اس وقت کا محمد ظہیر الدین بابر مسکرا رہا ہے جب اس نے ''بادشاہ'' کا لقب اختیار نہیں کیا تھا اور میرے ہاتھوں میں ''بابرنامہ'' ہے۔

''توزک میں نے ترکی میں لکھی تھی، یہ اس کا فارسی ترجمہ ہے جسے عبدالرحیم خان خاناں نے برائے خوشنودی پادشاہ محمد جلال الدین اکبر بہ قلمِ خود نقل کیا۔'' وہ میری حیرت سے لطف اندوز ہو رہا ہے، اسی لمحے دروازے پہ دستک ہوتی ہے۔ روح زمانہ پلِ چھن میں آنکھوں سے اوجھل۔ نہ شمشیر، نہ کتاب، میں غرق در آبِ حیرت۔

دستک دوبارہ ہوتی ہے۔ اب کہیں محمد جلال الدین اکبر یا محمد نور الدین جہانگیر نہ چلے آتے ہوں۔ میں جھجکتے ہوئے دروازہ کھولتی ہوں۔

سامنے کسی روحِ زمانہ یا رجال الغیب کی بجائے گوشت پوست کا بیل بوائے کھڑا ہے۔ ''خانم۔ جاکت و دامن ولباسِ روز''

ہینگر پر میرے استری شدہ کپڑے۔
ایک ڈالر کے نوٹ کی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقلی۔
''متشکرم۔ متشکرم۔''

☆☆☆

ارگ ...... پریذیڈنشل پیلس۔ ایک پُرشکوہ پتھریلی عمارت۔ راہداریوں سے گزر کر کمرۂ ملاقات۔

شوروی جاچکے۔ جنیوا معاہدہ ہوچکا۔ اس معاہدے کی قیمت پاکستانی وزیراعظم جونیجو نے معزولی کی شکل میں ادا کی اور آمرِ مطلق جنرل ضیاء نے جان کی صورت۔

میں جنرل نجیب کی گہری اور پُرسکون آنکھوں میں جھانکتی ہوں۔ اس شخص سے کیسی کیسی کہانیاں وابستہ ہیں۔ ''خاد'' کا سربراہ، زندانِ پل چرخی کے عقوبت خانے میں اس کے حکم کے بغیر پتہ نہیں ہلتا تھا۔ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ؟ لیکن جس بات کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا وہ یہ ہے کہ اس شخص نے امریکیوں اور روسیوں، پاکستانیوں اور ہندوستانیوں سبھی کے اندازے الٹ کر رکھ دیے ہیں۔ دنیا میں روزانہ اس کی حکومت کے خاتمہ کا مژدہ سنایا جاتا ہے اور یہ ہے کہ اپنی کرسی پر جما بیٹھا ہے۔

میرے کانوں میں روحِ زمانہ کی آواز گونجتی ہے۔ ''یہ سرزمینِ قابیل ہے، آدم کے قاتل بیٹے کی بسائی ہوئی۔ شاید اسی لیے اس کی خاصیت ہوچکی ہے کہ تادیر کسی کی حکومت برداشت نہیں کرتی۔'' جنرل نجیب کو یہ زمین نہ جانے کب تک برداشت کرے۔

نجیب ترجمان کے ذریعے باتیں کرتے کرتے اچانک اردو بولنے لگتے ہیں۔ ان کی جوانی پشاور کے گلی کوچوں میں گزری ہے وہ اپنے کالج کے ساتھیوں کو، سیاسی دوستوں کو یاد کررہے ہیں۔ پشاور کے بازار اور کراچی کی گلیاں نجیب کی آنکھوں میں جاگنے لگتی ہیں۔ وہ فیض کے اشعار دُہرا رہے ہیں۔ میں اس شخص کو دیکھتی ہوں، یہی ہے جو اس گھر کا نام و نشان بتا سکتا ہے، جس کا راستہ مجھے کوئی نہیں بتاتا۔ شاید میرا سوال

پروٹوکول کے اعتبار سے مناسب نہ ہو۔ شاید اس گھر نے ترہ کی، امین، ببرک کارمل اور نجیب کی سیاست سے اختلاف کیا ہو۔ شاید اس گھر کے کسی بیٹے کی چیخیں بھی زندان پل چرخی میں گونجی ہوں۔ خوف کا ایک لحظہ، ہچکچاہٹ کی ایک ساعت لیکن دل کے رشتے کسی زندان، کسی بندی خانے کو نہیں جانتے۔

میں اپنی فنجان پر ایک نظر ڈالتی ہوں جو خالی ہو چکی ہے اور جس کی تہہ میں چائے کی چند پتیاں رہ گئی ہیں۔ کسی پیالی کی تہ میں رہ جانے والی پتیوں سے کیا واقعی تقدیر پڑھی جاسکتی ہے؟

اور میں اس شخص کے بارے میں پوچھ بیٹھتی ہوں جو پشتو دانش و ادب کی آبرو تھا، جس کے نام کے بغیر پشتو ادب اور افغان دانش کا تذکرہ مکمل نہیں ہوتا، جس نے اپنی زندگی کے سنہرے سال جلاوطنی میں گزارے۔ دانش گاہ پنجاب کی مرتب کردہ دائرۃ المعارف اسلامیہ میں جس کی تحریریں شامل ہیں۔ جس کے گھر کا عشق آج بھی دل میں پہلے دن کی طرح راسخ ہے، ایک ایسا گھر جس کے کسی بھی فرد کو میں نے 28 برس سے نہیں دیکھا۔

نجیب کی آنکھیں میری آنکھوں میں گڑی ہوئی ہیں ''یہ سوال شاید آپ نے کسی اور سے بھی کیا تھا۔''

میری پیشانی پر ہلکی سی نمی پھیل جاتی ہے۔ جنرل نجیب کو اپنے مہمان کے سوالات کے بارے میں اطلاع مل چکی ہے۔ خاد ...... افغان سیکرٹ سروس۔ ...... زندانِ پل چرخی ...... وہ جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔ امریکی جاسوسی فلموں کے مناظر آنکھوں میں گھوم جاتے ہیں۔

اب جو ہو سو ہو ''جی ہاں میں افسر مہمانداری عباس کرگر سے اور کئی دوسروں سے بھی یہی سوال کر چکی ہوں۔''

ہم دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے کو تول رہی ہیں۔

ایک گہرا سانس اور پھر جھکی ہوئی نگاہوں کے ساتھ جنرل نجیب اپنے سامنے رکھی

ہوئی پنسل سے کھیلنے لگتے ہیں ''آقائے عبدالحئ حبیبی کے خاندان میں سے اب کوئی بھی کابل میں نہیں۔''

مجھے صدر افغانستان کی بات پر اعتبار نہیں آتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ بوجان نے وہ شہر چھوڑ دیا ہو جس پر وہ ہزار جان سے عاشق تھیں، جس کا نام لیتے ہی ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی۔

اور یہ بات پانچ برس بعد کراچی میریٹ میں بیٹھے ہوئے ان کے سب سے چھوٹے بیٹے خوشحال حبیبی نے بتائی کہ میرا یقین درست تھا۔ جب میں کابل میں ان کے گھر کا راستہ ڈھونڈ رہی تھی اس وقت وہ کابل میں ہی موجود تھیں، آقائے عبدالحئ حبیبی ختم ہو چکے تھے۔ چاروں بچے افغانستان سے باہر تھے، پُرامن زمینوں میں۔ لیکن وہ کابل میں تھیں، تنہا...... اکیلی۔ اور جب ان کے بیٹوں نے انہیں بہ اصرار اپنے پاس بلانا چاہا اور وہ کسی نہ کسی طور سرحد عبور کر کے پشاور میں اپنے ایک رشتہ دار کے پاس پہنچائی گئیں تو اسی رات ختم ہو گئیں اور اب پشاور کے کسی قبرستان میں سوتی ہیں۔ ان کے آخری لمحوں میں ان کی کوئی اولاد ان کے پاس نہ تھی اور انہوں نے دس برس سے کسی کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ خوشحال حبیبی IUCN کی کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے کراچی آیا تھا اور کسی نہ کسی طرح میرا فون نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

بوجان تم جو ستر پچھتر برس کی ایک فراق زدہ عورت تھیں، جس کی جوانی اپنی ماں، اپنے بھائیوں اور بہنوں سے اور کابل سے جدائی کے غم میں آنسو بہاتے بسر ہوئی، جس کا بڑھاپا اپنے بچوں کے فراق میں تڑپتے اور خون روتے گزرا ہوگا۔ تم سے اگر میں گھنٹہ گھڑی کے لیے مل لیتی تو کون سی قیامت آ جاتی؟ لیکن بوجان، رموزِ مملکت خسرواں دانند اور خسرو اپنے پہلو میں دل نہیں رکھتے اور شاید دنیا کی بیشتر عورتوں کے دلوں کا اپنے پیاروں اور اپنے شہروں کی جدائی سے دولخت رہنا ہی ان کا مقدر ہے۔

☆☆☆

افغانستان کی لتا منگیشکر، نغمہ منگل کی دلدوز آواز کابل انٹر کانٹی نینٹل میں ''پامیر

کلب'' کے در و دیوار کے بوسے لے رہی ہے۔

''کابل تو تباہ نہیں ہوا

کابل میں تیرے فراق میں بیقرار

کابل تیری گلیوں کے سامنے ساری گلیاں ہیچ

کابل میں کہیں بھی رہوں، لوٹ کر تیری گلیوں میں آؤں گی۔''

نغمہ منگل کی آواز گلوگیر ہے اور سننے والے دل گرفتہ۔ فراق رشتوں سے، جدائی شہروں سے، وہ جنہیں جنگ اور سیاست اپنے گھروں سے نوچ کر اجنبی بستیوں کی طرف اچھال دے، وہ بھلا کب لوٹ کر سہسرام اور دِلّی اور کابل کی گلیوں میں واپس آئے ہیں۔ آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں، اک مشت خاک لے کے صبا نے اڑا دیا۔

☆☆☆

ٹیلی وژن اسکرین پر کابل کے ایک چوک میں کھمبے سے جھولتے ہوئے جنرل نجیب کا خون آلود چہرہ اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ پھریرے بن کے میرے تن بدن کی دھجیاں، شہر کے دیوار و در کو رنگ پہنانے لگیں، پھر نکل آئے ہوسناکوں کے رقصاں طائفے، دردمند عشق پر ٹھٹھے لگانے کے لیے...... وہ جس کے زمانے میں کابل خون میں نہیں نہایا تھا، اسی نے کابل میں اپنے لہو سے وضو کیا۔ وہ جس نے امریکیوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے تھے اسی کے منہ میں ڈالر ٹھونسے جا رہے ہیں۔ وحشی چہروں والے اس کے بے جان بدن کی بے حرمتی کر رہے ہیں، قہقہے لگا رہے ہیں۔ ''آدم کے قاتل بیٹے قابیل کی بسائی ہوئی بستی کسی کی حکومت تادیر برداشت نہیں کرتی۔'' روحِ زمانہ کی آواز کسی پُرشور موج کی طرح آتی ہے اور گزر جاتی ہے۔

میری نگاہوں میں کابل کے پریذیڈنشل پیلس کا وہ کمرہ گھوم جاتا ہے جس میں ہم نے باتیں کی تھیں، ہماری تصویریں کھنچی تھیں۔ تصویریں رہ جاتی ہیں۔ تصویروں والے دار پر کھینچ دیے جاتے ہیں۔ خاک میں ملا دیے جاتے ہیں۔

تو اب یہ سرزمین نئے آنے والوں کو کتنے دنوں برداشت کرے گی، کتنے بے گناہوں کا لہو ابھی اس سرزمین کو اور سیراب کرے گا۔

کابل میں ہر طرف طالبان کے ''امن'' پرچم لہرا رہے ہیں۔ وہ سفید جھنڈے جن پر خون کے دھبوں کے درمیان اب کہیں کہیں سفیدی رہ گئی ہے۔

لوگ سولیوں پر لٹکائے جا رہے ہیں۔ عورتیں اور مرد سنگسار ہو رہے ہیں۔ بوڑھوں کو ان کی داڑھیوں سے پکڑ کر، لاٹھیوں اور چابکوں سے مسجدوں کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔

''1924ء میں جہنمی امیر امان اللہ خان نے عورتوں کو گھروں سے نکالا تھا۔ ہم نے اس ملعون کی اور اس کے بعد آنے والے تمام ملاحدہ کی شریعت منسوخ کی۔ عورتیں حجروں میں پیدا ہوں گی اور ان ہی میں زندگی گزار کر اپنے گھروں کے آنگنوں میں دفن کر دی جائیں گی۔ علم انہیں گمراہ کرتا ہے، بے باک و گستاخ کرتا ہے اور مردوں کے لیے بھی یہ ہم طے کریں گے کہ وہ کیا پڑھیں گے اور کیا نہیں۔ ہم خود علم کا خزینہ، علوم کا دفینہ ہیں۔ یہ فرنگی اور شوروی ہمیں کیا سکھائیں گے؟''

جلا دو، جلا دو کتابوں کو جلا دو، گرا دو، گرا دو تہذیب افرنگ کی ہر نشانی گرا دو۔ کھرچ دو، کھرچ دو ہر تصویر کو، ہر تحریر کو کھرچ دو۔ کچل دو، کچل دو ہر ساز کو، ہر آواز کو کچل دو۔ موسیقی حرام ہے اور مصوری شرک، ٹیلی وژن شیطان کا چرخہ۔ گھر گھر بت کدے ہیں۔

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں، مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ۔

''یا امیر المومنین ملا عمر۔ اسلحہ امریکی ہے اور گولہ بارود بھی افرنگی؟''

''ان گستاخوں کی زبان گدی سے کھینچ لی جائے۔ انہیں پل چرخی کے زندان میں بند کیا جائے۔ ہم کفار کو تہس نہس کرنے آئے ہیں اور ہمیں اسلحہ چاہیے خواہ وہ افرنگی ہو یا امریکی۔''

''یا امیر المومنین لیکن مولوی ربانی اور احمد شاہ مسعود بھی کلمہ گو ہیں۔''

''وہ دشمنانِ دین، دشمنانِ اسلام ہیں۔ ہم اسی کی جاں بخشی کریں گے جو ہماری

سربراہی تسلیم کرے۔"

اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی؟ ایک اور موج خوں کابل کے سر سے گزر رہی ہے۔

دنیا بھر میں سوالوں کا ایک ہجوم ہے "یہ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کون ہے ان کے پیچھے؟"

"یہ میرے بچے ہیں ...... My Disciples ۔ ہمارے مدرسوں کے پالے ہوئے، ہماری تربیت گاہوں کے ڈھالے ہوئے۔ ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے۔ نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر۔ ہم نے طالبان کی شکل میں اللہ کی فوج بنائی ہے۔ اللہ کی فوج۔"

"لیکن جنرل صاحب خادمین حرمین شریفین نے تو خلیج کی جنگ میں امریکی اور افرنگی فوج بلائی تھی۔"

"کون ہے یہ غدار؟ یہود و ہنود کا ایجنٹ؟"

"حضور ہمارے یہاں حب وطن کا ٹینڈر کب تک صرف حاضر اور سابق جرنیل بھرتے رہیں گے؟"

"ارے کوئی ہے جو اس بدبخت کی زبان گدی سے کھینچ لے اور کراچی کے کسی عقوبت خانے میں رکھے۔"

سفاک چہرے والا ایک قابو چی چھڑی بغل میں دبائے ہوئے ٹہل رہا ہے۔ خاکی لباس، شانوں پر ستارے جھلملا رہے ہیں۔ آواز کہیں دور سے آتی ہے...... ہم اپنے صف شکنوں کو سلام کرتے ہیں۔ ہم اپنے صف شکنوں کو سلام کرتے ہیں۔ سفاک چہرے پر ایک آسودہ مسکراہٹ۔ "شاعر ہمیں خراج دیتے ہیں۔ لفظوں کا خراج اور یہ ملعون، یہ بدبخت۔ گندی نالی کے یہ کیڑے۔ یہ اخبار نویس ہم سے سوال کرتے ہیں؟ ہم سے ......؟" پادشاہ ہندوستان محمد ظہیر الدین بابر کا ہم نام اپنے دانت پیستا ہے۔

"بابر ...... بابر ......!" کراچی کے کسی عقوبت خانے میں اذیتیں سہتا ہوا کوئی

نوجوان چیختا ہے۔

ایسے میں اچانک وہ نمودار ہو جاتا ہے، وہ جو آریانا افغان کے طیارے کے پنکھ پر بیٹھا باتیں کر رہا تھا اور پھر کابل انٹر کانٹی نینٹل میں آن پہنچا تھا۔ کمر میں تلوار ہے اور ہاتھ میں توزک، عبا کا دامن ہوا سے لہرا رہا ہے۔

''کسی نے مجھے پکارا؟'' ترچھی ترک آنکھیں مجھے غور سے دیکھتی ہیں۔

''نہیں ...... تمہیں نہیں، تمہارے کیری کچر کو ......'' میں خاکی وردی والے کی طرف اشارہ کرتی ہوں جو ٹیلی وژن اسکرین پر کف در دہن چیخ رہا ہے۔ ''طالبان، مسلم امہ کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ مسلم امہ کی جنگ''

''یہ ......؟ ہشت ...... میرے زمانے میں ہوتا تو اسے سپاہی بھی بھرتی نہ کرتا۔ تاریخ میں منادی کر دی جائے ...... ہاں تاریخ میں منادی کر دی جائے کہ من کہ محمد ظہیر الدین بابر میں نے کبھی اس طرح اپنے لوگوں پر ستم نہیں توڑے۔ میں نے کبھی اپنے شہر نہیں اجاڑے، اپنے ہی لوگوں کے قاتلوں اور اپنے ہی شہروں کو اجاڑنے والے بابروں سے میرے خاندان کا کوئی علاقہ نہیں۔ ہمارے یہاں ممتاز محل تھی جس نے ایک بیٹا غلط جنا تھا اور اس کی قیمت سارے خاندان نے رائیگاں ہو کر اور بے نام و نشاں ہو کر ادا کی۔''

ٹیلی وژن اسکرین پر اب مس ورلڈ، ایشوریا رائے اپنا جلوہ دکھا رہی ہیں۔ ایسان دولت بیگم کا نواسہ اور نگار خانم مغل صدر بیگم کا بیٹا، بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست گنگناتا ہوا اس طرف متوجہ ہے۔

کہ عالم دوبارہ نیست ...... کہ عالم دوبارہ نیست ...... مس ورلڈ اپنی جھلک دکھا کر غروب ہو جاتی ہیں۔ پان پراگ کا اشتہار۔

بابر کی آنکھوں میں گزرے ہوئے دنوں کی دھند ...... ''بہ خال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را ...... اسے دیکھ کر مجھے اپنی عم زاد معصومہ سلطان کی یاد آئی۔ در شہوار، در آبدار تھی۔ میری منکوحہ، میری محبوبہ، ہرات میں دیکھا تھا اسے اور دل ہار بیٹھا تھا۔ زندگی نے اس

سے وفا نہ کی۔'' وہ ایک آہ بھرتا ہے۔

اشتہاروں کے بعد ٹیلی وژن پر ''زی نیوز'' کا سلسلہ پھر سے شروع ہوگیا ہے۔ اسکرین دراز داڑھیوں اور سفاک چہروں سے بھرا ہوا ہے۔ تسبیح کے دانے شمار کرنے والی انگلیاں گولے اور میزائل داغ رہی ہیں۔ توپوں کی نالیں شعلے اگل رہی ہیں۔ الجہاد...... الجہاد...... الجہاد...... الامان...... الامان...... الامان...... لوگ بھاگ رہے ہیں۔ گرتے پڑتے، ٹھوکریں کھاتے، گردنوں میں دربدری کے طوق لٹکے ہوئے، آنکھوں میں ویرانیوں اور وحشتوں کے الاؤ جلتے ہوئے، شہر اور دیہات، کھیت اور باغات، بارودی سرنگوں سے اٹے ہوئے، پٹے ہوئے۔ ہماری عظیم طاقتوں کی ایجادوں سے پناہ کہیں نہیں۔ بچے باپ سے محروم، ماؤں سے بچھڑے ہوئے۔ کسی کا ہاتھ ندارد۔ کسی کی ٹانگیں اڑی ہوئی۔ میری نگاہوں میں اندرا گاندھی انسٹی ٹیوٹ آف چائیلڈ ہیلتھ، کابل کے وہ وارڈ گھوم جاتے ہیں جہاں میں نے ان سینکڑوں معذور بچوں کو دیکھا تھا جو لینڈ مائینز اور بلائینڈ راکٹوں کا شکار ہوئے۔ سوراخ دار ہڈیاں، کھوپڑیاں چٹخی ہوئی، کسی کے دونوں ہاتھ، کسی کے دونوں پیر کٹے ہوئے۔ یہ جوئے خوں ہے، یہ جوئے خوں ہے۔ چار برس سے ادھر اور ادھر دونوں طرف دعویٰ نفاذ اسلام کا۔ دونوں اپنے مقتولین کو شہید کہنے پر مصر۔ دونوں ایک دوسرے کے مقتولین کو جہنم واصل کرنے کی لذت سے سرشار۔ قاتل بھی کلمہ گو، مقتول بھی۔ دونوں کے صنم خاکی، دونوں کے صنم فانی...... اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی؟

ہم سے کہا گیا تھا ''سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا۔ لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا...... تو اب ہم ہی امام...... ہم ہی امیر المومنین۔ تم جب تک ہمیں تسلیم نہیں کرتے، ہماری تعظیم نہیں کرتے۔ جنگ جاری ہے۔ جنگ جاری رہے گی۔ کشتوں کے پشتے لگتے رہیں گے، شہر جلتے رہیں گے، انسان پگھلتے رہیں گے۔ الجہاد...... الجہاد۔''

''کیسا جہاد؟ کہاں کا جہاد؟ محض فریبِ نفس، خواہشِ اقتدار۔'' روحِ زمانہ، محمد

ظہیرالدین بابر کے وجود میں بل کھاتی ہے۔ ''سعدی شیرازی نے کہا تھا: ''دو درویش در گلیمے بہ خسپند و دو پادشاہ اقلیمے نہ گنجند'' سعدی کے کہنے کے مطابق دس درویش ایک کمبل پر سو سکتے ہیں لیکن دو بادشاہ ایک مملکت میں سانس نہیں لے سکتے۔ تو یہ کیسے درویش ہیں جنہیں اپنے سوا کوئی دوسرا گوارا نہیں؟''

روح زمانہ کف در دہن ہے اور کھلی ہوئی کھڑکیوں سے آتی ہوئی تیز سمندری ہوا میں توزک بابری کے ورق پھڑ پھڑا رہے ہیں۔

اسکرین پر سے تصویریں جو پل بھر کے لیے غائب ہوگئی تھیں پھر ابھر آئیں۔

گلی گلی گھر گھر۔ ''عورتیں گھروں میں رہیں گی۔ سڑک پر ان کا منادی ہورہی ہے۔ سایہ نظر نہ آئے۔ قدم باہر نکالنے والیوں کو شرعی سزائیں دی جائیں گی۔ عورتوں پر شیطان کا سایہ ہے سو انہیں گھروں میں رکھو۔ کسی اخبار میں ان کی تصویر نہ چھپے۔ کسی اسکول یا مدرسے کی طرف ان کے قدم نہ اٹھیں۔ ٹانگیں توڑ دی جائیں گی، پیر کاٹ دیے جائیں گے۔ بیواؤں کے گھروں میں فاقے ہوا کریں۔ بے باپ کے بچے لاچار ماؤں کی گودوں میں بھوکوں مریں۔ نفاذ شریعہ فاقے اور بھوک اور موت پر مقدم ہے۔''

محمد ظہیرالدین بابر جو ایک دیوان پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے، آہِ سرد بھرتا ہے ''ان سے اچھے تو ہم تھے جو سربلندیٔ اسلام کے لیے نہیں اپنی امارت و بادشاہت کے لیے لڑتے تھے۔ میں نے جو ابراہیم لودھی سے ہندوستان کی سلطنت چھینی تو کون سی خدمتِ اسلام کی؟ ہاں جب کفار کے ملک فتح کرتے تو کچھ فائدہ دینِ مبین کا بھی ہوجاتا۔ ہم نمازیں ادا کرتے، مسجدیں بناتے، شراب پیتے اور اپنے اردو میں اکثر اپنی ماؤں اور بیویوں کو ساتھ رکھتے تھے۔ میری شیر دل نانی ایسان دولت بیگم، میرے تن آسان باپ کے محل اور ملک کا سارا انتظام، میری منتظم ماں نگار خانم المعروف بہ مغل صدر بیگم اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی، لکھنا پڑھنا جانتی تھی اور شعراء کے کلام سے لطف اندوز ہوتی۔ میری بہن خانزادہ بیگم، میری سوتیلی نانی شاہ بیگم، میری سوتیلی خالہ مہر نگار چغتائی، میری افغان بی بی مبارکہ بیگم، ماہم خانم ...... سبحان اللہ کیا عورتیں تھیں۔ میدان

میں ہوتیں تو گھوڑوں پر سواری کرتیں، قیامت کی تیر انداز، تلوار چلاتیں، جانوروں کو اور وقت پڑے تو دشمنوں کو شکار کرتیں۔ خیموں میں ہماری ناز برداری کرتیں، شعر خوانی میں حصہ لیتیں، داستان سرائی کرتیں، کتابیں لکھتیں، میری بیٹی گلبدن بیگم نے ''ہمایوں نامہ'' لکھا جس کی دھوم سارے جہان میں ہے، میری پوت بہو نور جہاں بانو بیگم نے سارے ہندوستان پر فرمانروائی کی۔ ٹکسال میں اس کے نام کا سکہ ضرب ہوا، میری سگڑ پوتی زیب النساء مخفی، صاحب دیوان ہوئی۔ یہ عورتیں جن کا خمیر سمرقند و بخارا سے، بلخ و بامیان سے اور کابل و قندھار سے اٹھا تھا اور جو صدیوں پہلے گزر گئیں کیسے کیسے کام کر گئیں اور یہ بد بخت جنہوں نے کابل پر یلغار کی، اس کی عورتوں کو زندہ درگور کیے دیتے ہیں۔''

کسی وومن ایکٹوسٹ کی تک سک سے درست تقریر۔

''میں جا رہا ہوں۔'' وہ یکا یک کھڑا ہو جاتا ہے۔

''اب کہاں کا سفر درپیش ہے؟''

''میں ہندوستان کا بادشاہ، آگرے میں امانتاً دفن ہوا اور جب میرا فرزند اپنے دشمن شیر خاں سُور کے ہاتھوں دربدر تھا تب میری بیگم بی بی مبارکہ نے آگرہ آ کر شیر خان سے مطالبہ کیا کہ وہ میری باقیات بہ حفاظت بہ راستہ درۂ خیبر کابل لے جانے کے انتظامات کرے۔ شیر خان نے اپنے دشمن کے باپ کی باقیات کو تکریم و احترام کے ساتھ ہندوستان سے روانہ کیا اور میں نے بالا حصار کی بلندیوں پر کابل کی خاک میں آرام کیا۔ میرے گھر کو ''رحلت گاہِ بابر'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ میں وہیں رہتا ہوں اور وہیں جا رہا ہوں۔ وہ کابل جو شوروی افواج کی موجودگی میں محفوظ رہا تھا، نجیب کی عملداری میں جس کی سڑکیں اور بازار آباد تھے، زندہ تھے۔ وہی کابل ان کے ہاتھوں لوٹا گیا اور لٹ گیا جو ہاتھوں پر قرآن اٹھائے ہوئے اس میں داخل ہوئے تھے۔ میری ہڈیاں اس کی خاک میں آسودہ ہیں۔ یہ درست ہے کہ میری رحلت گاہ کے مرمریں ستون گولیوں سے چھلنی ہوئے اور لوحِ مزار چھل گئی لیکن وہ ہے تو میری آرام گاہ......

میں وہاں نہیں تو اور کہاں جاؤں گا۔" وہ ایک آہ بھرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔

☆☆☆

میلوں میل کا دائرہ رکھنے والے پہاڑوں کے پیالے میں ہوسِ اقتدار کے چقماق سے چنگاریاں گر رہی ہیں اور کابل جل رہا ہے۔ پشتون، ازبک اور تاجیک، ہزارہ دھگان اور بنجارے، عورتیں، بچے اور مرد اس آگ کا ایندھن۔

بامیان میں نصب بدھ کا بلند ترین بت لڑکھڑاتا ہوا اپنی جگہ سے اتر آیا ہے۔ ساٹھ گز اونچا یہ بت زمین پر جھکا ہوا اپنی آنکھیں ڈھونڈتا ہے۔ ساتویں اور آٹھویں صدی کے جوشیلے مجاہدین اپنے خنجروں سے اس کی آنکھیں نکال چکے، ان کے پیش قبض اس کا چہرہ کھرچ چکے۔

بامیان کا بدھ اپنے محبوب ترین چیلوں ساری پت اور موگلان کو آوازیں دے رہا ہے۔

"موگلان! یہ کیسا ہون ہے جس میں انسان جل رہے ہیں؟"

جواب نہیں آتا۔

"ساری پت! میں نے تو جانوروں کی بگیہ نہیں ہونے دی تھی۔ یہ کون ہیں جو اپنے بھائی بھتیجوں اور بیٹوں، اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی بگیہ کرتے ہیں۔"

اس بار بھی جواب نہیں آتا۔

ساری پت اور موگلان شاید پیدائش کے دائرے میں پھنسے ہوئے ہیں اور نروان نہیں پا سکے تب ہی کوئی جواب نہیں آتا اور بدھ کی آواز پر اس مسجد کے موذن کی آواز غالب آجاتی ہے جس کے مینار امتِ مسلمہ کی سربلندی کے نام پر ہونے والی جنگ میں ڈھے چکے اور جس کی دیواروں کو مسلم امہ کے اتحاد کی خاطر بلائنڈ راکٹوں سے چھلنی کیا گیا۔ لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں، کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی۔

بدھ کی ڈوبتی ہوئی اور موذن کی ابھرتی ہوئی آواز کو ایک اسٹنگر میزائل کا دھماکا ریزہ ریزہ کردیتا ہے۔ تمجید کرو تمجید کرو اس رب ذوالجلال کی جس نے توفیق دی ہمیں

اپنوں سے لڑنے کی۔ تسبیح کرو...... تسبیح۔ اس خداوند کی جس نے صلیب کے فرزندوں کے دلوں کو موم کیا اور ہمارے جہاد کے لیے ان کے اسلحہ اور ڈالروں کی فراوانی کی۔

میلوں میل کا دائرہ رکھنے والے پہاڑوں کے پیالے میں انسان جل رہے ہیں، بستیاں پگھل رہی ہیں۔ نغمہ منگل کی آواز نوحہ کر رہی ہے۔ کابل تو تباہ نہیں ہوا۔ کابل میں کہیں بھی رہوں، لوٹ کر تیری گلیوں میں آؤں گی۔

بو جان تم پشاور کے کسی قبرستان کی گمنام قبر میں ہی دفن رہو گی۔ تمہارے لیے کوئی بی بی مبارکہ نہیں آئے گی جو تمہاری ہڈیاں کابل لے جائے اور اسے وہاں کی زمین میں دفن کرے۔ خاموش ہو جاؤ نغمہ منگل۔ تمہیں بھی معلوم ہے اور ہمیں بھی کہ کابل تباہ ہو گیا ہے اور اس کے لاکھوں عشاق اب کبھی لوٹ کر اس کی گلیوں کو نہ جا سکیں گے۔

☆☆☆

شور سے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ گلی میں شاید بہت سے بچے آوازیں لگا رہے ہیں۔ ان کی آوازیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں سر کو جھٹکتی ہوں اور اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکتی ہوں۔ بچوں کا ایک ہجوم ہے جو گلی سے گزر رہا ہے۔ آوازیں لگاتا ہوا۔

''ہڈیاں لے لو اور نان دو...... نان دے دو اور ہڈیاں لے لو۔''

ان کے شانے بڑی بڑی بوریوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے ہیں۔

میں حیران و پریشان انہیں دیکھتی رہتی ہوں۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ کس سے کہہ رہے ہیں؟ نان کے عوض کیا بیچ رہے ہیں؟ اور پھر میری نگاہ اس پر پڑتی ہے۔ پہلی نظر میں وہ مجھ سے پہچانا نہیں جاتا۔ پگڑی کے پیچ کھلے ہوئے اور وہ گردن میں جھولتی ہوئی، چہرہ خاک سے اٹا ہوا...... کمر سے بندھی ہوئی تلوار کا نام و نشان نہیں، بغل میں دبی ہوئی کتاب بھی غائب...... اس کے کندھے پر بھی ایک بوری دھری ہے۔

میری آواز سن کر وہ رک جاتا ہے۔ کندھے سے بوری اتار کر زمین پر دھرتا ہے اور مجھے دیکھتا ہے۔

''میں تھک گیا...... ہندوستان کی بادشاہی اتنی مشکل نہ تھی۔'' اس کی آواز میں

صدیوں کی تھکن ہے۔ ایک ٹوٹے ہوئے شخص کی آواز۔

''یہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو اور یہ بچے کہاں سے ساتھ لے آئے ہو؟'' میں ان بچوں کی طرف اشارہ کرتی ہوں، وہ بھی اس کے رکتے ہی ٹھہر گئے ہیں۔ حلقۂ چشم میں دھنسی ہوئی آنکھیں، پھٹے ہوئے لباس سے جھانکتے ہوئے لاغر بدن، چہروں پہ بھوک کی اور بیماری کی تحریر۔

''یہ میرے بچے ہیں، کابل کے بچے۔ ان کے لیے میں نے بادشاہی ترک کی اور پاوندہ ہوا۔''

''معموں میں کیوں بات کرتے ہو۔''

''انہیں تم معمہ کہتی ہو؟ یہ تمہیں چیستاں نظر آتے ہیں؟'' غصے سے اس کی آواز کانپ رہی ہے۔''ذرا اپنی دائیں جانب تو نظر کرو۔''

میں گردن گھما کر دیکھتی ہوں۔ دور دور تک کھلی ہوئی قبریں۔ ان میں اترتے ہوئے بچے۔ ہڈیاں چنتے ہوئے، یہ بازو کی ہڈی ہے اور یہ پنڈلی کی۔''اور ہنسلی کی ہڈی کہاں گئی۔'' ایک دوسرے سے پوچھتا ہے۔ بچے قطار در قطار، سینکڑوں ہزاروں کھلی ہوئی قبریں۔

''یہ سب کیا ہے؟ کیا ہے یہ سب؟'' میری آواز لرز رہی ہے اور وجود کانپ رہا ہے۔ DANCE MACABRE ۔موت کا رقص۔ الفرڈ ہچکاک کی کسی فلم کا منظر۔

''یہ ...... یہ رقصِ مقابر...... لاطینی میں Danse Macabre ...... عربی میں فتح اول وکسر چہارم بہ معنی قبروں کا رقص اور عبرانی میں کسر اول وکسر چہارم پڑھا جائے تو قبر کھودنے والے کا رقص۔''

وہ قہقہہ لگاتا ہے۔ دیوانگی سے چھلکتا ہوا قہقہہ۔

''میرے شہر میں اناج عنقا، دوائیں ناپید، شہر یخ دان، گھر برف دان۔ باپ اور بھائی جہاد کا لقمہ، مائیں اور بہنیں گھروں میں جبراً و حکماً قید۔ یہ بچے کہاں جائیں؟

بھوک کیسے مٹائیں؟ پہلے جانوروں کی ہڈیاں بیچتے تھے۔ جانور کھا لیے گئے، ان کی ہڈیاں بک چکیں۔ نئی ہڈیاں کہاں سے آئیں؟ بھوک نے انہیں قبرستان کا راستہ دکھایا جہاں ہڈیوں کے انبار۔ ہڈیاں جو سرحد پار خرید لی جاتی ہیں، تیل، صابن اور مرغیوں کا کھاجا بنانے میں کام آتی ہیں۔ قبرستانوں سے ہڈیاں چراؤ اور تاجرِ استخواں کے پاس لے آؤ۔ پنجرِ یک مردِ افغاں، پنجاہ (50) سینٹ۔ 17 پاکستانی روپے۔ 7000 افغانی، 6 کلو آٹے کا تھیلا 3200 افغانی کا آتا ہے۔ سو ایک پنجر برابر ہوا 13 کلو آٹے کے۔ تمہارے یہاں سے طالبان، سرزمین افغانستان کو برآمد کیے جاتے ہیں اور وہاں سے پنجرِ افغانان برآمد۔ نازی نسل پرست تھے، یہودیوں کی چربی سے صابن بناتے تھے اپنی غلاظتیں صاف کرنے کے لیے۔ تم مسلم امہ کے سرپرست و سرخیل، افغانیوں کے ملی بھائی، ان کی ہڈیاں باریک پیستے ہو اپنی مرغیوں کو کھلانے کے لیے۔ تمہارا اسداللہ خاں غالب اپنے اشعار میں انسانی ہڈیاں ہما کو کھلاتا تھا...... اللہ اللہ...... تم نے ہما کی خوراک اپنی مرغیوں کو کھلائی۔'' اس کی آواز کانپ رہی ہے، غم و غصے سے، درد و اندوہ سے۔

''افغان جہاد کی کھیتی تمہارے کئی جرنیلوں نے کاٹی اور اب وہ جنیوا میں ان کے بینک اکاؤنٹوں میں محفوظ ہے جبکہ ان کابلی بچوں کے حصے میں یہ قبریں آئیں...... میں دنوں اور راتوں کو ان بچوں کے ساتھ مارا مارا پھرتا ہوں۔ قبرستانِ زیارتِ عاشقان و عارفان میں، گورستانِ شہدائے صالحین میں۔ ان کے ساتھ قبریں کریدتا ہوا۔ ان کا حوصلہ بڑھاتا ہوا۔ یہ بھی نازوں سے پالے گئے تھے، ان کی ماؤں نے بھی انہیں رات کو کبھی گھر کی دہلیز سے باہر قدم نہیں دھرنے دیا تھا۔ قبر سے کوئی بجّو نکل کر بھاگے تو یہ ڈر جاتے ہیں۔ سسکنے لگتے ہیں۔ اندھیروں میں ہڈیاں چمکیں تو خوف سے گھگیانے لگتے ہیں...... لیکن پیٹ...... لیکن بھوک...... (چناں قحط سالی شد اندر دمشق...... کہ یاراں فراموش کردند عشق)۔''

اپنی بوری سے وہ ایک کاسۂ سر نکالتا ہے اور میری طرف اچھال دیتا ہے ''پہچانو اسے۔ کس کا ہے یہ؟ عباس کرگر کہ عبداللہ شادان کا، باز محمد خان کہ میجر جنرل گل دوست

کا، سلطان علی اور وزگانی کہ آقائے عبدالحئی حبیبی کا۔''

میں لرزہ براندام۔ آنسو کاسئہ سر پر لگی ہوئی خاک کو دھو رہے ہیں۔ میں بھی کبھو کسو کا سر پُرغرور تھا۔ خشک تار و خشک چوب و خشک پوست، از کجامی آید ایں آوازِ دوست۔ از کجامی آید...... کابل میں دیکھے ہوئے کتنے ہی چہرے آنکھوں میں گڈمڈ ہو رہے ہیں۔ کون رہا اور کون رخصت ہوا؟

''خاموش ہو جاؤ...... برائے خدا خاموش ہو جاؤ۔'' میں اپنے دونوں کان اپنی ہتھیلیوں سے ڈھانپ لیتی ہوں۔

روحِ زمانہ کی نگاہیں مجھے حقارت سے دیکھتی ہیں، اس کے ہاتھ بوری اٹھا کر شانے پر دھرتے ہیں۔ اس کے قدم آگے کی طرف اٹھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی سارے بچے چل پڑتے ہیں۔

''ہڈیاں لے لو۔ ہڈیاں لے لو۔ ازبک اور پشتون ہڈیاں، تاجیک اور ترکمان ہڈیاں، ہزارہ اور بنجارہ ہڈیاں۔ یکے منجرِ افغان، پنجاہ سینٹ، پنجاہ سینٹ۔''

رقصِ مقابر...... قبر کھودنے والوں کا رقص......

❖❖❖❖❖

بہ ہر سو رقصِ بسمل بود

اسپریچوئیل اسمبلی کے سینکڑوں گز وسیع صحن کے حاشیوں کے ساتھ ستر برس پرانے پیڑ تھے، ان پر برسات کی اونگھتی ہوئی رات تھی اور کہیں دور سے آتی ہوئی گولیوں کی آواز تھی۔ صحن کے وسط میں بچھی ہوئی میزوں پر سفید چادریں تھیں اور ان کے کونے سیفٹی پنوں سے ٹانک دیے گئے تھے۔

ناہید نجف نے خانم اسفندیاری کے ساتھ آڈیٹوریم سے باہر قدم رکھا تو اس کی نگاہ ان تابوت نما میزوں سے ہوتی ہوئی جھریوں بھرے ایک چہرے پر پڑی۔ ویران آنکھیں، تل چاؤلے بال، شانے جھکے ہوئے، ہاتھوں کی انگلیاں سوجی ہوئی، ناخن خستہ اور گھسے ہوئے، شاید ان ناخنوں نے عمر بھر تقدیر کی الجھی ہوئی گتھی سلجھائی تھی۔ بھاری بدن پر اڑے ہوئے رنگوں والا پھولدار سایہ، پیروں میں اسفنج کی چپل جس کی ٹوٹی ہوئی پٹی کو موچی نے اس پھوہڑ پن سے سیا تھا کہ ٹانکے صاف نظر آرہے تھے۔

ایسی کئی ایرانی عورتیں ناہید کے محلے میں جانے کب سے آباد تھیں، یہ عورتیں ٹوکری ہاتھ میں لیے کبھی سبزی کے ٹھیلے اور کبھی گوشت کی دکان پر نظر آتیں۔ انقلاب ایران کے بعد ان کی تعداد میں اضافہ ہوگیا تھا لیکن یہ نیا چہرہ تھا۔ ناہید نے انہیں آس پاس کی گلیوں سے گزرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور نہ اب سے پہلے وہ اسے بہائی ہال میں نظر آئی تھیں۔

ان کے ہاتھ میں بسکٹ اور کیک کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی چینی کی سفید پلیٹیں تھیں

جنہیں وہ میز پر رکھ رہی تھیں۔ لحظے بھر کے لیے ان کی اور ناہید کی نگاہیں ملیں تو وہ انہیں دیکھتی رہ گئی۔ ان کی ویران آنکھوں میں وحشت کے صحرا تھے۔

ان میں ناہید کی دلچسپی دیکھ کر ہی خانم اسفندیاری نے آہستہ سے کہا تھا ''ہمارے سوختہ بختوں میں سے ہیں، اسی علاقے میں رہتی ہیں۔ ایک جج صاحب کی بیگم نے رکھ لیا ہے، ان کے گھر کے چھوٹے موٹے کام کرتی ہیں اور فارغ وقت میں کیک اور بسکٹ بناتی ہیں۔ جب سے یہ آئی ہیں ہم ان ہی کی بنائی ہوئی چیزیں خریدتے ہیں۔''

''پھر تو میں بھی انہیں اپنے گھر کا پتا بتادوں گی لیکن ان کا نام تو آپ نے بتایا نہیں؟''

''خانم خجستہ کہلاتی ہیں لیکن ہیں بلا کی ستارہ سوختہ۔ در ہفت آسماں یک ستارہ نہ داشتن'' خانم اسفندیاری کا پہیلیاں بجھوانے میں جواب نہ تھا۔

ناہید نے ان کے بارے میں کچھ اور پوچھنا چاہا لیکن اسی وقت خانم خجستہ دونوں ہاتھوں میں دو پلیٹیں سنبھالے ہوئے ان کے قریب آ پہنچیں۔

''پھر کبھی بتادوں گی۔'' خانم اسفندیاری نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ہنستے ہوئے اور باتیں کرتے ہوئے مہمانوں کا ایک ریلا آیا اور خانم خجستہ کا ذکر کسی حقیر تنکے کی طرح بہہ گیا۔ ناہید نجف نے ہاتھ بڑھا کر ان کا بنایا ہوا ایک بسکٹ اٹھایا۔ خستہ اور خوش ذائقہ، خانم خجستہ کو اپنی بیکری کھول لینی چاہیے۔ ناہید نے دوسرا بسکٹ اٹھاتے ہوئے سوچا۔

☆☆☆

''میں اس وقت کچھ نہیں کھا سکتی۔ کچھ بھی نہیں۔'' ناہید نے کھانے کی میز کو دیکھا جو نعمتوں سے بھری ہوئی تھی۔

''لیکن کیوں؟ نہ کھانے کی آخر کوئی وجہ تو ہو؟'' نجیب نجف نے روسٹ کیے ہوئے مرغ کی قاب اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''میاں ان کا تو یہی وتیرہ ہوگیا ہے۔ ہر دوسرے چوتھے منہ باندھے بیٹھ جاتی ہیں۔'' اماں کے لہجے میں شکوے کا رنگ گہرا تھا۔

''آج دوپہر سے میں جو کچھ پڑھتی رہی ہوں، اس کے بعد کچھ نہیں کھایا جاسکتا۔''
ناہید کی نگاہوں میں وہ کتابیں، رپورٹیں اور کتابچے گھوم گئے جو اس کی میز پر آڑے ترچھے رکھے ہوئے تھے اور جنہیں پڑھنے کے لیے جگر چاہیے تھا۔

''اچھا تو آج پھر آپ نے جنوبی ایشیا کی کسی مذہبی اقلیت پر ہونے والے مظالم کی رپورٹ پڑھ لی ہے؟ کسی حکیم نے یہ نسخے میں لکھا تھا کہ پی ایچ ڈی کے خمیرے سے شوق فرمائیے لیکن آپ کو تو سدا سے بقراطی کا شوق رہا۔''

ناہید نے تیوری پر بل ڈال کر نجیب کو دیکھا جو بہت صفائی سے بھنے ہوئے مرغ پر چھری چلا رہا تھا۔ ''فضول باتیں مت کرو۔ مجھے ہرگز شوق نہیں ہے بقراطی کا۔ اور آپ کس کے مشورے سے گولیوں کی باڑھ میں اور آگ کے شعلوں میں کود پڑتے ہیں؟'' ناہید نے بھائی کو گھورا۔

''اجی مجھے تو گولی ماریں یہ بتائیں کہ آپ کس کے مشورے سے چلی ہیں ''جنوبی ایشیا میں مذہبی اقلیتیں'' ایسے دھواں دھار اور خونخوار موضوع پر تھیس لکھنے؟ اور اگر لکھنا ہی تھا تو کس نے کہا تھا کہ یہود و نصاریٰ کے آباد کیے ہوئے شہر چھوڑ کر یہاں دوڑی چلی آئیں؟ دیکھیے ناہید بی بی یہ سمجھ لیجیے کہ جو کچھ آپ لکھ رہی ہیں اور آئندہ لکھنے والی ہیں، وہ سب کچھ جب چھپے گا تو آپ یہاں قدم نہیں رکھ سکیں گی۔ اجی ہم سلمان رشدی سے برا حشر کریں گے آپ کا۔'' وہ مزے سے روسٹ اڑا رہا تھا اور زہریلے لہجے میں بات کر رہا تھا۔

اماں نے ٹھنڈا سانس لے کر اپنی دونوں اولادوں کو دیکھا جنہیں کتابوں نے کہیں کا نہیں رکھا تھا۔ یہ اچھا تھا کہ ناہید باہر چلی گئی تھی لیکن وہ جب سے واپس آئی تھی، ان کی جان سولی پر تھی۔ مائیں بیٹیوں کے قریب ہونے کی دعائیں کرتی ہیں، وہ مصلے پر سر رکھ کر اس کی خیریت سے واپسی کی دعائیں کر رہی تھیں۔ ایک ہی بیٹا تھا اور انہوں نے اس کے باہر چلے جانے کی بھی کیسی کیسی دعائیں نہیں کی تھیں، منتیں نہیں مانگی تھیں۔

''اجی چراغاں کریں گے، آپ کے گھر کی دیواروں پر اردو اور ہندی والا چراغاں

نہیں، فارسی والا چراغاں، ایرانی بادشاہوں کی محبوب سزا۔ سر میں سوراخ کیے جائیں گے، پھر ان میں موم بتیاں جلائی جائیں گی۔''

''حد کرتے ہو نجیب کیا واہی تباہی بکتے رہتے ہو۔ تمہارے منہ کے آگے کھائی خندق ہی نہیں رہی ہے۔'' اماں ساری جان سے لرز گئیں۔

''اس میں میری کیا خطا ہے اماں؟'' نجیب نے معصومانہ انداز میں پلکیں جھپکائیں۔ ''میں تو بس یہ بتا رہا ہوں کہ کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ ارے ہاں وہ رقصِ بسمل والی سزا تو رہ گئی۔ وہی جس میں سر اڑا کر کٹی ہوئی گردن پر دہکتا ہوا توا رکھ دیا جاتا تھا، خون باہر نہ نکلنے پائے اور لاش رقص کرتی رہے۔ بہ ہر سو رقصِ بسمل بود شب جائے کہ من بودم۔''

''میرے خیال میں یہاں رہتے رہتے تم Sadist ہو گئے ہو۔'' ناہید نے بھنا کر کہا۔

''بی بی ناہید نجف میں آپ کے یہ گوش گزار کر رہا ہوں کہ یہ سقراط کا زمانہ نہیں ہے جب زہر پلایا جاتا تھا، اب ٹی ٹی یا ماؤزر سے اڑایا جاتا ہے، یوزی گن سے جلایا جاتا ہے۔ اور یہ جو آپ بہائیوں، ذکریوں، احمدیوں، عیسائیوں اور سکھوں کے غم میں نڈھال ہیں تو کبھی اپنے شہر کے مقتولین کا مرثیہ بھی لکھیے، دیکھیے تو سہی ''کمند موت نے کیا بند بند جکڑے ہیں...... زمین شہر نے اک اک کے پاؤں پکڑے ہیں۔''

''چھوڑو بھی نجیب، کیوں منہ کھلواتے ہو۔ یہ شہر اگر کمند موت کے چنگل میں آیا تو کیا اس میں خود شہر والوں کی خطا نہ تھی؟'' ناہید نے بھائی کو گہری نگاہوں سے دیکھا۔

''میں یہ نہیں کہہ رہا کہ شہر والے بے خطا تھے لیکن ان بدبختوں سے یہ کہنے والے کہاں تھے کہ ''آنکھیں تو کھول، شہر کو سیلاب لے گیا؟'' کیا سب ہی مر گئے؟''

''ارے نجیب، کچھ تو سوچ سمجھ کے بولا کرو۔ کیوں منہ سے ایسی بدفال نکالتے ہو؟'' اماں نے لرز کر کہا۔

''لیجیے اماں میں تو منشی پریم چند کی پیروی کرتے ہوئے حقیقت بیانی سے کام لے

رہا ہوں۔ آپ اسے بدفال کہتی ہیں؟ میں فوٹو گرافر ہوں اماں، پریس فوٹو گرافر۔ مجھے چاک قفس سے باغ کی دیوار دیکھنے کی حسرت تھی، میں اپنے View Finder سے اپنے شہر کا آشوب دیکھتا ہوں۔ یہ لاشوں اور عقوبت گاہوں کا ذکر کتابوں میں پڑھتی ہیں، امریکی یونیورسٹیوں کے سیمیناروں میں سنتی ہیں۔ میں انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ اپنی ان دو آنکھوں سے۔'' نجیب نے اپنا کانٹا لہرایا جس میں بھنے ہوئے مرغ کا ایک قتلہ تھا ''یہ سب کچھ پڑھتی ہیں اس لیے ان سے کھایا نہیں جاتا، میں سب کچھ دیکھتا ہوں، اسی لیے پیٹ بھر کر کھاتا ہوں، زور زور سے ہنستا ہوں۔ کچھ غلط تو نہیں کہا گیا ہے کہ ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔'' وہ جنگ زدہ اور آسیب زدہ شہروں کے رہنے والوں کی طرح ہنسا۔

اماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ''مولا دونوں کو اپنی امان میں رکھیو۔''

ناہید نجف نے اپنے اکلوتے بھائی کو دیکھا، کئی برس پہلے وہ کیسا چونچا، کتنا خوش باش ہوتا تھا اور اب اس کی رگوں میں زہر بھر گیا ہے۔ اسی لمحے سڑک پر سے ایک ایمبولینس بین کرتی ہوئی گزر گئی۔

☆☆☆

دن کے گیارہ بج رہے تھے، چھٹی کے دن کی الکساہٹ گھر کے در و دیوار پر پھیلی ہوئی تھی۔ ناہید جب سے گھر آئی تھی اسے جمعے اور ہفتے کے دن بہت اچھے لگتے تھے۔ باقی پانچ دنوں میں تو صبح سے دوپہر تک ایک ہنگامہ مچا رہتا۔ سینکڑوں بچوں کی جوش سے بھری ہوئی آوازیں، ان کی ہنسی، ان کے بھاگتے ہوئے پیروں کا شور، نرسری رائمز دہراتا ہوا ان کا لحن۔

Hot cross bun, Hot cross bun.
One a penny, two a penny,
Hot cross bun.

اس کی محبوب نرسری رائم جسے سن کر اس کا جی چاہتا کہ وہ بھی ان کی آواز میں آواز

ملائے۔

بابا کی ناوقت موت کے بعد وہ لوگ کوٹھی کے اس حصے میں منتقل ہو گئے تھے جوان کی زندگی میں بس اس وقت آباد ہوتا تھا جب کسی دوسرے شہر سے رشتہ دار یا احباب آئیں، یا کسی عزیز کو چند مہینوں کے لیے سر چھپانے کی ضرورت ہو۔ اماں کی بیوگی انہیں آسمان سے زمین پر لے آئی تھی لیکن یہ صدمہ انہوں نے صبر اور سکون سے سہا تھا۔ پنشن کے چند سو روپوں میں دو بچوں کے ساتھ سفید پوشی کی زندگی گزارنا ممکن نہ تھا۔ سو وہ اماں جنہوں نے بیگماتی ٹھاٹھ سے دن بتائے تھے ترنت مسز مینووالا کے یہاں مونٹیسوری ٹریننگ کے لیے پہنچ گئی تھیں اور پھر سال بھر کے اندر کوٹھی کے بڑے حصے میں مونٹیسوری کھل گئی تھی۔ پانچ بچوں سے شروع ہونے والی مونٹیسوری میں اب تین سو بچے تھے اور اس میں داخلے کے لیے اماں کے پاس بڑی بڑی سفارشیں آتی تھیں۔ اسی سے ہونے والی آمدنی سے زندگی ٹھاٹھ سے گزر رہی تھی، ناہید امریکہ جا چکی تھی اور نجیب جاپان سے فوٹو گرافی کی اعلیٰ تربیت لے آیا تھا۔

ناہید گبریئل گارسیا مارکیز کے ناول One Hundred Years of Solitude کو شاید چوتھی مرتبہ پڑھ رہی تھی، سات نسلوں کا قصہ۔ اس نے صفحہ الٹ کر شیشے کے پیالے سے بھنے ہوئے بادام کا ایک دانہ منہ میں رکھا اور گردن گھما کر اماں کو دیکھا جو آرام کرسی پر نیم دراز بی بی سی ٹیلی وژن کی خبریں دیکھنے میں منہمک تھیں۔ اسے خیال آیا کہ نجیب ابھی تک سو کر نہیں اٹھا ہے۔ وہ اب راتوں کو عموماً دیر سے آتا تھا اور سانسوں میں شراب کی مہک کا بسیرا ہوتا تھا۔

اسی وقت لاؤنج کا جالی والا دروازہ کھول کر گھر کے اکلوتے ملازم بخشو بھیا نے اعلان کیا ''او آئی ہیں۔''

بخشو بھیا بہت دنوں سے اونچا سنتے تھے، کم دیکھتے تھے اور بقول نجیب زمانہ قبل مسیح سے تعلق رکھتے تھے۔ اماں اور بابا کے ساتھ وہ ہندوستان سے کراچی آئے تھے اور پھر کہیں نہیں گئے تھے۔ ناہید اور نجیب کو بچپن میں یہ بتایا گیا تھا کہ انہیں ''بھیا'' کہنا ہے

چنانچہ وہ دونوں اور ان ہی پر کیا منحصر تھا، ہر آیا گیا انہیں ''بھیا'' کہتا تھا۔

خواتین کی آمد کے موقع پر ان کی زبان سے بے ساختہ یہی نکلتا کہ ''او آئی ہیں۔'' یہ ملکہ برطانیہ کے ورود مسعود کا اعلان بھی ہوسکتا تھا اور محلے کی مہترانی کی آمد کی اطلاع بھی۔ اماں کے بے حد اصرار کے باوجود انہوں نے شادی نہیں کی تھی اور خواتین کا نام نہایت احترام سے لیتے تھے۔

''ارے بھئی بخشو کون آیا ہے؟'' اماں نے ذرا ناراض لہجے میں پوچھا۔

''ایک ٹھو میم ہیں۔'' بخشو بھیا سایہ پہننے والی ہر خاتون کو میم کہتے تھے۔

''جاؤ بھئی ناہید، تمہاری بہائی یا عیسائی دوستوں میں سے کوئی آئی ہوں گی۔'' اماں نے کہا اور پھر ٹیلی وژن کی طرف متوجہ ہوگئیں جس پر سربوں کی توپیں آگ اگل رہی تھیں۔ دنیا بھر سے صرف آگ کی اور خون کی خبریں آتی تھیں۔

''خانم اسفندیاری ہوں گی یا پھر خانم شیرازی'' ناہید اندازہ لگاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ڈرائنگ روم کھول دیں بخشو بھیا۔'' اس نے چپل پہنتے ہوئے کہا۔

بخشو بھیا ہونقوں کی طرح کھڑے اس کا منہ دیکھتے رہے۔

''ارے بھیا ڈرائنگ روم کھول کر انہیں بٹھائیں۔'' ناہید نے زور سے کہا۔

بخشو بھیا نے نفی میں گردن ہلائی ''او کچھ لائی ہیں۔''

''افوہ بخشو بھیا، آپ نہ کچھ سنتے ہیں، نہ سمجھتے ہیں۔'' ناہید جھنجھلائی۔

''بی بی خود ہی جا کر دیکھ لو۔ بہرے بھنڈ پر کیوں ناراض ہوتی ہو؟ تم کہو گی چین کی، وہ سنیں گے جاپان کی۔'' اماں کو خبروں کے وقت ذرا سی بھی مداخلت ناگوار گزرتی تھی۔

وہ اپنا لباس درست کرتی ہوئی باہر نکلی تو لمحے بھر کے لیے انہیں پہچان نہ پائی۔ پلاسٹک کی بڑی بڑی دو ٹوکریاں اٹھائے ہوئے خانم خجستہ برآمدے میں کھڑی تھیں۔ لباس پسینے سے بھیگا ہوا، چہرے پر پسینے کی بوندیں۔ جانے کتنی دور سے دھوپ میں چل کر آئی تھیں۔ آنکھوں میں وحشت کے وہی صحرا تھے۔ ناہید کو دیکھتے ہی ان میں شناسائی

کی باد صبا چلی۔

''ارے خانم آپ...... بسیار خوب کردید کہ قدم رنجہ فرمودید۔'' ناہید نے مسکرا کر کہا۔ اس نے دو دن پہلے انہیں اپنا پتا دیا تھا سو وہ آ پہنچی تھیں۔

بہائیوں پر کام شروع کرنے سے پہلے ہی اسے فارسی سیکھنی پڑی تھی۔ بچپن میں مولوی صاحب سے پڑھی ہوئی ''گلستان'' و ''بوستان'' سے جدید اور روزمرہ فارسی کتنی مختلف تھی۔

اس نے انہیں لاؤنج میں چلنے کے لیے کہا تو وہ چند لمحوں کے لیے جھجھکیں لیکن پھر ناہید کے دوبارہ کہنے پر دونوں ٹوکریاں اٹھائے لاؤنج میں آ گئیں۔ اماں نے ایک اجنبی خاتون کو اندر آتے دیکھا تو سنبھل کر بیٹھ گئیں اور ریموٹ کا بٹن دبا دیا۔ ٹیلی وژن اسکرین تاریک ہو گیا۔ خبریں یوں بھی ختم ہو چکی تھیں۔

اماں ان کا نام سن کر مسکرائیں ''ہاں تم ان کا ذکر کر تو رہی تھیں، آیئے آرام سے بیٹھ جایئے۔''

خانم خجستہ دونوں ٹوکریاں قریب ہی زمین پر رکھ کر خاموشی سے ایک کرسی پر ٹک گئیں۔ پھر ایک ٹوکری سے انہوں نے اجلے کپڑے میں لپٹی ہوئی شیشے کی ایک خوبصورت تشتری نکالی اور مختلف ڈبوں میں سے قسم قسم کے بسکٹ چاندی کی چھوٹی سی چمٹی سے نکال کر تشتری میں رکھے اور اہتمام سے انہیں اماں کی خدمت میں پیش کر دیا۔

ناہید ان کے ہاتھوں کی جنبش کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ ان ہاتھوں کی بدحالی کے باوجود وہ محنتی، مہذب اور مستعد ہاتھوں کی جوڑی تھی۔ خانم ٹوٹی پھوٹی اردو اور فصیح فارسی میں اپنے بنائے ہوئے بسکٹوں اور سنبوسوں کو نوش جاں کرنے پر اصرار کرتی رہیں۔ اماں نے ایک ایک چیز کی بہت تعریف کی اور ''خیلے خوب است'' ''نان آبی خیلے خوش ذائقہ است'' کہتی رہیں۔ خانم خجستہ ''متشکرم...... متشکرم'' کی گردان کرتی رہیں لیکن چہرہ تاثرات سے خالی رہا۔ ناہید کو خانم اسفندیاری کا جملہ یاد آیا'' ہمارے سوختہ بختوں میں سے ہیں۔''

اتنی دیر میں بخشو بھیا اپنی تربیت کے مطابق طشت میں سکنجبین سے لبریز جگ اور تین گلاس لے آئے۔ ناہید نے انہیں سکنجبین پیش کی۔ وہ جب اٹھیں تو ان کی ٹوکریاں خاصی ہلکی ہو چکی تھیں۔ مونٹیسوری میں ٹیچروں کے لیے بیکری سے روزانہ اچھا خاصا سامان آتا تھا، تو پھر تازہ اور خوش ذائقہ چیزیں خانم خجستہ سے کیوں نہ خریدی جائیں۔ وہ ترک وطن پر مجبور کی گئی تھیں اور ان کا چہرہ اس بات پر گواہی تھا کہ گردش دوراں کی چکی نے انہیں بہت باریک پیسا ہے۔

ناہید نے طے کیا کہ اگلی کسی ملاقات میں وہ انہیں کریدے گی۔ وہ ایسے ہی سوختہ بختوں کی تلاش میں تھی کہ وہی اس کی تحقیق کا موضوع تھے۔

☆☆☆

خانم خجستہ کئی ملاقاتوں کے بعد بھی نہیں کھلیں، یہ خانم اسفندیاری تھیں جنہوں نے ان کی تقدیر کا احوال ناہید کو سنایا تھا۔

خانم خجستہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی ماں تھیں۔ شوہر ریلوے میں گارڈ تھے، کسی حادثے میں ہلاک ہوئے تو خانم خجستہ نے اپنے ہنر کو اپنا روزگار بنالیا۔ بیٹے بڑے ہوئے، ان میں سے ایک یونیورسٹی تک پہنچا تو نہ جانے کس طرح تودہ پارٹی کے جال میں پھنس گیا اور خانم خجستہ کے منہ پر کالک مل گئی۔

''میں آپ کی بات نہیں سمجھی؟'' ناہید نے حیران ہو کر انہیں دیکھا تھا۔

''دین بہائی میں سیاست شجر ممنوع ہے، کوئی اگر سیاست میں ملوث ہو جائے تو اسے دین بہائی سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ ایرج ہم میں سے نہیں رہا تھا۔ خانم خجستہ اپنی برادری میں نکو بن گئیں۔ ماں تھیں، چپکے چپکے اسے روپے پیسے بھیجتیں اور کبھی وہ ساواک کے خوف سے گھر میں ہفتوں چھپا رہتا۔ پھر ایک روز پکڑا گیا اور ساواک کے کسی عقوبت خانے میں ہلاک ہوا۔ یہ کم نصیب تو اس کا سوگ بھی نہ منا سکیں۔''

''اور دوسرا بیٹا؟''

''فریدوں'' انہوں نے آہ بھری۔ ''وہ بہائی ہونے کے جرم میں ہلاک کیا گیا۔

وہی تھا جس نے شہید ہو کر ماں کی لاج رکھ لی۔ ورنہ اس ایرج کمیونسٹ نے تو خانم کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا تھا۔'' خانم اسفندیاری روانی سے بولتی گئیں۔

''اور بیٹی...... آپ نے ابھی کہا تھا کہ خانم کی ایک بیٹی بھی تھی۔''

''تھی نہیں، ہے...... سیدہ طاہرہ کے نام پر اس کا نام بھی طاہرہ رکھا گیا۔ وہ ابھی تک ایران میں ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ شوہر اس کا جیل میں ہے، اس لیے وہ ایران چھوڑنے پر تیار نہیں۔ خانم خجستہ صبح سے رات تک تنور کے سامنے کھڑی رہتی ہیں تو اسی لیے۔ جو رقم کماتی ہیں وہ کسی نہ کسی طور تبریز بھجواتی رہتی ہیں، طاہرہ اور بچوں کے لیے۔''

اس رات خانم خجستہ اور ان کے بیٹے ناہید نجف کے خواب میں آئے۔ آٹے سے بھرے ہوئے ایک بہت بڑے طباق کے گرد ایرج اور فریدوں کھڑے تھے، ان کے سینوں سے خون کی دھاریں نکل کر آٹے کو سرخ کر رہی تھیں۔ خانم خجستہ نے اپنی ہتھیلیوں پر اپنے آنسوؤں کا نمک جمع کیا، اس نمک کو خون آلود آٹے پر چھڑکا اور اسے گوندھنے لگیں پھر وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں اور لرزتی ہوئی انگلیوں سے غم واندوہ کے بسکٹ بناتی رہیں، رنج والم کے سنبوسے تلتی رہیں۔ اس کی آنکھ کھلی تو ابھی اندھیرا تھا۔ اس نے کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کی لیکن نیند نہ آئی۔ وہ اماں کے بارے میں، خانم خجستہ کے بارے میں سوچتی رہی۔ دنیا بھر کی مائیں، جنگ کے جہنم کا ایندھن پیدا کرتی ہوئی۔ مفتوح بیٹیوں اور مقتول بیٹوں کا سوگ مناتی ہوئی۔ اماں بھی تو نجیب کے لیے اور اس کے لیے آدھی آدھی رات تک مصلے پر بیٹھی رہتی تھیں۔ دونوں کو جانے کن کن درگاہوں پر گروی کر آئی تھیں لیکن دل کو قرار نہیں آتا تھا، ہر اجنبی چاپ پر چونک جاتی تھیں۔ ان چند ہفتوں میں ہی وہ کئی مرتبہ اس سے پوچھ چکی تھیں کہ وہ کب واپس جائے گی اور ہر بار انہوں نے یہی کہا تھا کہ وہ نجیب کو بھی ساتھ لے جائے۔ لیکن ناہید جانتی تھی کہ ابھی اس کا بہت سا کام باقی ہے اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ نجیب کہیں نہیں جائے گا۔

☆☆☆

برسات کی اس رات روشنی پر پتنگوں کا اور صفحوں پر مقتولین کا رقص بسمل ہوتا رہا۔ چھپے ہوئے لفظ ناہید کی آنکھوں میں کانٹے بوتے رہے۔ نام اور مقام، تاریخ اور تفصیل۔ کون کہاں اور کس طور مارا گیا، جلایا گیا، دار پر چڑھایا گیا، سنگسار ہوا، گولیوں کی باڑھ پر رکھا گیا، ہجوم نے لاٹھیاں مار کر ہلاک کیا، پاسدارانِ انقلاب کے غیظ و غضب کا نشانہ بنا۔ زندانی ہلاک کردیے جانے والوں سے بدتر، زندہ درگور...... تن خستہ، دل شکستہ، نظر بستہ، لب خموش۔

1979ء کے بعد آنے والے ماہ و سال کے کچھ اور معتوبین، کچھ اور مصلوبین۔ خسرو افغانی، حسین مطلق، روحی روشنی، شکر النسا معصومی ...... عورتوں کو اور مردوں کو، اکثریت سے مختلف عقائد اور نظریات رکھنے والوں کو پناہ کہیں نہیں تھی۔ نہ تہران و تبریز میں، نہ شیراز و شہ میرزاد اور نہ ہمدان و اصفہان میں۔ رحم بہ بے کساں اے دادرس۔ سلامتی ان کے گھروں سے اٹھائی جاچکی تھی اور عذاب ان کے سروں پر اتارے جاچکے تھے۔

ناہید نجف کی نگاہ ایک اور نام پر پڑی، ناہید نادری ...... صفحے پر ایک چہرے کے خدوخال ابھرنے لگے، پری زادے، پری روئے، پری چہرے، پری پیکر۔ اس پری پیکر نے پلکیں جھپکائیں، اپنی ہم نام کو دیکھا۔ میں ناہید نادری جلائی گئی اور تم ناہید نجف زندہ ہو، سانس لے رہی ہو ...... تو کیا فرق بس اتنا ہے کہ کون کس زمانے میں کون کس زمین پر پیدا ہوا؟ میں اگر تمہارے گھر، تمہارے شہر میں پیدا ہوتی اور تم نے گارا ایران کے خرابے میں آنکھ کھولی ہوتی تو ناہید نجف تم آگ کو نذر کی جاتیں اور میں تمہارا نام پڑھنے کے لیے زندہ رہتی۔ میں خشک لکڑی کی طرح جلائی گئی، اس لیے کہ میری نمازیں تمہاری نمازوں سے مختلف تھیں، اس لیے کہ تمہارا قبلہ میرا نہیں تھا۔ تو کیا زندہ اور سانس لیتے ہوئے انسان صرف اس لیے آگ کے سپرد کیے جائیں؟ پھر وہ لب لعلیں بین کرنے لگے:

یا خدا ہم ذبح کیے گئے

ایندھن کی طرح جلائے گئے
اور مویشیوں کی طرح ہنکائے گئے
ہماری نمازیں ہماری خطا
اور ہماری الواح ہمارا گناہ ٹھہریں

پری چہرہ، پری پیکر ناہید نادری کا تن بدن جل رہا تھا اور آواز دے رہا تھا...... زدلم شرارہ بارد کہ نسب زنار دارد...... کہ نسب زنار دارد...... ناہید نجف کی آنکھوں سے آنسو گرے اور اس آگ کو بجھا گئے...... شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے، دھویں کے پردے سے ناہید نادری کا نام جھلک رہا تھا۔

انگلیوں نے کچھ اور ورق الٹے، مسمار قبرستان، کھدی ہوئی قبریں، جلی ہوئی عبادت گاہیں، قلمی اور عکسی تصویریں۔

1896ء...... تہران...... تبریز...... کرمان...... شکنجوں میں جکڑے ہوئے آدم زاد...... ان کی کلائیوں اور پنڈلیوں میں میخیں اتارتے ہوئے آدم زاد...... وزنی ہتھوڑے سے ہڈیاں توڑتے ہوئے، زندہ انسانوں کے ناخن اکھیڑتے ہوئے اور قہقہے لگاتے ہوئے آدم زاد۔

1996ء...... پرسوں کا کھارا ماچھی کل کا کراچی جواب کراہ چی ہو گیا تھا۔ ایک ہی ماں اور ایک ہی باپ کے بیٹے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا...... سربریدہ لاشیں، بوریوں میں بھرے ہوئے بدن، انسانوں کے قتلے، آنکھوں سے محروم کھوپڑیاں، سوراخ دار پنڈلیاں۔

ناہید کی نگاہوں میں وہ تصویریں گھوم گئیں جنہیں شہر کا کوئی اخبار چھاپنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا اور ملک کا کوئی اخبار انہیں اس لیے شائع نہیں کرتا تھا کہ مصلحت اسی میں تھی...... سرکار کی...... اخبار کی...... نجیب کی کھینچی ہوئی وہ تصویریں جن میں بہت سے چہرے پہچانے جاتے تھے۔

☆☆☆

وہ جب امریکہ سے چلی تھی تو بہت کچھ سنتی ہوئی آئی تھی ...... ایک حلقے کا کہنا تھا کہ شہر نہیں ہے آگ کا دریا ہے، دوسرا کہتا تھا کہ سب دشمنوں کی ہوائی ہے ...... اخبار والوں کی عادت ہے، رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں ...... پھر جب وہ ایئرپورٹ پر اتری تو فضا میں خوف کی اور خون کی بو تھی، گھروں کے چہرے زرد تھے، انسانوں پر آسیب کا سایہ تھا اور آنکھیں بے اعتباری کے بے تھاہ کنویں ہوگئی تھیں۔

نجیب ان چند برسوں میں کس قدر بدل گیا تھا، لہجے کی حلاوت، آنکھوں کی شرارت، شہر ناپرساں کی نذر ہوئی تھی۔ نجیب نے اسے ایک ایک تصویر دکھائی تھی، ہر تصویر کا ماجرا سنایا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں، اس نے ایک گھونٹ لیا اور گلاس کو یوں رکھ دیا کہ اگر اماں اچانک آجائیں تو اس پر ان کی نظر نہ پڑے۔

''میں ان کی نمائش لندن میں کروں گا ...... اس خون خاک نشیناں کو رزق خاک نہیں ہونے دوں گا ...... لوگ دیکھیں تو سہی کہ میرا شہر کس قدر بیمار ہے، اسے کیسا خونیں آزار ہوگیا ہے۔''

وہ گنگ بیٹھی رہی۔ شہر اپنے اندر اور اپنے باہر جدل و جدال اور قتل و قتال میں مگن تھا۔ اس کے وجود کے باہر اشقیا کی فوجیں تھیں، بستیوں کا محاصرہ تھا، نوجوانوں پر نرغہ تھا، حسینوں کا ہانکا تھا اور اپنے بطون کے اندر شہر اس محاصرے، اس ہانکے اور اس نرغے سے بے نیاز اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔

اسے ہابیل اور قابیل کا قصہ یاد آیا، اس پرانے قصے میں ایک قاتل تھا اور دوسرا مقتول لیکن یہاں بلاؤں کی نئی اور ناقابلِ یقین طلسم ہوشربا لکھی جا رہی تھی۔ خود ہی قاتل، خود ہی مقتول، آپ ظالم، آپ مظلوم۔ قابیل نے ہابیل کو اس کی عروس کی ہوس میں قتل کیا اور شہر میں عروس اقتدار کے لیے قابیل قتل کر رہا تھا، قابیل قتل ہو رہا تھا، ہابیل قتل ہو رہا تھا، ہابیل قتل کر رہا تھا۔

اس نے لرز کر بھائی کو دیکھا ''ان تصویریوں کو جلا دو نجیب، یہ انسان کا انسان پر سے اعتبار اٹھاتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر خون آشام قبیلوں کا خیال آتا ہے۔''

''یہ خوں آشام ہی تو ہیں۔ یہ زندہ انسانوں کی ہڈیاں توڑتے ہوئے ہنستے ہیں۔ یہ گولیاں مارتے ہوئے قہقہے لگاتے ہیں۔'' نجیب کی آواز کا رنگ، غم اور زوال کا رنگ۔

''کیوں ایسی باتیں کرتے ہو؟ اپنی جان کیوں خطرے میں ڈالتے ہو؟ امی تمہاری وجہ سے ہر وقت دہلتی رہتی ہیں۔''

''میرے خیال میں تو وہ تمہارے لیے دہلتی ہیں۔ تم سے کس نے کہا تھا کہ بہائیوں اور احمدیوں اور عیسائیوں کا احوال جاننے کے لیے یہاں چلی آؤ۔ ایک بات سمجھ لو کہ اگر شہر کے سپریمو مجھے غدار کہہ کر ماریں گے تو تم ...... تمہارا شمار کافروں اور مرتدوں میں ہوگا ...... اور کافروں اور مردوں کو قتل کرنے والے قبیلے دوسرے ہیں ...... کافروں کو گولی نہیں ماری جاتی، انہیں کترا جاتا ہے ...... مرتد اگر کلمے کا ورد کر رہے ہوں تو ان کی زبان کاٹ لی جاتی ہے ...... ناپاک زبان پر ہمارا کلمہ آیا تو کیوں کر......؟''

اس کا لہجہ ہذیانی تھا، اس نے ایک بار پھر گلاس سے ایک گہرا گھونٹ لیا، ناہید نے اس کے ہاتھ سے گلاس لینا چاہا تو اس نے ناہید کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''تمہیں معلوم ہے ایران میں کیا ہوا تھا ...... تیرہ اور چودہ اور پندرہ برس کی ان کنواری لڑکیوں کے ساتھ جنہیں گولی سے اڑایا گیا؟''

''ہاں نجیب مجھے معلوم ہے ...... اور پلیز اب تم اٹھو اور کچھ دیر سو جاؤ ......''

''وہ کلمہ گو تھیں ...... ان کی خطا کیا تھی؟ ان لوگوں کو اختلاف کرنے والوں سے خوف آتا ہے۔ عورتوں اور مردوں کی کھوپڑیوں میں بکریوں کے اور بکروں کے دماغ ہوں تو یہ خوش رہتے ہیں۔''

نجیب گھٹنوں میں سر دیے رو رہا تھا، بڑبڑا رہا تھا۔ رات گھٹ رہی تھی اور قالین پر تصویریں تھیں جنہیں کسی غالیچے پر کاڑھا نہیں جا سکتا تھا۔

☆☆☆

اپنے تھیس کے سلسلے میں ناہید دو ہفتے ہندوستان میں گزار کر آئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ خانم خجستہ کوٹھی کے آؤٹ ہاؤس میں اٹھ آئی ہیں۔ اماں نے بتایا کہ خانم

کا کام اب بہت بڑھ گیا تھا اور وہ جج صاحب کے گھر کو اتنا وقت نہیں دے پاتی تھیں جس پر جج صاحب کی بیگم کو اعتراض تھا۔ یوں بھی اماں کی مونٹیسوری میں خانم خجستہ کے بنائے ہوئے سامان کی بہت مانگ تھی۔

''ٹوکریاں اٹھائے ہانپتی کانپتی کئی چکر لگاتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ آؤٹ ہاؤس میں وہ آ جائیں تو اچھا ہے۔ بخشو نے جھٹ پٹ گیس کی لائن بھی لگوادی ہے۔ وہ بھی آرام سے ہیں اور گھر میں بھی آبادی ہوگئی ہے۔ تم چلی جاؤ گی تو سناٹا کس طرح ٹوٹ کر برسے گا۔ شاید نجیب بھی چلا جائے۔''

ناہید کا دل کٹ گیا۔ اماں کا بس نہیں چلتا تھا کہ کس طرح اسے واپس بھیج دیں اور اس کے ساتھ ہی نجیب کو بھی۔ وہ منہ سے کچھ نہیں کہتی تھیں لیکن پتہ کھڑکا بندہ بھڑکا والی ان کی حالت تھی۔ انہیں جادو آتا تو شاید دونوں کو جگنو یا بیر بہوٹی بنا کر الائچی کی اپنی ڈبیہ میں چھپا دیتیں۔

خانم خجستہ کے آ جانے سے اسے بھی خوشی ہوئی۔ فلک کی گردش تھی جس نے انہیں بیٹوں کی جواں مرگی دکھائی تھی، در بہ در کر دیا تھا۔ وہ طاہرہ اور اس کی اولادوں اور اس کے زندانی شوہر کے لیے بے قرار تھیں۔ پیدائش کے بعد ہوش سنبھالنے سے لے کر آخری سانس تک ماں باپ، بھائی بہنوں اور اولادوں کے پیٹ کا جہنم بھرنے کے لیے دنیا کی لاکھوں عورتیں گھر سے بے گھر تھیں۔ لندن اور شکاگو میں اس نے کتنی ہی بنگلہ دیشی، ہندوستانی، فلپینی، قبرصی اور افریقی عورتیں دیکھی تھیں۔ ہر پینی ہر ڈائم کو دانت سے پکڑتی ہوئی، اپنی ذات اور ضروریات کی نفی کرتی ہوئی، ہنڈیوں کے ذریعے اپنے اپنے گھروں کو رقم بھیجتی ہوئی۔ خانم خجستہ بھی زندگی کی تہمت پوری کرنے والیوں میں سے ایک تھیں۔

ناہید نے دیکھا کہ چند ہی دنوں میں اماں اور خانم ایک دوسرے سے ٹوٹی پھوٹی فارسی اور اردو میں باتیں کرنے لگی ہیں۔ دن میں ناہید ایک دو پھیرے مونٹیسوری کے ضرور لگاتی۔ اگر کوئی ٹیچر نہ آئی ہو تو اماں کا ہاتھ بٹا سکے یا اگر وہ کلاس لے رہی ہوتیں تو

ان کی جگہ دفتر میں بیٹھ جاتی۔ اس مرتبہ اسے شدت سے احساس ہوا تھا اماں کے بوڑھے ہوجانے کا، اس بات کی بھی شرمساری تھی کہ وہ اماں کا ہاتھ بٹانے کی بجائے امریکہ جا کر بیٹھ رہی تھی۔

مونٹیسوری آتے جاتے ہوئے اسے اندازہ ہوا تھا کہ خانم بچوں پر نثار رہتی ہیں۔ کسی کو گدگدا رہی ہیں، کسی کی بلائیں لے رہی ہیں، کوئی ان کی ٹانگ سے لپٹا ہوا ہے تو کوئی ان کی گود میں گھسا جارہا ہے۔ شاید ان بچوں میں انہیں طاہرہ کے بچوں کی پرچھائیاں نظر آتی ہوں یا شاید ایرج اور فریدوں کا بچپن دکھائی دیتا ہو، ان کے چہرے کی اداسی اور آنکھوں کی وحشت چند دنوں میں ہی کم ہوگئی تھی۔ ناہید کو دیکھ کر خوش ہوتیں لیکن نجیب پر نظر پڑتے ہی کھل اٹھتیں۔ قربانت شوم۔ قربانت شوم کہہ کر واری صدقے ہونے لگتیں۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی دھند تیرنے لگتی۔

اماں نے نجیب کے لیے خانم کی بیقراری دیکھ کر آہستہ سے کہا تھا ''نصیبوں جلی کو بیٹے یاد آتے ہوں گے۔ اور بیٹے بھی کیسے کڑیل جوان۔'' خانم نے اماں کو بیٹوں کی تصویریں دکھائی تھیں۔ یہ تصویریں بخشو بھیا گرومندر سے فریم کرا لائے تھے اور اب ان کے کمرے کی دیوار پر لگی ہوئی تھیں۔ ناہید نے ان کے کمرے کی کھڑکی سے انہیں تصویروں کے نیچے اگربتی جلاتے اور ان پر پھول چڑھاتے دیکھا تھا۔ بخشو بھیا پھلواری سے روزانہ ان کے لیے پھول توڑ لانے میں پیش پیش تھے۔

خانم اسفندیاری سے ''بہائی ہال'' میں ناہید کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ خانم فجستہ اس کے یہاں بہت خوش ہیں۔ طاہرہ کو روپے بھیجنے کی بھی کوئی مستقل سبیل نکل آئی ہے۔

☆☆☆

ہر تیسرے چوتھے ہڑتال اور ہڑتال کے نتیجے میں بارہ اٹھارہ بیس بائیس لاشوں کا گرنا ایک معمول کی بات تھی۔ اخبار وحشت ناک خبروں اور خون آلود تصویروں سے بھرے ہوتے۔ ایک طرف سرکار تھی جس نے شہر کو بندوق کی نوک پر سر کرنے کا فیصلہ کر

رکھا تھا اور دوسری طرف شہر تھا جسے دوسرے شکار کر رہے تھے اور جو خود کو شکار کر رہا تھا، اپنی ہڈیاں آپ چبا رہا تھا۔ دوسرے شہروں میں عیسائیوں پر سب دشتم کے مقدمے تھے، ہندوؤں کا کوئی پرسان حال نہ تھا اور احمدیوں کی مسجدوں میں تالے پڑ رہے تھے۔ ایک کروڑ کی آبادی میں نو سو بہائی یوں رہتے تھے جیسے موجود ہی نہ ہوں۔ ان کے یہاں شیراز یزد، تہران و تبریز سے رشتہ دار یا احباب آتے تو ان کے لبوں پر دل ہلا دینے والی کہانیاں ہوتیں۔ زاہدان کے راستے وہ کوئٹہ پہنچتے، اور پھر چند دنوں وہاں دم لے کر کراچی کا رخ کرتے۔ کراچی کے راستے یورپ و امریکہ کو جاتے تھے۔

☆☆☆

ناہید نے کمپیوٹر کے نیلگوں اسکرین کو دیکھا جس پر اس کی انگلیوں کی جنبش سے سیالکوٹ، گجرانوالہ، ربوہ، تھرپارکر اور نگر پارکر کے نام ابھر رہے تھے۔ ان شہروں اور قصبوں اور دوسری بستیوں میں رہنے والے کچھ لوگوں کی بپتا۔ نفرتوں کے چڑھے ہوئے دریا اور ان میں ڈوبتے ہوئے گروہ، نامہربانیوں کے سمندر میں خوف کے جزیرے، سفاکی اور سنگ دلی کے جنگل میں راستہ ڈھونڈتے ہوئے انسان۔ بکھراؤ کا اندھیاؤ تھا جو انہیں دور دراز زمینوں میں اڑائے لیے جا رہا تھا۔ اپنے عقیدے، اپنی زبان، اپنے رسم الخط اور اپنی یادوں کو اپنی مٹھیوں کی سخت گرفت سے تھامے۔ دامان وطن ہاتھ سے چھوٹا جاتا تھا۔ جہاں ان کی جڑیں تھیں وہاں امان نہیں تھی اور جہاں امان تھی وہاں کا آسمان اپنا نہ تھا، وہاں کی زمین پرائی تھی۔

اس کی آنکھوں میں ان عیسائی عورتوں کے چہرے ابھرے جنہیں اس نے کنگ دی کرائسٹ سیمیٹری میں دیکھا تھا۔ ان کے پرکھوں نے شاید اس آس میں نیا عقیدہ اختیار کیا تھا کہ پھر وہ بھی کنگ آف انگلینڈ کے رشتہ داروں میں شمار کیے جائیں گے لیکن ان کا مقدر آج بھی کچی بستیاں تھیں۔ ہتھیلیوں پر مشقت کی تحریر اور اٹنگی شلواروں سے پھٹی ہوئی ایڑیاں صاف دکھائی دیتی تھیں، سروں پر جمے ہوئے دوپٹوں کے نیچے سے تیل میں چپڑے ہوئے بالوں کی پٹیاں چمکتی تھیں۔ سب ہل ہل کر مناجات گاتی ہوئی۔

تسی گاؤ ثنا...... گاؤ ثنا تسی رب دی...... سچیاں دی ٹولی وچ دل نال گاواں، ثنا سناواں میں رب دی...... گاؤ ثنا رب دی۔

الزبتھ مسیح اور ہر ایکسی لینسی کوئین الزبتھ دوم، دونوں اتوار کو گرجا جاتی تھیں، یسوع مسیح کے سامنے سر جھکاتی تھیں لیکن یسوع مسیح ایک ہاتھ سے جھاڑو لینے اور دوسری کے سر سے تاج اتارنے پر قادر نہ تھے۔

کراچی کے سوامی نرائن مندر میں ناہید نجف نے انہیں بھی دیکھا تھا جو اپنی اپنی جھاڑوؤں کو گھروں میں چھوڑ کر آئی تھیں، ذلتوں کی ماری ہوئی یہ عورتیں گجراتی اور سندھی کے بھجن گا رہی تھیں جن کی دھنیں مقبول ہندوستانی گانوں کا چربہ تھیں۔

ان سب کو دیکھ کر اور سن کر اسے ان عورتوں کی یاد آتی تھی جو بارہ وفات میں شامیانوں کے نیچے جھوم جھوم کر گھٹا رحمت کی ہر سو چھا رہی ہے، محمدؐ کی سواری آ رہی ہے، گنگناتی تھیں اور تبرک کی بالوشاہی لے کر خوش خوش اپنے گھروں کو چلی جاتی تھیں۔ خدیجہ اور فاطمہ اور عائشہ اور سکینہ اگر آرام سے تھیں تو اس لیے کہ وہ اکثریت کا حصہ تھیں اور الزبتھ مسیح، ڈیانا مسیح اور رادھا اور سیتا اگر سمٹ کر چلتی تھیں تو اس لیے کہ وہ اور ان کا گروہ آٹے میں نمک کی حیثیت بھی نہیں رکھتا تھا۔ اپنے اپنے طریقوں سے زندگی بسر کرتے ہوئے، سہمے ہوئے یہ لوگ اور ان پر نرغہ کرتے ہوئے ان ہی ایسے آدم زاد، مٹی کے ان پتلوں کے وجود میں درندے غراتے تھے، مردار خور پرندے اپنے پنکھ پھڑپھڑاتے تھے۔

اس کے کمپیوٹر کا نیلگوں اسکرین آسمان بن گیا۔ آسمان؟ نظر کا فریب، برف سے دھنکی ہوئی روئی کی طرح گر رہی تھی۔ زمین...... برف کا فرش، پیڑ...... بلور کی شاخیں، دور برف سے ڈھکے ہوئے جنگلوں میں بھیڑیے دائرہ بنا کر بیٹھے تھے، بھوک اور پیاس سے بے حال، تھکن سے نڈھال، ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے، اس انتظار میں کہ سامنے والے کی پلک جھپکے تو اس پر ٹوٹ پڑیں، اس کے خون سے پیاس بجھائیں، اس کے گوشت سے بھوک مٹائیں۔ سرخ زبانیں باہر کو لٹکتی ہوئی،

آنکھیں گرتی ہوئی، برف کے غبار میں انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی۔

ناہید نجف کو جھرجھری آئی، انسان دائرہ بنائے ہوئے، ایک دوسرے پر نگاہیں جمائے ہوئے، کون کس شہر کو نوالہ بناتا ہے، اشراف کے ہاتھوں میں بھوک کا پیالہ تھماتا ہے، کب کہاں سروں کے مینار اٹھتے ہیں اور کن بستیوں میں عصمتوں کے بازار لگتے ہیں...... وہ بھاگتی چلی گئی۔

☆☆☆

ناہید نے ہنستے ہوئے نجیب کو دیکھا جو ندیدوں کی طرح خانم خجستہ کے بنائے ہوئے پنیر کے سنبوسے کھا رہا تھا اور ان کی طباخی کے قصیدے پڑھ رہا تھا، خانم نہال ہوئی جا رہی تھیں، انہوں نے چند ہی دنوں میں باورچی خانے کے معاملات میں بھی دخل اندازی شروع کر دی تھی جس کا بخشو بھیا نے خاصا برا مانا تھا۔ ہفتے کی صبح تھی اس لیے ناشتے کی میز پر اماں بھی موجود تھیں اور دونوں کی چہلوں پر ہنس رہی تھیں۔

''میرے جانے میں اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں، پھر ہم تینوں جانے کب اکٹھے ہوں۔'' ناہید کا دل لحظے بھر کے لیے بیٹھ گیا۔ اماں اور نجیب کو چھوڑ کر جانا اس بار اسے ذرا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا، ہر وقت دل میں گرہ لگی رہے گی۔ وہ کھانے کی اداکاری کرتی رہی۔

ناشتے سے نمٹ کر اماں اپنے تخت پر جا بیٹھیں اور نجیب کے کپڑوں کو الٹ پلٹ کرنے لگیں، کسی قمیص کا بٹن ٹوٹا ہوا، کسی کا کف ادھڑا ہوا، انہوں نے اپنی تلے دانی کھولی اور سیاہ رنگ کا دھاگا نکال کر سوئی میں پرونے لگیں۔

''میاں بس اب تم اپنا بیاہ کر لو، یہ سارے کام اب مجھ سے نہیں ہوتے۔'' اماں نے دھاگے میں گرہ لگاتے ہوئے ترچھی نگاہ سے نجیب کو دیکھا۔

''ارے اماں آپ حکم تو دیجیے۔ کہیں تو شام کو ہی سہرا باندھ کر آ جاؤں۔'' نجیب ہنستے ہوئے دھڑ سے تخت پر لیٹ گیا۔

ناہید کو چائے پیتے ہوئے اچھو لگ گیا ''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم شادی کے لیے

اس قدر بیقرار ہو کہ شام کو ہی سہرا باندھنے کے لیے تیار ہو۔''

نجیب نے بہن کو آنکھ ماری ''میں اماں کا اکلوتا پوت، بھلا ان کا حکم ٹال سکتا ہوں۔'' اس نے کھسک کر اماں کی گود میں سر رکھ دیا۔

''اے ہے نجیب کہاں گھسے چلے آرہے ہو۔ ابھی تمہیں سوئی چبھ گئی ہوتی۔'' اماں نے اسے گھرکا۔

وہ ان کی گود میں سر رکھے لاڈ کرتا رہا۔ اس لمحے وہ ناہید کو وہی پرانا نجیب لگا جو ہر وقت شرارتیں کرتا تھا، کبھی اماں کی گود میں گھستا، کبھی ناہید پر بلیاں اچھالتا، باورچی خانے میں پہنچ کر دال چاول ملا دیتا، بخشو بھیا دال اور چاول الگ الگ بینتے جاتے اور اماں سے شکوہ کیے جاتے، بخشو بھیا کی شکایت ختم ہونے میں نہ آتی تو وہ ان کی سائیکل لے کر چمپت ہو جاتا، بخشو بھیا دال چاول کو الگ الگ کرنے کی مہم سے دستبردار ہو کر اس کے پیچھے دوڑتے۔

''ارے سرکار، بھین ہمری سواری اڑائے لیے جاوت ہیں۔'' وہ اماں کو دہائی دیتے۔

اتنی پرانی بات یاد کر کے ناہید کو ہنسی آ گئی۔ ''سواری'' تو وہ اس انداز سے کہتے تھے جیسے کوئی اپنی مرسی ڈیز کا ذکر کرے۔

ناہید نجف نے چونک کر نجیب کو دیکھا، اچانک وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا ''اچھا مائی ڈیر لیڈیز، ہم چلے دشمن جلے۔'' اس نے میز پر رکھے ہوئے کیمرے احتیاط سے اٹھائے۔

''یہ آج اتنا بہت سا تام جھام لے کر کہاں چلے؟'' ناہید نے پوچھا۔

''ذرا ایک Exclusive shoot کے لیے جا رہا ہوں۔'' وہ مسکرایا۔

''کوئی ایڈونچر نہ کرنا۔'' ناہید نے اسے غور سے دیکھا۔

''فکر مت کرو، شام تک آ جاؤں گا۔'' وہ ہنسا اور چلا گیا۔

اماں نے جلدی سے کوئی دعا پڑھ کر دور سے ہی اس پر دم کی اور پھر سر جھکا کر

ادھڑے ہوئے گریبان میں ٹانکے لگاتی رہیں۔

☆☆☆

شام ہوتے ہی وہ گھر آ گیا، Exclusive Shoot مکمل ہوگئی تھی۔ وہ اپنے پیروں سے چل کر گیا تھا، آیا تو دوستوں کے شانوں پر۔ صبح جس تخت پر وہ اماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹا رہا تھا، وہیں اُسے لٹایا گیا۔ ناہید دیوار تھامے کھڑی تھی اور سارے بدن سے کانپ رہی تھی، اماں نجیب کے دوستوں کا گریہ سن کر ننگے پاؤں اپنے کمرے سے نکلیں تو کسی نے انہیں سہارا دے کر نجیب کے سرہانے بٹھا دیا۔ ناہید نے اماں کی خالی گود کو دیکھا، شام غریباں ...... کہیں دور سے آواز آ رہی تھی ...... ابھی تو سینے میں اک آگ سی لگی ہوگی ...... ابھی تو گود کی گرمی نہ کم ہوئی ہوگی۔ اماں اپنی استخوانی انگلیوں سے نجیب کے بال سلجھا رہی تھیں، اس کے رخساروں، اس کی بند آنکھوں کو جھک کر چوم رہی تھیں۔ پنکھے کی تیز ہوا نے نجیب کے سینے پر پڑی ہوئی خون آلود چادر اڑائی۔ سیاہ دھاگے سے سلا ہوا سینہ۔ صبح انہوں نے اسے جھڑکا تھا ''یہ سوئی ابھی تمہیں چبھ گئی ہوتی۔'' اماں نے لرزتی ہوئی انگلیوں سے چادر ذرا اور سرکائی۔ ''تم تو سارا سینہ ہی رفو کرا آئے نجیب۔'' ناہید نے اماں کا جملہ سنا اور چیخیں مارتی ہوئی زمین پر گر گئی۔

خانم خجستہ جو کہیں باہر گئی ہوئی تھیں، اسی وقت گھر میں داخل ہوئیں۔ لوگوں کا ہجوم دیکھ کر وہ لحظہ بھر کے لیے ٹھٹھکیں پھر انہوں نے بخشو بھیا کو دیکھا جو زمین پر بیٹھے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹ رہے تھے۔ وہ ''دور باش ...... دور باش'' کہتی ہوئی تیر کی طرح لاؤنج میں داخل ہوئیں، اردگرد کھڑے ہوئے لوگوں کو ہٹاتی ہوئی تخت تک پہنچیں، انہوں نے سوتے ہوئے نجیب کو دیکھا، پھر ان کی دل دوز چیخ اماں کو ہوش وخرد سے بیگانہ کر گئی۔

☆☆☆

سوئم کے بعد مونٹیسوری کھل گئی لیکن اماں اس قابل نہیں تھیں کہ اس میں قدم رکھتیں مگر زندگی کب لمحے بھر کے لیے رکتی ہے۔ ناہید اپنے آپ کو سمیٹ اور سنبھال کے

آفس میں جا بیٹھی۔

اماں یوں گم صم ہوئی تھیں جیسے سننا اور بولنا ہی بھول گئی ہوں، چھت کو تکتی رہتیں اور آنسو ان کی آنکھوں سے گرتے رہتے۔ خانم خجستہ اپنا زیادہ وقت اماں کے کمرے میں گزارتیں۔ ٹوٹی پھوٹی اردو میں اماں سے باتیں کرتی جاتیں، بچپن کی یادیں، ایرانی ریت رواج کی باتیں، وہیں فرش پر بیٹھی ہوئی تام چینی کے بڑے پیالے میں کیک کے لیے انڈے پھینٹتی جاتیں یا بڑی پرات میں میدہ گوندھتی جاتیں، پھر ذہنی رو کہیں سے کہیں نکل جاتی اور فصیح فارسی میں بے تکاں بولتی رہتیں۔ ناہید اماں کے کمرے میں آتی تو ان کی بیشتر باتیں اس کے سر پر سے گزر جاتیں۔ کبھی ایرج اور فریدوں اور نجیب کے نام لیتیں پھر آستین میں اڑسا ہوا رومال نکالتیں، اس سے آنسو خشک کرتیں، انہماک سے میدے کی ورقی روٹی کے چھوٹے ٹکڑوں میں قیمہ بھرتی جاتیں، پھر اچانک شاہنامہ فردوسی کے اشعار دل دوز لحن میں پڑھنے لگتیں۔ جب تہمینہ نے اپنے جگر گوشے سہراب کی خوں آلود لاش کے بوسے لیے تھے، بال کھولے تھے اور ماتم کیا تھا۔ ہمی گفت کہ اے جان مادر کنوں...... کجائی؟ سرشتہ بہ خاک و بہ خوں۔

ناہید کے لیے نجیب کا غم بھی خواب کا ایک عالم تھا۔ دل کہتا تھا ابھی آنکھ کھل جائے گی، ابھی نجیب ہنستا ہوا یا نشے میں لڑکھڑاتا ہوا نمودار ہوگا، اسے طعنے دیتا ہوا، اس کا مذاق اڑاتا ہوا، اور دماغ جانتا تھا کہ اب وہ کبھی نہیں آئے گا، دماغ یہ بھی جانتا تھا کہ اسے ایک خفیہ ٹارچر سیل کی تصویر اتارتے ہوئے گھات لگا کر مارا گیا تھا، لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اگر وہ کراس فائر میں مارا جاتا، یا کسی آوارہ گولی کا نشانہ بن جاتا۔ حقیقت تو بس یہ تھی کہ وہ نہیں رہا تھا، خود اس کا سامان بندھا رکھا تھا کسی بھی دن چلے جانے کے لیے، اور اس کے بعد گھر میں اماں کے ساتھ نجیب کا سوگ، بخشو بھیا اور خانم خجستہ رہیں گی۔

وہ نجیب کی رخصت کا ساتواں دن تھا جب منہ اندھیرے کھڑ پٹر کی آواز سے ناہید کی آنکھ کھل گئی۔ اب وہ اماں کے کمرے میں سوتی تھی، اس نے کروٹ بدل کر

انہیں دیکھا لیکن اماں اپنے بستر پر نہیں تھیں۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ان دنوں اماں کو بستر سے اٹھانا، منہ ہاتھ دھلوانا، بہ مشکل چند نوالے کھلانا ایک مرحلہ ہوگیا تھا۔ تو پھر اماں کہاں چلی گئی تھیں؟ باتھ روم کا دروازہ بند تھا اور اس کی درز سے روشنی بھی نہیں جھلک رہی تھی۔ ناہید ننگے پیر کمرے سے باہر آئی۔ لاؤنج میں روشنی تھی، وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ اماں تخت پر بیٹھی تھیں، خانم خجستہ بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں، دونوں کی پشت ناہید کی طرف تھی۔ غم کی اپنی زبان ہوتی ہے، تب ہی دونوں ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہی تھیں، ایک دوسرے کی سن رہی تھیں۔ وہ ان دونوں کو دیکھتی رہی، پھر اسی خاموشی سے واپس کمرے میں چلی گئی۔

وہ تیار ہوکر کمرے سے نکلی تو اماں اور خانم خجستہ اب لاؤنج میں نہیں تھیں۔ ٹیبل پر ٹی کوزی سے ڈھکی ہوئی چائے دانی رکھی تھی، پیالیاں، ٹوسٹ اور مکھن۔ اسے حیرت ہوئی، ایک پیالی جھوٹی تھی، تو کیا اماں نے ناشتا کرلیا تھا؟

اس کی نظر دیوار گیر گھڑی پر گئی، نجیب کی رخصت سے پہلے اماں روزانہ اسی وقت مونٹیسوری کا رخ کرتی تھیں۔ اس نے کھلی ہوئی کھڑکیوں سے مالتی کی باڑھ کی طرف دیکھا جو گھر اور مونٹیسوری کو تقسیم کرتی تھی۔ اسے کچھ بچے اچھلتے کودتے، پختہ روش پر بھاگتے ہوئے دکھائی دیے، پھر اماں نظر آئیں، کلف لگی سفید ساڑی پہنے وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بچوں کی طرف جارہی تھیں، خانم خجستہ ان کا پرس اٹھائے ہوئے ان کے پیچھے تھیں۔

خداوند خدا کی طرح کیا غم بھی ساتویں دن آرام کرتا ہے؟ ناہید نے سوچا...... یا پھر درد کا دوشالہ اوڑھے ہوئے یہ دونوں عورتیں مقتولوں اور قاتلوں کی نئی فصلیں تیار کرنے نکلی تھیں؟

رانا سلیم سنگھ

آج وہ مجھے بے حساب یاد آیا۔

میں اس وقت ٹیلی وژن اور پریس کیمروں کی تیز روشنی میں نہایا ہوا تھا اور ایک آرٹ گیلری کے دروازے پر بندھے ہوئے سرخ فیتے کو کاٹ چکا تھا۔ میں نے ہال میں دوسرے متعدد لوگوں کے ساتھ قدم رکھا تو سفید دیواروں پر آویزاں روغنی تصویروں سے پھوٹتی ہوئی رنگوں کی تازہ خوشبو کے ساتھ اس کی یاد ایک طوفانی لہر کی طرح آئی اور مجھے شرابور کرتی ہوئی نکل گئی۔ میں اس لمحے ہجوم میں تنہا تھا اور صرف اس کے ساتھ تھا۔ شاید اس لیے کہ اس سے پہلی ملاقات کے بعد میں تازہ رنگوں کی خوشبو اور اس کی یاد کو کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہم دونوں جو ایک دوسرے سے ہزاروں نوری سال کے فاصلے پر تھے، کیوں کر ایک دوسرے سے یوں جڑے ہوئے تھے جیسے ایک ہی کوکھ سے نکلے ہوں، ایک ہی شاخ سے پھوٹے ہوں۔

یہ وہ باتیں ہیں جنہیں میں اپنے آپ سے کرتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں۔ کوئی نادیدہ ہاتھ اگر اس کے اور میرے تعلق کو میری کانفیڈنشل رپورٹ میں لکھ دے تو میں معتوب ٹھہروں۔ بھلا کہیں دشمن بھی دوست بنائے جاتے ہیں؟ لوگ بناتے ہوں گے، ہم نہیں بناتے۔

وحشت میرے اندر بھنور ڈالنے لگتی ہے۔ میں ادھر ادھر نگاہ ڈالتا ہوں۔ میری

اسٹڈی کے فرش پر دیوار تا دیوار سفید قالین ہے جس پر کرمان شاہی غالیچے بچھے ہیں۔ یہ غالیچے میں نے جنگ زدہ کابل کے کوچہ مرغا کی ایک تنگ اور نیم تاریک دکان سے خریدے تھے۔ میں گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوں، سامنے برف کی ڈلیوں سے بھری ہوئی چاندی کی بالٹی ہے، شراب ہے، بھنے ہوئے نمکین کاجو اور بادام ہیں، سنکے ہوئے گوشت کے پارچے ہیں، نظر اس سے آگے جاتی ہے تو ٹیک ووڈ کی دیوار گیر الماریاں ہیں، ان کے پیچھے وہ سیف ہے جس میں ڈالر اور پونڈ کی گڈیاں ہیں، دوسری قیمتی اشیاء ہیں، اس کی بنائی ہوئی ''بنی ٹھنی'' ہے جسے میں شدید خواہش کے باوجود اپنے گھر کی کسی دیوار پر آویزاں کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ یہ ان الماریوں کا باطن ہے اور ان کے ظاہر میں قیمتی کتابیں سجی ہوئی ہیں، دنیا بھر سے جمع کیے ہوئے نوادرات ہیں، سب سے اوپر کسی خطاط کا ایک شاہکار ہے، ''اور تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے'' میری نگاہ الماری کے اس طاقچے تک آتی ہیں جس میں مہاتما بدھ کا وہ مجسمہ ہے جسے Fasting Buddha کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تیاگ اور تپیا نے کپل وستو کے شہزادے کا بدن گھلا دیا ہے، پسلیاں گنی جاسکتی ہیں، پیٹ پیٹھ سے جالگا ہے، اس کی دھنسی ہوئی اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے مجھے ڈر لگتا ہے، میں گھبرا کر کسی اور شے کو دیکھنے لگتا ہوں۔ اس کی آنکھیں بھی میرے وجود کو حرف حرف پڑھتی تھیں اور مجھے اس کی آنکھوں سے بھی ڈر لگتا تھا پھر بھی دل اس کی طرف کھنچتا تھا۔

☆☆☆

وہ رنگوں کی خوشبو تھی جس نے کئی برس پہلے مجھ پر ہجوم کیا تھا اور میں نے چونک کر اپنے برابر آ بیٹھنے والے کو دیکھا تھا۔ اس نے آتے ہی وہسکی ساور کا آرڈر دیا تھا اور دونوں کہنیاں کاؤنٹر پر ٹکا کر دلچسپی سے بارمین کو گلاس میں وہسکی، لیموں کے عرق اور شکر کو آمیز کرتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ مجھے نظر آ رہا تھا۔ بالوں سے ڈھکا ہوا مضبوط ہاتھ جو اس کے رخسار اور بالوں پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے غور سے اس کے ناخنوں کو دیکھا تھا، ان کے گوشوں میں رنگ سوتے تھے۔

چند منٹ بعد وہسکی ساور اس کے سامنے آئی تو اس نے رقم بار مین کے سامنے رکھی، پہلی چسکی لے کر گردن گھمائی اور ہم دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے الجھ کر رہ گئیں۔

''اپنی طرف کے ہیں آپ؟'' اس کی آواز گہری اور مضبوط تھی اور نگاہیں، آواز سے بھی گہری۔

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں آپ کے بارے میں۔'' میں بے اختیار مسکرا دیا۔ یہاں میرے پاس سب کچھ تھا لیکن دوست نہ تھے، جو حاضر باش تھے وہ ملازمتیں کرتے تھے اور صرف ویک اینڈ پر دستیاب ہوتے تھے، وہ بھی اس لیے کہ میں انہیں مفت کی شراب پلاتا، کھانے کھلاتا اور انہیں ضرورت پڑتی تو دس بیس پونڈ ان کی جیب میں ڈال دیتا تھا۔

''اس شہر میں آپ شاید بہت دنوں نہیں رہے؟''

''سو تو ہے۔ لیکن آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟'' میں نے اپنا گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ بھرا۔

''یہ جتنے بھی ظالم شہر ہیں......''

''ظالم؟'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ہاں، میں تمام بڑے شہروں کو ظالم کہتا ہوں۔ ان میں آدمی زیادہ دنوں رہ جائے تو انسان نہیں رہتا، جزیرہ بن جاتا ہے۔ دوسروں سے کٹا ہوا۔ اپنے بدن کا، اپنی خواہشوں کا قیدی۔ دوسروں سے اس کی روح کا مکالمہ ختم ہو جاتا ہے۔''

''واہ! جزیرے والی بات خوب کہی آپ نے۔'' میں نے بے ساختہ اسے داد دی۔ اس کے جملوں میں روشن دھوپ کی آسودہ کر دینے والی چمک تھی۔

''اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اس وقت کچھ اور مانگتا تو وہ بھی مل جاتا۔ بڑی شبھ گھڑی تھی۔'' اس کا گیہواں رنگ سرشاری سے دمک رہا تھا۔

''میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا۔'' میں نے اسے غور سے دیکھا۔

''ارے جناب آپ کیا سمجھیں گے۔ ہوا یوں کہ جب میں کام کرتے کرتے تھک گیا تو اٹھ کر کپڑے بدلے اور یہ سوچ کر باہر نکلا کہ اپنی طرف کا اور اپنی طرح کا کوئی مل جائے تو دو گھڑی اس سے باتیں کرلیں۔ دوسروں کی بولی بولتے بولتے جبڑے دکھنے لگتے ہیں۔ جس زبان میں آپ خواب نہ دیکھیں، عشق نہ کریں، گالی نہ دیں اور ٹھوکر کھا کر جس میں ''ہائے'' نہ کہیں، اسے آپ کب تک بولیں گے اور اگر بولتے بھی رہے تو من کے بھیتر سے کوئی موتی کہاں پائیں گے۔''

''آپ تو بہت مزے کی باتیں کرتے ہیں۔'' میں پھڑک اٹھا۔ میں اب جن لوگوں میں رہتا تھا ان میں سے کوئی بھی ایسی باتیں نہیں کرتا تھا، یہ بھولا بسرا لہجہ، بڑی دور سے آنے والی آوازیں تھیں۔

''اجی ہم یاروں کے یار ہیں۔ آپ دو گھڑی بات کر کے تو دیکھیں۔'' وہ ترنگ میں تھا۔

''لیجیے صاحب، ہم نے آج کی رات آپ کے نام لکھی۔ ایسا کیجیے، یہ گلاس ختم کریں پھر میرے ساتھ چلیں۔ جی چاہے تو ساری رات باتیں کیجیے گا۔ یوں بھی کل ہفتہ ہے۔ نہ کہیں پہنچنے کی جلدی اور نہ کہیں جانے کا مسئلہ۔'' میں نے بھی اسی کے سے بے تکلفانہ لہجے میں کہا۔ یوں بھی یہاں کے بار مجھے پسند نہ تھے، بھولے بھٹکے مجبوراً کبھی بیٹھ جاتا تھا۔

اس نے بہت گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور چند لمحوں تک خاموشی سے دیکھتا رہا ''ضرور چلیں گے ہم آپ کے ساتھ، لیکن یہ تو بتائیں کہ چلیں گے کہاں؟''

''اس سے آپ کو کیا غرض کہ میں کہاں لیے چلتا ہوں۔ آپ کا جی چاہ رہا تھا کہ کوئی ہم زباں مل جائے۔ میں بھی تنہائی سے اکتا کر باہر نکلا تھا۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کو مل ہی گئے ہیں تو پھر ذرا جم کر باتیں ہوں۔''

''بات تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ابھی چلتا ہوں آپ کے ساتھ لیکن کیا خیال ہے، اب جبکہ ہم یہاں سے اکٹھے کہیں جارہے ہیں تو ایک دوسرے کا نام نہ جان

لیں؟ باتیں کرنے میں ذرا آسانی رہے گی۔'' وہ شرارت سے مسکرایا اور تب مجھے احساس ہوا کہ واقعی ابھی تک ہم دونوں ایک دوسرے کے نام سے واقف نہیں۔

''مجھے احمد مسعود کہتے ہیں۔ چند مہینوں کے لیے کسی سرکاری کام سے آیا ہوں۔'' میں نے گول مول بات کی۔

''شاید پاکستان سے آئے ہیں؟''

''جی ہاں، لیکن ہندوستان سے بھی تو آ سکتا تھا۔'' میں نے جواباً سوال کیا۔

'' ہاں آ تو سکتے تھے لیکن وہاں کے سرکاری افسر اتنی ٹیپ ٹاپ سے نہیں رہتے۔'' اس نے سر سے پیر تک مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا اور لحظے بھر کے لیے میں جھنجھلا گیا، عجب بے دھڑک آدمی تھا۔

''ارے بھئی برا نہ مانیے گا میری بات کا۔ میں بس یوں ہی بے ڈھب بولتا ہوں۔'' اس نے شاید میرے چہرے کا بدلتا ہوا رنگ دیکھ لیا تھا''اور ہاں میرا نام تو رہ ہی گیا...... جے پور کا رہنے والا ہوں۔ گھر والے اور دوست سب ہی مجھے شیخو کہہ کر بلاتے ہیں، ویسے میرا نام سلیم ہے۔ رانا سلیم سنگھ۔''

''آپ ایسے باکمال کا نام بھی ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔'' ہندوستانیوں اور وہ بھی ہندوؤں سے میل جول کے بارے میں مجھے اپنی وزارت کی ہدایتیں یاد آئیں اور میں نے اس کے کان میں پڑے ہوئے دُر کو دیکھا۔

وہ نگاہیں پہچانتا تھا، کہنے لگا''میرے کان میں آپ یہ جو موتی دیکھ رہے ہیں اس میں پڑا ہوا یہ منت کا ہے۔ اس کی بھی ایک کہانی ہے۔ ماتا جی کی شادی کو کئی برس ہو گئے تھے، پَر اولاد نہیں ہوتی تھی، جب وہ ہر سادھو سنت، پیر فقیر سے مایوس ہو گئیں تو ننگے پاؤں، ننگے سر حضرت سلیم چشتی کی درگاہ پہنچیں۔ صاحب ادھر انہوں نے منت مانگی، ادھر دس مہینے بعد ہم وارد ہو گئے۔ ماتا جی نے ترنت ہمارا نام سلیم سنگھ رکھ دیا اور صرف اسی پر بس نہیں کیا۔ سمجھیں کہ واقعی ان کے گھر میں شہزادہ سلیم پیدا ہو گیا ہے۔ لیجیے صاحب وہ ہمیں شیخو پکارنے لگیں۔ سو آج تک ہم گھر میں اور دوستوں میں شیخو

ہیں، اس دائرے سے باہر نکلیں تو سلیم ہیں لیکن کوئی انارکلی ہم سے محبت کی سزا میں دیوار میں چنوائی نہیں گئی اور مہرالنساء کی بات رہنے دیں کہ اسے حاصل کرنے کے لیے کسی شیر افگن کا قتل ضروری ہے۔'' اس نے ایک ٹھاٹھ دار قہقہہ لگایا اور اٹھ کھڑا ہوا ''چلیں صاحب، اب جہاں چاہیں چلیں۔''

ہم دونوں باہر نکلے تو چند قدم چلنے کے بعد مجھے ایک ٹیکسی نظر آ گئی۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

''ارے ٹیکسی کی کیا ضرورت ہے؟''

میں نے ڈرائیور کو ٹرنہم گرین کا پتا بتایا تو اس نے احتجاج کیا۔

''اماں بھائی صاحب سامنے ہیمر اسمتھ کا ٹیوب اسٹیشن ہے۔ وہاں سے ٹیوب پکڑتے تو دو اسٹیشن کے بعد ٹرنہم گرین ہے۔ خیر جیسی جناب کی مرضی۔'' اس نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

میرا فلیٹ وہاں سے واقعی زیادہ دور نہیں تھا۔ بمشکل دس منٹ بعد میں اپنے اس فلیٹ کا دروازہ کھول رہا تھا جس کی لیز ختم ہونے میں ابھی کئی مہینے باقی تھے۔

میں نے اسے لے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ ''عالی جاہ، عالم پناہ، یہاں آرام سے بیٹھیں۔ سامنے ٹیپ رکھے ہیں۔ کلاسیکی، نیم کلاسیکی موسیقی، غزل جو جی چاہے منتخب کریں اور سنیں۔ خود سوچیے کہ جیسا سکون یہاں ہے، کیا وہ کسی بھی بار میں میسر آ سکتا تھا؟'' میں نے جھک کر اس سے سوال کیا۔

''اجی صاحب جو آپ کی رائے وہ پنچوں کی۔ کس کی مجال ہے کہ آپ کی بات نہ مانے۔'' اس نے پُرسکون لہجے میں کہا اور صوفے سے اٹھ کر آڈیو کیسٹس کو الٹنے پلٹنے لگا۔ میں کچن میں گیا، کیبنٹ سے رائل سیلوٹ اور کٹی ساک کی بوتلیں نکال کر ٹرالی میں رکھیں، برف، چمکتے ہوئے گلاس اور طشتریوں میں کچھ نمکین چیزیں رکھ کر ٹرالی دھکیلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

اس نے جوتے اتار کر ایک طرف ڈال دیے تھے اور صوفے کی بجائے قالین

پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ کمرے میں سہگل کی پُرسوز آواز گونج رہی تھی ''بالم آئے بسو مورے من میں۔'' وہ آنکھیں بند کیے سہگل کی آواز میں یوں محو تھا جیسے عبادت کر رہا ہو۔ اس کی تقلید میں مجھے بھی قالین پر بیٹھنا پڑا۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا پسند کرے گا، اس نے کٹی ساک کی طرف اشارہ کیا اور میں نے پیگ بنا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ٹوسٹ کیا اور پھر آواز کی لہروں پر بہنے لگا...... ساون آیا تم نہیں آئے، کوئل کوکت بن میں، بالم آئے بسو مورے من میں...... گیت ختم ہوا تو اس نے سر اٹھایا، آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور دھیمے سے مسکرایا۔ اس لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھیں مجھے پڑھنے پر، میرے اندر تک اتر جانے پر قادر ہوں۔ میں نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

''اپنے نام کے بارے میں تو آپ نے بڑی تفصیل سے بتایا لیکن یہ نہ بتایا کہ آرٹسٹ بھی ہیں آپ۔'' میں نے صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ارے آپ تو جادوگر معلوم ہوتے ہیں، نہیں جادوگر نہیں، جیوتش ودیا کے ماہر لگتے ہیں۔ آخر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں تصویریں بناتا ہوں۔'' اس نے اپنی بڑی اور گہری آنکھوں سے مجھے دیکھا، ان میں واقعی حیرانی تھی۔

''آپ جب میرے برابر آ کر بیٹھے ہیں تو آپ میں سے تازہ رنگوں کی خوشبو آئی تھی اور آپ کے ناخن بھی چغلی کھا رہے ہیں۔''

اس نے جلدی سے اپنے ناخنوں پر ایک نظر ڈالی ''اماں بھائی صاحب پاکستان سرکار کے لیے شرلاک ہومز والا کام کرتے ہیں کیا؟'' اس نے ہنس کر کہا۔ میں چپ رہا تو وہ بھی چپ ہو گیا۔ چند لمحوں بعد کہنے لگا ''آپ جس بار میں بیٹھے تھے میں اس کے قریب ہیمر اسمتھ میں رہتا ہوں، ریور سائیڈ اسٹوڈیو کے نزدیک۔ کسی روز میری طرف آئیں تو میں آپ کو اپنی بنائی ہوئی تصویریں دکھاؤں۔ کچھ دنوں میں میری اکزبیشن بھی ہونے والی ہے، ریور سائیڈ اسٹوڈیو کی گیلری میں۔''

''ون مین شو ہے یا کئی دوسرے آرٹسٹ بھی ساتھ ہیں؟''

''ون مین شو ہے۔ چند مہینوں بعد ہوگا۔ آپ ضرور آیئے گا۔''

''ہاں اگر اس وقت تک میں لندن میں رہا تو ضرور آؤں گا لیکن اس سے پہلے بھی ان کے درشن کروں گا۔'' میں نے اسے ذرا غور سے دیکھا۔

''لیکن میری تصویریں دیکھ کر شاید آپ کو لطف نہ آئے۔ میری تصویروں کے تھیم بڑے کڑوے ہیں۔'' اس نے ایک بڑا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ اچانک اس کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئی تھیں اور لہجہ سنجیدہ ہوگیا تھا۔

''زندگی اتنی کڑوی تو نہیں شہزادے۔''

''یہ زندگی کو دیکھنے کا ہر آدمی کا اپنا ڈھب ہوتا ہے جو اسے کڑوا یا میٹھا بنا دیتا ہے۔ پہلے کے آرٹسٹوں کی تصویروں میں کڑواہٹ اول تو کم ہوتی تھی اور اگر ہوتی تو مٹھاس بھی ساتھ ہوتی تھی۔ بدصورتی، ان کے ہاں حسن کے سائے میں ہوتی تھی لیکن ہمارے زمانے میں تو مٹھاس جیسے زندگی کی تہ میں کہیں بیٹھ گئی ہے۔'' اس کا لہجہ اداس تھا۔

میں خاموشی سے شراب میں گھلتی ہوئی برف کی ڈلیوں کو دیکھتا رہا۔ وہ چند لمحے تک خاموش رہا پھر اچانک بول اٹھا ''سترھویں، اٹھارویں، انیسویں صدی میں بنائی جانے والی تصویریں دیکھیں، اس زمانے کے بڑے بڑے چترکار چرچ کے لیے تصویریں بناتے تھے یا بادشاہوں، شہزادوں، ان کی محبوباؤں، ان کے گھروں اور ان کے شکاری کتوں کی تصویریں۔ میدان جنگ میں ہلاک ہونے والوں کی لاشوں پر کھڑے ہنستے ہوئے فاتح حکمران ان کا موضوع ہوتے تھے۔ وہ جو کچھ بھی بناتے تھے اس کا معاوضہ انہیں مذہب کا ادارہ ادا کرتا تھا یا بادشاہت کا۔ کچھ رقم اور سرپرستی انہیں فیوڈل لارڈز سے مل جاتی تھی۔ ان کا کمٹ منٹ صرف اپنے فن سے تھا۔ یہ تو بیسویں صدی ہے جس نے کوی کو، لکھاری اور چترکار کو براہ راست جنتا سے جوڑ دیا۔ اب اس کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں یا جنتا کے ساتھ جا کر کھڑا ہو جائے یا اسٹیبلشمنٹ سے ناتا جوڑ لے۔ پہلے کا آدمی راستوں کے انتخاب کے مرحلے سے نہیں

گزرا تھا جس طرح اب ہم گزرتے ہیں۔ اسی لیے ہماری ذمہ داری بھی بڑی ہے اور ہمارے عذاب بھی بہت ہیں۔''

میں جانتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ میرے اپنے ڈرائنگ روم میں ایک بہت مشہور مصور کی بنائی ہوئی پورٹریٹس لگی ہوئی تھیں۔ ایک میری تھی اور ایک میری بیوی کی۔ اس مصور نے ہمارے ہر مارشل لا ایڈمنسٹریٹر، صدر اور وزیراعظم کی تصویر بنائی تھی اور اسی لیے اس کے مرتبے بہت بلند تھے، وہ سرکاری محکموں کے لیے، سفیروں اور سفارت خانوں کے لیے تصویریں پینٹ کرتا تھا، ان کا معاوضہ اسے لاکھوں میں ملتا تھا، اب وہ محض حکم کی تعمیل کرتا تھا، تخلیق کرنا بھول چکا تھا۔ آپ لاکھوں میں کھیل رہے ہوں، ساری دنیا کا سفر کر رہے ہوں تو ''تخلیق'' اور ''تعمیل'' کے جھنجھٹ میں کیوں پڑیں؟ یہ رانا سلیم سنگھ ابھی دنیا کو نہیں سمجھا تھا، میری طرح جب دنیا اس کی سمجھ میں آجائے گی تو یہ خود ہی سدھر جائے گا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔

''اچھا اب تم اپنا پیگ بناؤ اور ایک میرے لیے بھی'' ہم دونوں کے ہی گلاس خالی ہو گئے تھے اور میں اب ''آپ'' سے ''تم'' پر اتر آیا تھا۔ وہ ابھی اسی لہر بہر میں تھا جس میں اکثر نوجوان ہوتے ہیں، آدرش کی باتیں اور دنیا کو بدلنے کے خواب۔ کبھی میری آنکھیں بھی یہ خواب دیکھتی تھیں۔

اس نے پیگ بنا کر میرے سامنے رکھ دیا۔

''میاں گھونٹ بھرو اور غم بھلاؤ۔ اس میں اداس ہونے کی ذرا بھی ضرورت نہیں۔'' میں نے اسے دلاسہ دیا۔

''میں اس لیے اداس ہوتا ہوں یار صاحب کہ میرا جی خوش ہونے کو چاہتا ہے۔ حسن کو محسوس کرنے اور میٹھے رنگوں سے کھانڈ کے کھلونوں جیسی میٹھی تصویریں بنانے کو جی چاہتا ہے لیکن میرے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے، جو کچھ ہو گیا ہے وہ مجھے زندگی کو کسی اور طرح دیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں کے نم کو دیکھا اور یوں بن گیا جیسے کچھ نہ دیکھا ہو۔

وہ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھا رہا پھر کہنے لگا '' پہلے والے آرٹسٹ Nudes بناتے تھے تو اس میں حسن، توازن، تناسب جھلکتا تھا۔ آج بھی ماسٹرز کی بنائی ہوئی نیوڈز کے سامنے کھڑے ہو تو کچھ دیر بعد حواس دھوکہ دینے لگتے ہیں۔ ان تصویروں میں سے جیتی جاگتی عورت کے بدن کی خوشبو اٹھنے لگتی ہے۔ لیکن میں ایسی حسین تصویریں کیسے بنا سکتا ہوں۔ کالج میں تھا تو ریلیف ورک کے لیے بنگال گیا۔ وہاں میں نے حسن بنگال کی بجائے فاقہ زدہ عورتیں دیکھیں جن کی چھاتیاں سوکھ کر پسلیوں سے چپک گئی تھیں۔ یونیورسٹی پہنچا تو کمیونل رائٹس میں گھروں کے آنگنوں میں لیٹی ہوئی نیوڈز دیکھیں، جن کی کھلی ہوئی آنکھیں آسمان کو تکتی تھیں۔'' وہ بولتا چلا گیا۔ کچھ دیر پہلے وہ ہنس رہا تھا، قہقہے لگا رہا تھا اور اب یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے دیوتا اٹلس ہو اور دونوں شانوں پر دنیا اٹھائے ہو۔

اس سے ملنے سے پہلے مجھے اپنے آپ پر ناز تھا کہ ماسٹرز کی تصویروں کے بارے میں بہت جانتا ہوں لیکن اس سے ملنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے بڑے مصوروں اور ان کی تصویروں کے بارے میں پڑھا ہے، سرسری طور پر انہیں آرٹ گیلریز میں دیکھا ہے جبکہ سلیم سنگھ ان تصویروں کی روح میں اترا ہوا تھا۔ وہ کس روانی سے بولتا تھا اور کس سہولت سے اپنی بات بیان کرتا تھا۔ وہ GOYA سے بے حد متاثر تھا۔ جنگ، قحط اور انسانوں پر ہونے والے مظالم نے گویا کے فن پر جو اثرات مرتب کیے، وہ دیر تک ان کا ذکر کرتا رہا۔ اس کے خیال میں گویا پہلا بڑا مصور تھا جس نے انسانی عذابوں کی تصویر کشی، کمال کی تھی۔ جہنم کے ساتویں طبقے اور جیل خانوں میں ہونے والے شدائد، فاتحین کے خلاف بغاوت کرنے والوں کا قتل عام اور بھٹی دہکانے اور غاصبوں کے خلاف لڑنے کے لیے کارتوس بنانے والوں کی تصویریں۔

وہ بطور خاص ان Etchings کا ذکر کرتا رہا جو گویا کے البم The Shadow of War کا ایک حصہ ہیں۔ جیل خانے میں انسان، انسان پر جو ظلم روا رکھتا ہے، گویا

نے یہ تصویریں اس بارے میں بنائی تھیں۔ یہ تین تصویریں جو بیڑیوں، ہتھکڑیوں اور زنجیروں میں جکڑے ہوئے ایک قیدی کی تصویریں تھیں۔ اس پر گزرنے والے سارے عذابوں کو اور ''انصاف کرنے والوں'' کے ''انصاف'' کو ظاہر کرتی ہیں۔ ''قید اس قدر وحشیانہ ہے جس قدر کہ جرم'' ...... ''ایک مجرم پر تشدد کیوں'' ...... ''اگر وہ مجرم ہے تو اُسے جلد مر جانے دو'' ...... وہ ان عنوانات والی Etchings پر بولتا رہا پھر اچانک خاموش ہو گیا۔

''کیوں بھئی شینخو بابا تم چپ کیوں ہو گئے؟'' خاموشی طول کھینچنے لگی تو میں نے ہنس کر پوچھا۔ کمرے کی فضا بوجھل ہو گئی تھی اور میں ایک عرصے سے اتنی بوجھل باتوں کا عادی نہیں رہا تھا۔

''مجھے اب اپنا رنواس یاد آنے لگا۔'' اس کا لہجہ شراب سے بھیگا ہوا تھا۔

''رنواس؟'' میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''ہاں جان عالم ...... رنواس ...... جہاں رانیاں رہتی ہیں، جسے تم حرم کہتے ہو، جی چاہے پرستان کہہ لو۔'' وہ مجھے آنکھ مار کر ہنسا۔

''رنواس کے معنی میں جانتا ہوں، اتنی اردو یا ہندی مجھے بھی آتی ہے۔'' میں برا مان گیا۔

اس کی سرخ آنکھیں میرے اندر سفر کر رہی تھیں ''کیسے شرابی ہو یار صاحب، بوتل والی اندر اترے تو سینہ دھو دیتی ہے، ساری کھوٹ کپٹ، کید کینہ کاٹ دیتی ہے۔'' اس نے اپنا خالی گلاس اٹھایا اور میری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ''یہ جب میرے اندر سفر کرتی ہے تو مجھے اپنی رانیاں، اپنی پریاں یاد آنے لگتی ہیں۔ اب میں جاؤں گا، وہ روٹھ گئی ہوں گی تو انہیں مناؤں گا۔ سبز پری، نیلم پری، لال اور بسنتی پری۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھا اور اس نے اپنے دائیں ہاتھ کو یوں لہرایا جیسے اس کے ہاتھ میں برش ہو اور وہ اس سے رنگ بکھیر رہا ہو۔

میں اس کے ساتھ سڑک تک آیا، میں اسے ٹیکسی میں بٹھا کر گھر بھیجنا چاہتا تھا

لیکن اس نے میری ایک نہ مانی اور ہلکی پھوار میں بھیگتا ہوا اور ''ایسا برسا ٹوٹ کے بادل، ڈوب چلا میخانہ بھی'' گنگناتا ہوا چلتا چلا گیا۔

میں اس وقت تک پھوار میں بھیگتا رہا جب تک وہ گلی کا موڑ مڑ کر میری نگاہوں سے اوجھل نہ ہوگیا، یہ میں تھا جو گنگناتا ہوا جارہا تھا، یہ میں تھا جو بوجھل قدموں سے اپنے فلیٹ میں واپس آیا اور ایش ٹرے کے نیچے رکھے ہوئے کاغذ کے اس پرزے کو اٹھا کر دیکھتا رہا جس پر اس نے اپنا پتا لکھا تھا۔ یہ میرا پتا تھا۔ اس احمد مسعود کا پتا جس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے برسوں پہلے چھوٹ گیا تھا۔ اس کی یاد تو مجھے نہ جانے کب سے نہیں آئی تھی اور اب جبکہ وہ اپنی جھلک دکھا کر چلا گیا تھا تو میرے دل پر آرے چل رہے تھے۔

میں پیتا رہا، برسوں کا غبار دھوتا رہا، اپنے آپ سے بچھڑ جانے والے احمد مسعود کو یاد کرتا رہا جو فراق گورکھپوری کا شاگرد تھا اور ان ایسا، مجنوں گورکھپوری اور احتشام حسین ایسا استاد بننا چاہتا تھا، اپنے شاگردوں کو ادب، فلسفہ اور فنون لطیفہ گھول کر پلا دینا چاہتا تھا لیکن ملازمتیں عنقا کا پر ہوچکی تھیں، تب احمد مسعود نے الہ آباد چھوڑا، لکشمن ریکھا پار کی اور کوہ ندا کا رخ کیا جہاں جانے والے کبھی واپس نہیں آتے۔ وہ جو استاد بننے کے سفر پر نکلا تھا، دنیا اس سے استادی کرگئی۔ اس نے ایک کالج میں پڑھانا شروع کیا لیکن فراق گورکھپوری اور احتشام حسین لکشمن ریکھا کے ادھر رہ گئے تھے، خواہشیں بھٹکے ہوئے پرندوں کی طرح احمد مسعود کے وجود کی منڈیر پر اتریں، اور پھر انہوں نے اس کے سارے بدن میں بسیرا کرلیا، اس کے باطن میں سوئی ہوئی دنیا جاگ گئی اور چپکے چپکے پاؤں پھیلانے لگی، احمد مسعود خود سمٹتا گیا، سکڑتا گیا، دنیا کو اور اس کی خواہشوں کو جگہ دیتا گیا، پھر وہ سمٹتے سمٹتے بدن کے دائیں ہاتھ میں رہنے لگا۔ مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد جس روز میں نے کالج کے پرنسپل کے نام استعفیٰ لکھا تو میں نے دیکھا کہ میرا ماں جایا، میرا یار جانی احمد مسعود کسی سائے کی طرح میری انگشت شہادت سے نکلا اور خواہشوں اور دنیا کی ہمسائیگی سے آزاد ہوگیا۔

وہی احمد مسعود اب رانا سلیم سنگھ کے قالب میں رہتا تھا، شاید کسی اور بدن میں بھی رہتا ہو لیکن میرا تو برسوں بعد اس سے آمنا سامنا ہوا تھا، تب ہی اس اجنبی آشنا سے مل کر میں بے قرار ہوگیا تھا۔ وہ اپنے رنواس میں چلا گیا تھا، تصویروں کی سبھا سجانے لیکن میں کسی حجرۂ ذات کا رخ نہیں کرسکتا تھا۔ میں اپنے بٹوے میں بھرے ہوئے ملکہ کی تصویر والے نوٹوں سے کوئی مہنگی کتاب خرید کر پڑھ سکتا تھا، اس کے ذکر سے اپنے کم حیثیت ملنے والوں پر رعب ڈال سکتا تھا لیکن ادب یا فلسفہ یا شاعری کے اسرار اب مجھ پر نہیں کھلتے تھے، باحیا کنواریاں اپنے بندِ قبا کسی اجنبی کے لیے کب اور کہاں کھولتی ہیں۔

اس رات میں پیتا ہی چلا گیا اور میرے کانوں میں اس کی آواز گونجتی رہی۔ مجھے کئی بار اس کی آواز پر اپنی کھوئی ہوئی آواز کا شبہ ہوا۔ باہر بارش ہو رہی تھی اور کبھی کبھی بارش جب بہت زیادہ ہو تو پرانی قبریں کھل جاتی ہیں اور برسوں پہلے دفن کردی جانے والی لاشوں کے ڈھانچے باہر آنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں لیکن سمجھدار لوگ فوراً ہی ان ڈھانچوں کو بیلچوں سے قبروں میں دھکیل دیتے ہیں اور ان پر تازہ مٹی ڈال دیتے ہیں۔ ان قبروں کو پتھروں سے بھر دیتے ہیں۔ اس رات میں نے بھی سلیم سنگھ کی باتوں کے بہاؤ سے کھل جانے والی ایک قبر سے جھانکنے والے اپنے ڈھانچے کو اندر دھکیلا اور اس پر یادفراموشی کی بھربھری ریت ڈال دی۔

☆☆☆

میں کئی دن تک اس کی یاد کو ذہن کے مردہ خانے میں دھکیلتا رہا، خود کو سمجھاتا رہا کہ اس سے ملنے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ کسی رانا سلیم سنگھ کا مجھ سے بھلا کیا علاقہ؟ میں جس شعبے سے تعلق رکھتا تھا اس میں ایسے لوگوں سے ملاقاتیں ناپسندیدہ ٹھہرتی ہیں لیکن اس میں کوئی ایسی بات تھی جو دوسروں میں نہ تھی......

اور پھر ایک شام میں نہ چاہنے کے باوجود اس کے فلیٹ کی گھنٹی بجا رہا تھا۔ دروازہ کھلا تو رنگوں سے لتھڑے ہوئے کرتے پاجامے میں وہ سامنے کھڑا تھا، ہاتھ

میں برش تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھل اٹھا۔

''ارے واہ تو آپ آگئے، میں روز ہی آپ کی راہ دیکھتا تھا۔'' اس کی بے ساختگی میں کیسی مٹھاس، کیسا سوندھا پن تھا، مجھے ہائی اسکول کے سامنے سے خریدی ہوئی گزک یاد آنے لگی، سوندھی اور میٹھی، منہ میں گھلتی ہوئی، نشے میں لاتی ہوئی۔ وہ نشہ تو اب مہنگی شرابوں سے بھی میسر نہیں آتا تھا۔

میں اندر داخل ہوا، یہ ایک بڑا کمرہ تھا، بے ترتیب، تازہ رنگوں کی خوشبو در و دیوار سے پھوٹتی ہوئی، کئی کینوس دیواروں پر آویزاں تھے، کئی دیوار سے ٹکا کر رکھ دیے گئے تھے۔ ایک کینوس ایزل پر تھا اور ادھورا تھا، وہ شاید اسی پر کام کر رہا تھا۔ فرش پر، تپائیوں پر کتابوں کے ڈھیر تھے۔ ایک کونے میں ایک زنگ آلود ہاون دستہ رکھا تھا، شیشے کے مرتبان تھے جن میں سے خشک پھول اور جڑی بوٹیاں جھانک رہی تھیں، کسی عطار کی دکان کا منظر تھا۔

میں نے اسے دیکھا تو وہ گردن خم کیے ہوئے مجھے دیکھ رہا تھا اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی ''یہ سب کچھ دیکھ کر پریشان ہوگئے ہیں آپ لیکن بس یہی میرا رنواس، میرا پرستان ہے۔ انتظار کیجیے کہ کسی بھی لمحے اچانک کوئی پری نمودار ہو جائے اور یہ آواز لگائے کہ معمور ہوں شوخی سے، شرارت سے بھری ہوں، دھانی میری پوشاک ہے، میں سبز پری ہوں۔''

''میرے خیال میں اس کے بعد اسے یہ اعلان بھی کرنا چاہیے کہ شہزادۂ گلفام کی صورت پہ مری ہوں۔'' میں نے اس کی بات پر گرہ لگائی۔

میرے جملے پر اس نے قہقہہ لگایا اور کمرے میں بچھے ہوئے واحد دیوان پر سے رسالے اور کتابیں اٹھا کر فرش پر رکھنے لگا ''آپ آرام سے یہاں بیٹھ جائیں، میں ابھی آیا۔'' گیلری کا دروازہ کھول کر وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

مجھے لکشمن ریکھا پار کرنے سے پہلے کے دن یاد آئے، ان دنوں میرا کمرہ بھی اتنا ہی بے ترتیب ہوتا تھا، فرق تھا تو صرف اتنا کہ اس میں تصویروں کی بجائے

کتابیں تھیں، کسی کونے میں گرتے کا گولا پڑا ہوا ہے، ولائی فرش پر لوٹ رہی ہے،
پلنگ کی ادوائن کسنے کی فرصت نہیں سو وہ جھلنگا ہوگئی ہے، ایک تپائی پر ابا کا گراموفون
رکھا ہے جس پر صبح شام کوئی ایک ریکارڈ اس وقت تک بجایا جاتا ہے جب تک کہ وہ
گھس کر ختم نہ ہوجائے، ایک ہی ریکارڈ نہ بجائیں تو کیا کریں کہ گرہ میں دوسرا
خریدنے کے دام نہیں۔ کھینچو کمان، مارو جی بان، رت ہے جوان، او مورے پران،
مارو جی بان...... میرے بدن پر ارمانی کا سوٹ تھا، قمیص آسٹن ریڈ کی اور اوورکوٹ
بربری کا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں بیٹھوں جو سوٹ پر دھبے نہ لگیں اور
قمیص کے کف داغ دار نہ ہوں، اوورکوٹ کس چیز پر لٹکاؤں کہ وہ گرد آلود نہ ہو۔
میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ایک تپائی پر
گراموفون رکھا تھا۔ میں نے جیسے خواب میں اپنا اوورکوٹ اتار کر اسے ایک کرسی کی
پشت پر ڈال دیا اور اس گراموفون کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

اس کے آنے کی خبر مجھے تارپین کی تیز بو سے ہوئی ''میں اپنے ہاتھ دھو رہا تھا۔''
اس کے ہاتھ پر سے رنگ اتر گئے تھے لیکن تارپین کے سفید دھبے نظر آرہے تھے۔

''میرے خیال میں تھوڑی سی دارو چلے، تب ہی دلوں پر جمی ہوئی برف پگھلے
گی۔'' اس نے کہا اور کچن سے ایک بوتل اور دو گلاس لے آیا، پھر کسی کونے سے اس
نے چپس کا ایک پیکٹ نکالا اور اسے کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ وہ جب گلاس
میں شراب انڈیل رہا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ یہ شخص جو اتنے بے ڈھنگے پن سے
یہاں رہتا ہے، میرے آراستہ فلیٹ میں آکر یوں بیٹھ گیا تھا جیسے آسائش کی زندگی
اُس کا روزمرہ ہو۔ مجھے پہلے اس پر رشک آیا، پھر حسد ہوا، پھر کسی نے مجھ سے کان
میں پوچھا کہیں اپنے آپ سے بھی حسد کرتے ہیں؟ کبھی اپنے آپ پر بھی کسی کو
رشک آتا ہے؟

گھونٹ بھرتے ہوئے میری نظر گراموفون کا طواف کرنے لگی۔

''کچھ سنیں گے آپ؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ چلتا ہے؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''ارے یار صاحب ایسا ویسا چلتا ہے؟ ون ہنڈریڈ پرسنٹ چلتا ہے۔'' اس نے دیوان کے نیچے سے ایک ریکارڈ کیس نکالا اور اس میں رکھے ہوئے ریکارڈ الٹنے پلٹنے لگا، پھر ایک ریکارڈ اٹھا کر وہ گراموفون تک گیا، سوئی بدلی، چابی بھری اور پھر وہ آواز در و دیوار پر پھیل گئی ''کھینچو کمان مارو جی بان، مارو جی بان۔''

میرے سینے پر تیر سا لگا اور میرے ہاتھ میں تھما ہوا گلاس لرز گیا۔ یہ کمرہ تھا کہ جادونگری؟ یہ شخص تھا کہ میری بھولی بسری یادوں کو پڑھنے والا؟ یہ وہ تھا کہ میں تھا؟ یہ میں تھا کہ وہ تھا؟

سامنے اس کی ایک پینٹنگ تھی۔ اس میں سمندر تھا، تہ میں سبز اور نیلا، سطح پر سفید جھاگ اڑتا ہوا اور سفید جھاگ پر آسمان کی نیلگونی کا عکس تھرتھرا رہا تھا۔ پلٹتی ہوئی لہروں کی سبزی مائل نیلگونی میں سے کئی شکاری کتے نکل رہے تھے اور سمندر کی لہروں پر دوڑتے ہوئے اس ایک بگلے کا تعاقب کر رہے تھے جو ان کے کھلے ہوئے نوکیلے جبڑوں اور رال گراتی ہوئی سرخ زبانوں سے کچھ ہی اوپر اڑ رہا تھا۔ تصویروں میں سمندر اور کتے دونوں ہی اس خوبی سے پینٹ کیے گئے تھے کہ دیکھ کر کتوں کی سانسوں کی گرمی محسوس ہوتی تھی اور بھنور ڈالتا ہوا پانی اس قدر زندہ تھا کہ اس میں ہاتھ ڈبونے کو جی چاہتا تھا۔

''تم تو سمندر کا ایک ٹکڑا چرا کر لے آئے ہو اور اسے کینوس پر رکھ دیا ہے۔''

''اجی ہم تو آنکھوں سے سرمہ اور پسلیوں سے دل چرا لاتے ہیں، یہ سمندر کیا چیز ہے۔'' اس کی ہنسی کیسی بے ریا، کیسی ٹھاٹھ دار تھی۔

''لیکن رانا جی، سرمے والی کہیں نظر تو نہیں آ رہی۔'' اپنے لہجے کی شرارت مجھے خود اجنبی لگی۔

''ذرا چھری تلے دم تو لو یار صاحب، سرمے والی سرکار بھی آ جائے گی، پھر آپ کو اس سے میر کی غزلیں اور میرا کے بھجن سنواؤں گا۔ شعلہ سا لپک جائے ہے

آواز تو دیکھو۔'' اس کی زبان سے پھول جھڑ رہے تھے۔ وہ آپ سے تم پر اتر آیا تھا۔

''ماشاء اللہ ...... کیا بامحاورہ اردو بولتے ہو۔'' میں نے گھونٹ بھر کر اسے دیکھا۔

''میں نے مولوی صاحب سے صرف ہندی اور اردو ہی نہیں فارسی بھی پڑھی ہے، تختی لکھی ہے۔ کہیے تو کریما بہ بخشائے برحال ما سناؤں یا شاہنامہ کے اشعار سنیں گے؟'' وہ مسکراتا رہا اور میں سوچتا رہا کہ میں نے ہندی کیوں بھلا دی۔ ہندی، ہندوی، ہندوستانی، امیر خسرو اس جھنجھٹ میں پڑے بغیر سات سو برس پہلے کہہ گئے تھے، سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں، نہ آپ آویں، نہ بھیجیں پتیاں ...... اب لکشمن ریکھا کے اس پار سے خط بھی نہیں آتے تھے، خون کے تمام رشتے بتاشے کی طرح بیٹھ گئے تھے اور مشترک تہذیب کی سیتا کو سیاست کا راون اٹھا لے گیا تھا۔

میرے فلیٹ پر سرکاری اور درباری دونوں ہی قبیلوں کے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ سلیم سنگھ ان لوگوں کو میرے یہاں وقت بے وقت نظر آتا تو سرگوشیاں شروع ہو جاتیں اور سرگوشیاں سوال اٹھاتی ہیں۔ میرے الجھے ہوئے معاملات مجھے اس کی اجازت نہیں دیتے تھے لیکن اس سے پہلی ملاقات کے بعد سے دل بے اختیار اس سے ملنے کی خواہش کرتا اسی لیے سلیم سنگھ کو بلانے کی بجائے میں خود اس کے یہاں چلا جاتا۔ میں کبھی کسی عورت کا بھی یوں اسیر نہیں ہوا تھا، آسمان کو چھوتی ہوئی اس سیڑھی کا بھی نہیں جو میری بیوی ہے اور ایک اعلیٰ افسر کی بیٹی ہے۔ سیڑھیاں بلندیوں تک پہنچنے کے لیے ہوتی ہیں، ان کی ہم پوجا نہیں کرتے۔

سلیم سنگھ کے در پر میں بے قراری اور بے تابی سے جاتا تھا، اس لیے نہیں کہ میں اس سے ملنا چاہتا تھا، میں وہاں اپنی تلاش میں جاتا تھا، وہ بھی مجھ سے یوں ملتا جیسے صدیوں کا بچھڑا یار مل رہا ہو۔ دوسری تیسری ملاقات میں ہی وہ مجھے ''سوائی صاحب'' کہنے لگا تھا۔ جے پور کے راجہ جے سنگھ کا وہ خطاب جو اسے اورنگ زیب

کے دربار سے ملا تھا۔ کچھواہا راج کو دوسرے تمام راجپوت راجوں سے ایک چوتھائی زیادہ ماننے کا اعلان۔ وہاں پہنچ کر مجھے محسوس ہوتا کہ چند گھنٹوں کے لیے ہی سہی میں کسی دیو کی قید سے آزاد ہو گیا ہوں۔ وہ جو زندانی ہوں وہی جانتے ہیں کہ چند گھنٹوں کی رہائی بھی کیا معنی رکھتی ہے۔ میں اس سے وہ باتیں کرتا جنھیں میں کب کا بھلا چکا تھا۔ ان ناموں کو سنتا جن کا نام لیتے ہوئے کبھی میری آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ وہ کس طرح اترا کر خسرو، میر، کبیر کا نام لیتا، تلسی داس کی چوپائیاں اور غالب کی غزلیں سناتا، تان سین اور بسم اللہ خان، کون تھا جو اس کا نہیں تھا۔ تاج محل اور اجنتا ایلورا اس کا ورثہ تھے، راجہ دہلو کی بسائی ہوئی دلی اس کی تھی اور کمپنی بہادر کا آباد کیا ہوا کلکتہ بھی ترکے میں اسے ملا تھا، ستم تو یہ تھا کہ بٹوارے کے نتیجے میں شہید بھی تقسیم ہو گئے تھے۔ بھگت سنگھ اور دادا اشفاق، جھانسی کی رانی اور حضرت محل بھی اسی کے حصے میں آئی تھیں۔ میرے دونوں ہاتھ خالی رہ گئے تھے۔ ایک رات اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے بہت سے لوگ، بہت سے شہر اور بہت سی عمارتیں یاد آئیں۔ اس رات میں اس کے سامنے رو دیا۔

''یار یہ تو بڑی بے ایمانی ہے۔ تُو نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔'' اپنی ٹوٹی ہوئی آواز سن کر میرا گریہ اور بھی زیادہ ہو گیا۔

اس نے نشے سے بھیگی ہوئی آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور دیکھتا رہا، پھر اس نے ایک گہرا سانس لیا ''تم تاریخ کا کیک کھانا بھی چاہتے ہو، اسے رکھنا بھی چاہتے ہو۔ اتہاس تو دھرتی سے جڑا ہوتا ہے، ہم جب دھرتی سے ناتا توڑ لیں تو اتہاس سے ناتا خود ہی ٹوٹ جاتا ہے۔''

میں نے سر جھکا لیا' نشے میں بھی مجھے یہ یاد آ گیا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔

جے پور اس کے پور پور میں رچا ہوا تھا، ایک دن ترنگ میں تھا تو سب کچھ بھول کر امبر اور جے پور کی باتیں کرتا چلا گیا۔

''جن نے جے پور نہیں دیکھا سوائی صاحب ان نے کچھ نہیں دیکھا۔ کچھ بھی

نہیں۔ جانو کہ زندگی اکارت گئی۔'' اس نے افسوس سے سر ہلایا ''اجی سوائی صاحب، اپنی زندگی کے کچھ دن مجھے دے دو، میرے ساتھ جے پور چلو، دیکھو کہ راجپوتوں اور مغلوں کی رشتہ داریاں آج بھی ہمارے شہروں اور بازاروں میں کس طرح جھلکتی ہیں۔ مغل بادشاہ اور شہزادے ہماری گودوں میں کھیلے ہیں۔ ہم نے ان پر سے جانیں واری ہیں۔ ساموگڑھ میں ہارتے ہوئے دارا کے گرد ہم راجپوتوں نے گھیرا ڈالا تھا، اپنی گردنیں کٹا دی تھیں، پر پیٹھ نہیں دکھائی تھی۔'' اس کی آواز بھرا گئی اور وہ وہیں فرش پر لیٹ گیا۔ میں نے دیکھا، اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے تھے۔ وہ ماضی اور حال میں بہ یک وقت زندہ رہتا تھا، سانس لیتا تھا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔

''اجی مہابلی اکبر ہم کچھواہہ راجپوتوں کے بہنوئی تھے اور شہزادہ سلیم کو چاندی کی کٹوری میں دودھ ملیدہ ہم نے کھلایا تھا۔ ہم ان کے ماموں، وہ ہمارے بھانجے۔''

پھر وہ گنگنانے لگا ''مانگے ہے جودھاجی کا راج، للاجی کا نال نہ چھوائے۔''

وہ یہ باتیں کرتے ہوئے کبھی روتا، کبھی ہنستا رہا۔ ماضی اور حال کو یوں گڈمڈ کرتا رہا کہ میں بھی اس کے ساتھ زمیں بوس ہو جانے والی محل سراؤں میں پھرتا رہا۔

''کچھ جانتے بھی ہو سوائی صاحب، شہزادہ سلیم ہماری مان بائی کو بیاہنے گیا تو دلہن کی پالکی مہابلی اور شہزادہ سلیم اپنے کندھوں پر اٹھا کر راجہ بھگوان داس کے محل سے باہر لائے تھے اور مہابلی نے راجہ سے کہا تھا ''تمہاری رے بیٹی، تمہارے محلوں کی رانی، تم صاحب سردار رے'' ...... اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے کانوں کی لو چھوئیں اور ''ہے رام'' کا نعرہ لگایا۔

''میاں سلیم سنگھ تم اگر پچیس تیس برس پہلے مجھے ملے ہوتے تو میں کہتا کہ اپنا یہ کام دھام چھوڑ کر بمبئی چلے جاؤ اور کے آصف کے یہاں بھرتی ہو جاؤ۔ انہوں نے بھی ''مغل اعظم'' بناتے ہوئے مغلوں اور راجپوتوں کی مالا اس طرح نہیں جپی ہے۔''

میں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

وہ مجھے کچھ دیر دیکھتا رہا، پھر اداسی سے مسکرایا ''میں یہ باتیں کسی اور سے نہیں کرتا، صرف تم سے کرتا ہوں سوائی صاحب، دوسرے تو مجھے سودائی سمجھیں گے۔''

''میں بھی تمھیں کچھ کم سودائی نہیں سمجھتا۔''

''واہ کیا نام رکھا جاسکتا ہے ...... رانا سلیم سنگھ سودائی جے پوری۔'' اس نے گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے زوردار قہقہہ لگایا۔ ''اس نام سے تو میں کل ہند مشاعرہ پڑھ سکتا ہوں۔''

''اور غزلیں کہاں سے آئیں گی۔''

''اجی غزلوں کا کیا ہے، ڈیڑھ دو سو برس پہلے پران تیاگنے والے کسی بھی کائستھ کوی کا کلام آخر کسی کے کام تو آئے۔'' اس نے مجھے آنکھ ماری۔

''ہم دونوں اسی طرح بے تکی باتیں کرتے، شاید یہی کتھارسس کا ایک طریقہ تھا۔ کبھی میرا جی چاہتا کہ سر پیٹ کر اس کمرے سے نکل جاؤں جس میں کھرل کیے ہوئے زعفران کی، ہاون دستے میں کوٹی جانے والی جڑی بوٹیوں اور پھولوں کی، تارپین کے تیل اور خدا جانے کن کن چیزوں کی خوشبو تھی۔ مجھے الہ آباد کے عطار خانے یاد آتے۔

''او میاں مغلوں کے ماموں صاحب ...... ہم لندن میں بیٹھے ہیں، کبھی پیکڈلی اور آکسفورڈ اسٹریٹ کا رخ کرو، کبھی تو ٹاور آف لندن یا بکھنگم پیلس کا بھی دیدار کرنے چلو۔'' ایک روز میں نے جھنجھلا کر کہا تھا۔

''کیسی باتیں کرتے ہو سوائی صاحب؟ ہمارے خزانے، ہمارا اتہاس، ہمارے درشن جھروکے اور ہماری چوکھٹیں تک تو لوٹ لائے یہ لوگ ...... اور ہم جا کر اپنی ہی چیزوں کو دیکھنے کے لیے ٹکٹ خریدیں، پونڈ خرچ کریں اور گورے ڈاکوؤں کا لوٹا ہوا مال دیکھیں؟ نہیں سوائی صاحب یہ نہیں ہونے کا۔''

''جب یہ سب کچھ نہیں دیکھنا تو پھر یہاں لندن میں کیوں بیٹھے ہو۔ جاؤ اور جا کر جے پور میں دھونی رماؤ۔'' میں نے اس پر چوٹ کی۔

میری یہ بات سنتے ہی اس کا نشہ ہرن ہوگیا، وہ بیٹھا سر ہلاتا رہا پھر اس نے اپنی مدھ ماتی آنکھوں سے مجھے دیکھا ''گھر کیسے جاؤں؟ پتا جی کھانڈے سے چورنگ کاٹیں گے۔''

''پتا جی کیوں کھانڈے سے چورنگ کاٹیں گے؟ کیا ڈاکا ڈال کے بھاگے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''یار وہ اپنے جگری دوست کی بیٹی سے میرے پھیرے کرانے کے چکر میں ہیں۔ میں وہاں سے یہ کہہ کر رفو چکر ہوا ہوں کہ لندن میں میری نمائش ہے، اس سے نمٹ کر میں ترنت آیا۔'' وہ ایک ادا سے ہنسا۔

''اور اب کتنے دنوں سے لندن میں ہو؟''

''یہی کوئی چھ ایک مہینے ہوگئے۔''

''لیکن اس طرح کب تک یہاں رہو گے؟''

''یہ نہ پوچھو۔ ماتا جی پتا جی نے ڈاک اور فون سے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ میں ہر مرتبہ انہیں کوئی نیا جھانسہ دے دیتا ہوں۔''

''ابے گاؤدی، کب تک نیا جھانسہ دیتے رہو گے؟'' میں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ ''ان سے صاف انکار کیوں نہیں کر دیتے؟''

اس نے آنکھیں نکال کر مجھے دیکھا ''اپنے اللہ رسول کا شکر ادا کرو کہ جس نے تمہیں ایک راجپوت باپ کے گھر نہیں پیدا کیا۔''

''تو اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟''

''مجھے تو بس بنی ٹھنی کا انتظار ہے۔'' اس نے اپنے دانتوں کی نمائش کی۔

''بنی ٹھنی؟ بھئی یہ کس بلا کا نام ہے؟''

''سچ کہتے ہو سوائی صاحب۔ واقعی قہر ہے، بلا ہے'' اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔

اس روز وہ دیر تک میراسین کی باتیں کرتا رہا جسے وہ لاڈ سے ''بنی ٹھنی'' کہتا تھا۔

''اسے دیکھ کر تم بھی یہی کہو گے کہ اس پر یہ نام سجتا ہے۔ ایسا سنگھار پٹار کرتی ہے کہ بس دیکھتے رہو۔'' میرا اسپین کا نام ''بنی ٹھنی'' اس نے راجہ ساونت سنگھ دربار کے نہال چند کی بنائی ہوئی ایک تصویر کو دیکھ کر رکھا تھا۔ نہال چند اپنے عہد کا سب سے مشہور چتر کار!۔ اس نے رادھا اور کرشن کی کہانی رنگوں اور برش سے کاغذ پر اتاری تھی۔ کرشن اس نے راجہ ساونت کو بنایا تھا اور رادھا کا چہرہ بناتے ہوئے راجہ کی چہیتی محبوبہ ''بنی ٹھنی'' کو سامنے رکھا تھا۔

''میں نے بنی ٹھنی کا پورٹریٹ دیکھا ہے۔ تم یقین کرو سوائی صاحب یوں دکھائی دیتا ہے جیسے میرا کا ہی عکس ہے۔'' اس نے بہت رازداری سے مجھے بتایا تھا۔

میرا تھیٹر کی دنیا سے وابستہ تھی، بنگال کی رہنے والی، گانے اور ناچنے میں طاق۔ پہلی ہی ملاقات میں رانا سلیم سنگھ کا دل لے گئی تھی لیکن سلیم سنگھ کے پتا جی کے لیے یہ ناک کٹا دینے والی بات تھی کہ ان کے یار کی بیٹی کی بجائے ان کا منتوں مرادوں کا بیٹا ایک بنگالن سے شادی کر لے، وہ مرنے مارنے پر تیار تھے، اپنا کھانڈا لہرا کر بنگالیوں کے خلاف بھاشن دیتے اور یہ ثابت کرتے کہ نہ انہوں نے بنگال میں انگریزوں کو پاؤں ٹکانے دیے ہوتے نہ ہندوستان غلام ہوتا۔

اب وہ بات بے بات بنی ٹھنی کا تذکرہ کرتا۔ ''ظالم ہے بنگال کی لیکن آنکھیں بالکل جودھ پوری ہیں۔ ویسی ہی کٹارسی۔'' اس نے رازداری سے مجھے بتایا۔

مجھے ہنسی آ گئی ''یار جودھ پوری کوٹ تو دیکھا، سنا اور پہنا تھا، لیکن یہ جودھ پوری آنکھیں کس کھونٹی پر لٹکائی جاتی ہیں۔''

''کیسی اوندھی باتیں کر رہے ہو؟ جودھ پوری آنکھوں کی کھونٹی پر دل لٹکایا جاتا ہے۔'' اس نے ڈپٹ کر کہا اور اپنے ایزل پر جھک گیا۔

یہ وہ تھا جس نے مجھے ہندوستانی مصوری کے رمز سکھائے۔ اس نے مجھے بتایا کہ ہندوستانی موسیقی کے گھرانوں کی طرح منی ایچر مصوری کے بھی گھرانے ہیں۔ جے پور گھرانہ، کشن گڑھ، بوندی اور کوٹا گھرانا ...... میں نے اسے پستے سے سبز،

زعفران سے نارنجی، ہڑ سے زرد اور نیل سے نیلا رنگ کشید کرتے دیکھا۔ اس کے کمرے میں طرح طرح کی سبزیاں، پھول، پیڑوں کی چھالیں اور شاخیں نظر آتیں، کبھی وہ ریت کو کپڑے سے چھانتا ہوا دکھائی دیتا اور کبھی سیاہ رنگ کے لیے اپنے فرائنگ پین کا پیندا کھرچ کر اس میں کالک اکٹھا کرتا نظر آتا۔ سرخ رنگ کے لیے شیشے کے ایک مرتبان میں اس نے قرمزی کیڑے محفوظ کر رکھے تھے۔ باریک ململ، طرح طرح کی باریک اور موٹی چھلنیاں، ہاون دستہ، کیا کباڑ خانہ اکٹھا کر رکھا تھا رانا سلیم سنگھ نے۔

میں نے جب پہلی مرتبہ اسے اس بکھیڑے میں الجھے ہوئے دیکھا تو حیران رہ گیا ''تم لندن میں بیٹھے ہو رانا جی، جہاں دنیا کے بہترین رنگ ملتے ہیں۔ دنیا بھر کے مصور یہاں سے رنگ خریدنے آتے ہیں اور تم یہاں بیٹھے کسی وید جی کی طرح خدا جانے کن جڑی بوٹیوں کو پیستے کوٹتے رہتے ہو۔'' میں نے بھنا کر کہا تھا ''میں کل تمہارے لیے ایک گرائنڈر لے آؤں گا۔''

وہ میری یہ بات سنتے ہی کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے مجھے گھور کر دیکھا ''جی ہاں، آپ گرائنڈر لے آئیں گے، بڑی کرپا آپ کی۔ یہ احسان مت کیجیے گا مجھ پر...... کوٹنے اور کھرل کرنے سے رنگ ہی الگ نکلتا ہے، اس میں ہاتھ اور بازو کا زور بھی شامل ہوتا ہے۔ اب اگر موتی کھرل کرنا ہو تو ہفتوں لگتے ہیں اس میں، لیکن اس کا اجالا، اس کا روپہلا پن تمام بنے بنائے رنگوں سے جدا ہوتا ہے۔''

''بھئی تم تو جانے کس صدی کی بات کرتے ہو...... تمہاری یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''ہم راجپوت رنگوں سے کھیلتے ہیں اور اپنے رنگ ہم چیزوں سے خود نچوڑتے ہیں۔ ہمارے لیے زندگی، موت سب رنگوں کا کھیل ہے۔ جان دینے جاتے ہیں تو کیسری بانا پہنتے ہیں، ہماری عورتیں جوہر کرتی ہیں تو نارنجی آگ اوڑھ لیتی ہیں۔ ہمیں زندگی کرتے دیکھنا چاہو تو ہماری لڑکیوں کی چندریاں، چوڑیاں اور چولیاں

دیکھو، گہرے رنگوں سے رنگے ہوئے ہمارے شہر اور گاؤں دیکھو۔'' وہ بولتا چلا گیا۔

''تو پھر تمہاری تصویریں اتنی کڑوی اور دل ہلا دینے والی کیوں ہیں؟'' میں نے اس کی بنائی ہوئی ان تازہ تصویروں کی طرف اشارہ کیا تھا جو دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھیں اور جن کے رنگ ابھی خشک نہیں ہوئے تھے۔

''اپنشد میں کہا گیا ہے سوائی صاحب کہ سب سے پہلے صرف پانی تھا، اس پانی نے سچ کو، سچ نے برہما کو، برہما نے پرجاپتی اور پرجاپتی نے دیوتاؤں کو پیدا کیا اور دیوتا سچ کی پوجا کرتے ہیں۔ اب تم جانو کہ میں ٹھہرا ناستک، میں برہما، پرجاپتی اور دیوتاؤں کے بارے میں کوئی جان کاری نہیں رکھتا لیکن پانی کو جانتا ہوں اور مانتا ہوں جس نے سچ کو پیدا کیا۔ میں اسی سچ کی لکیروں سے اس کے رنگوں سے اپنی تصویریں بناتا ہوں۔''

شدید انتظار کے بعد میرا اسین آ پہنچی۔ سلیم سنگھ اسے بنی ٹھنی کہتا تھا تو کیا غلط کہتا تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ وہ پہلا دن تھا جب مجھے رانا سلیم سنگھ پر رشک نہیں آیا، اس سے حسد ہوا...... اس بنی ٹھنی کی آنکھیں واقعی جودھ پوری کٹار تھیں کہ دل کو کاٹتی چلی جائیں۔ اسے دیکھ کر مجھے ایک بھولا بسرا گیت یاد آیا'' بنے سہرا جو باندھیں تجھے حور پریاں، جن کے لانبے لانبے کیس، رسیلی انکھیاں'' سسرال کی دہلیز پر پہلا قدم رکھتے ہی یہ بول میرے کانوں میں پڑے تھے۔ آواز کجن بیگم کی تھی جو بہت ناز، بہت ادا سے گا رہی تھیں ''جن کے لانبے لانبے کیس، رسیلی انکھیاں۔''

میرا پر نظر پڑی تو مجھے بے ساختہ کجن بیگم کے گائے ہوئے یہ بول یاد آئے۔ گھنے گھنیرے بال آبشار کی طرح کمر سے بہت نیچے گرتے ہوئے اور آنکھیں رسیلی، مدھ سے بھری...... ہم ہیتھرو ایئر پورٹ پر تھے جہاں آنے والوں اور رخصت ہونے والوں کے لیے گلے ملنا، ہونٹ چومنا ایک روزمرہ تھا لیکن ان دونوں کی آنکھوں میں ایسی حیا تھی کہ میں نے نگاہیں جھکا لیں، وہ ایک دوسرے کے ساتھ یوں چل رہے تھے جیسے سینکڑوں نگاہوں کے حصار میں ہوں اور ہمت نہ رکھتے ہوں کہ ایک دوسرے

کو چھولیں۔

اس رات میں کچھ دیر ان کے ساتھ رہا اور پھر سلیم سنگھ کے اصرار کے باوجود انہیں ایک دوسرے کے ساتھ چھوڑ آیا۔ اس رات مجھے نیند نہیں آئی۔ رانا سلیم سنگھ نے مجھے ہر میدان میں شکست دی تھی، میں سمجھتا تھا کہ برصغیر کی صرف تاریخ اور جغرافیہ اس کا ہے لیکن وہ تو سوئمبر میں بھی سب سے سہانی شہانی جیت لایا تھا۔ میں دو دن اس کی طرف نہیں گیا لیکن تیسرے دن اپنے دل پر میرا قابو نہیں رہا، اب تک میں اپنے آپ سے ملنے جاتا تھا اور اب میں اس سہانی کو دیکھنا چاہتا تھا جو میری نہیں تھی اور کبھی بھی میری نہیں ہوسکتی تھی۔

میرا قیامت ناچتی تھی اور اس سے بڑی آفت اس کی آواز تھی۔ تان اڑاتی تو اس کے گلے کی سبز رگیں تانت کی طرح تن جاتیں۔ میرا بائی کے بھجن سناتی تو عبادت کی، اگر اور صندل کی خوشبو آتی، مندر میں کوئی آرتی اتارتا رہتا۔ رانا جی نے وش کا پیالہ بھیجا، پیالہ دیکھ میرا ہانسی رے...... یہ بھجن میں نے اسے کشتی میں گاتے سنا تھا اور پانی میں روشنیوں کا، رات اور رسیلی آنکھوں کا عکس دیکھا تھا۔ ان رسیلی آنکھوں کا قصیدہ کجن بیگم کی آواز پڑھتی رہی تھی، جن کے لانبے لانبے کیس، رسیلی انکھیاں۔ ہوا اس کے بال اڑاتی رہی تھی اور اس کی آواز پانی میں آگ لگاتی رہی تھی، پیالہ دیکھ میرا ہانسی رے۔

اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا، وہ رقص کا عالم تھا، جس میں ہر جنبش اس تیزی سے ہوتی ہے کہ وہ اپنی تفصیل میں نہیں، اپنے تاثر میں یاد رہتی ہے۔ اس لیے کچھ باتیں مجھے یاد ہیں، کچھ بھلا بیٹھا ہوں۔

سلیم سنگھ اور میرا کی شادی پہلے رجسٹریشن آفس میں ہوئی اور پھر سلیم سنگھ کے ایک دوست کے گھر پھیرے ہوئے۔ گھر عورتوں اور مردوں سے بھرا ہوا تھا، سانولی سلونی لڑکیوں کے رنگین گھاگھرے، ان کے ٹھمکے، ان کے ذومعنی جملے، ایک لڑکی راجستھانی میں کوئی تیز تیکھا گیت گا رہی تھی جس کا مطلب کچھ یوں تھا کہ اے

مونچھوں والے نواب تو میرا دل لے گیا۔ شراب بہہ رہی تھی، میں اس محفل میں تھا اور نہیں تھا۔ ان دونوں نے جب آگ کے گرد پھیرے لگائے تو میں انہیں ایک ٹک دیکھتا رہا، سلیم سنگھ کی ریشمی شیروانی، اس کا نارنجی صافہ، اس کی پنڈلیوں میں پھنسا ہوا سفید چوڑی دار پاجامہ اور دوسری طرف وہ تھی جو صرف رنگ ہی رنگ تھی، خوشبو ہی خوشبو تھی، ایسے ہی جوڑوں کو دیکھ کر بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں کہ چشم بددور و چشم بد بیں دور...... میں انہیں حسرت سے دیکھتا رہا، یہ میں تھا، وہ میری تھی، وہ میری نہیں تھی۔ میں شادی کو تجارت سمجھتا تھا، وہ اسے عبادت جانتا تھا...... میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں اس لڑکے کے لیے رو رہا تھا جو الہ آباد کے ایک چھوٹے سے گھر میں کھری کھاٹ پر لیٹ کر رات کی تنہائی میں تاروں سے باتیں کرتا تھا۔ ہم کب اپنا ہاتھ، خود اپنے ہاتھ سے چھڑا لیتے ہیں، ہم کب اپنے اندر سے نکل کر کہیں اور چلے جاتے ہیں۔

پھیرے پورے ہوئے تو میں نے اسے بدھائی دی، میرا کو دعائیں اور ایک مخملی تھیلی دی اور جلدی سے وہاں سے نکل آیا۔ اس رات میں نے کوئی ٹیکسی نہیں روکی، کسی ٹیوب اسٹیشن کا رخ نہیں کیا، بس چلتا رہا اور سوچتا رہا۔ وہ باتیں جو اس رات کے بعد میں نے شاید کبھی نہیں سوچیں۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو پانے کے سفر پر نکل گئے۔ ان دونوں نے اپنے دستخطوں سے پیرس، وینس اور روم سے مجھے پوسٹ کارڈ بھیجے، جنہیں دیکھ کر، جنہیں پڑھ کر میں خاک و خاکستر ہوتا رہا۔

میرا اور سلیم واپس آئے تو نہالوں نہال تھے، ایک دوسرے کے رنگ میں رنگے ہوئے۔ سلیم سنگھ میں مجھے اپنا عکس نظر آتا تھا، میں اس سے ملنے کے لیے بیقراری سے جاتا تھا جیسے کچے دھاگے سے سرکار بندھے جاتے ہیں لیکن اب ہم دونوں کے درمیان جدائی پڑ گئی تھی۔

پہلی ملاقات ہوئی تو سلیم سنگھ نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنی شادی کی تصویریں

اور میرج سرٹیفکیٹ کی کاپی گھر بھیج دی تھی اور وہاں سے پیغام آ گیا ہے کہ اب وہ کبھی جے پور کا رخ نہیں کرے۔

''کچھ دنوں میں تمہارے پتاجی کا غصہ یقیناً ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''میرے دل پر ماتاجی کا خیال آرے چلاتا ہے۔ ان پر کیا گزری ہوگی۔'' اس کی آواز اداس تھی۔

''یہ بات تو تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھی۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''اس بنی ٹھنی کے سامنے کوئی بات یاد رہ سکتی ہے؟'' اس نے بیچارگی سے مجھے دیکھا اور لاجواب کر دیا۔

وہ دونوں ایک نسبتاً بڑے فلیٹ میں منتقل ہو گئے تھے۔ سلیم سنگھ کی کئی تصویریں بک گئی تھیں اور اس نے گھر کے لیے بہت سی چیزیں خریدی تھیں لیکن ایک کمرے میں وہی بے ترتیبی اور بکھراؤ تھا جو سلیم کے مزاج کا حصہ تھا، باقی گھر بنی ٹھنی کا تھا، اسی کی طرح سجا سجایا۔ پھر میری اس کی چند ہی ملاقاتیں ہوئیں۔ اب میں اس کے یہاں جاتے ہوئے جھجکتا تھا۔ ان ہی دنوں معلوم ہوا کہ میرا دو مہینے کے لیے واپس ہندوستان جارہی ہے۔ وہاں کئی شہروں میں تھیٹر فیسٹول ہو رہا تھا، میرا اپنے تھیٹر گروپ کی فرمائش پر نہ چاہتے ہوئے بھی جارہی تھی۔

اس کے چلے جانے کے بعد بھی ہم دونوں کی ملاقاتوں میں اضافہ نہیں ہوا۔ وہ سنجیدگی سے تصویریں بناتا رہا جبکہ میری واپسی کے دن قریب تھے سو میں اپنا سامان سمیٹنے اور اپنی بیوی اور اس کے رشتہ داروں کی فرمائشیں پوری کرنے میں لگا رہا۔

وہ رات مجھے یوں یاد ہے جیسے ابھی کی بات ہو۔ اس رات میں دیر سے گھر پہنچا تو سیڑھیوں پر سلیم سنگھ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ نشے میں ڈوبا ہوا تھا اور رو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مجھ سے لپٹ گیا اور کچھ کہنے لگا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میں اسے اندر لے گیا، اس کے سر پر پانی بہاتا رہا، پھر میں نے اسے فریش لائم کا ایک گلاس

پلایا۔ تب وہ اس قابل ہو سکا کہ مجھے کچھ بتائے۔

اس کی بات جب میری سمجھ میں آئی تو میں بھی رو رہا تھا۔ میرا ایک ایکسی ڈینٹ میں ختم ہو گئی تھی۔

''ہم دھواں سوائی صاحب ...... ہم دھواں۔'' وہ اپنی بات پوری کر کے پھر چیخیں مارنے لگا۔

بنی ٹھنی کو بھی موت آ سکتی ہے؟ یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ تو میرا تھی ...... رانا جی نے وش کا پیالہ بھیجا، پیالہ دیکھ کر میرا ہانسی رے ...... اور پھر سلیم سنگھ کی چیخوں کے ساتھ میری چیخیں بھی شامل ہو گئیں۔ وہ اس کے لیے رو رہا تھا اور جو پور پور اس کی تھی اور میرے آنسو اس کے لیے تھے جو پل چھن کے لیے بھی میری نہیں ہوئی تھی۔

وہ رات کس طور گزری، مجھے یاد نہیں۔ یاد ہے تو اتنی سی بات کہ سلیم سنگھ نے ہچکیوں کے درمیان یہ بتایا کہ میرا جب رخصت ہوئی ہے تو اکیلی نہ تھی، وہ ماں بننے والی تھی، اس کا بچہ اس کے ساتھ تھا۔ میں نے اور سلیم سنگھ کے دوسرے دوستوں نے اسے سمجھایا کہ کلکتہ چلا جائے، میرا کا بھائی اسے کلکتہ لے جانا چاہتا تھا کہ وہ میرا کے انتم سنسکار میں شریک ہو جائے لیکن اس کی ''نہیں'' ہاں میں نہیں بدلی۔

''میں نے اسے زندہ دیکھا تھا، چاہا تھا، برتا تھا اب اسے آگ کی چادر اوڑھ کر راکھ ہوتے کیسے دیکھوں۔'' اب اس کی آنکھیں آنسو سے اور اس کی آواز کسی تاثر سے خالی تھی۔

میرے جانے کی گھڑی سر پر تھی اور چاہنے کے باوجود میں اپنا وقت سلیم سنگھ کے ساتھ نہیں گزار سکا تھا۔

میں اس سے آخری بار ملنے گیا تو اسے دیکھ کر دل کٹ گیا۔ وہ جس کی پور پور سے زندگی پھوٹتی تھی، جس کی آنکھیں ہنستی تھیں، جس کی آواز میں پھلجڑیاں پھوٹتی تھیں، وہ اب ایک کھنڈر تھا۔ رنگ جھلس گیا تھا، آنکھوں کے گرد حلقے اور آواز میں تھکن۔

''میں تمہارے ساتھ چلوں؟'' اس نے اچانک مجھ سے پوچھا، اس کی آنکھیں سوالی تھیں۔

میں خاموش رہا اور میری خاموشی ہی میرا جواب تھی۔

اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا ''ہاں ٹھیک ہے سوائی صاحب، تم اپنی راہ جاؤ، ہم اپنی راہ لیں گے۔''

''ہم سے کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے اسے ٹوکا۔

''تین کے لیے تو ہم ہی کہا جاتا ہے۔'' اس نے کچھ عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹے تو خاصی دیر تک لپٹے رہے۔ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا اور جانے میں کن خیالوں میں گم تھا۔ مجھے اب کچھ یاد نہیں۔

میں چلا آیا، مجھے اپنی پیکنگ کرنی تھی، زیادہ سامان تو میں دو دن پہلے ہی ایر کارگو سروس سے بھیج چکا تھا۔

اس وقت صبح کے شاید سات بجے تھے جب میری آنکھ ٹیلی فون کی گھنٹی سے کھلی۔ دوسری طرف سے سلیم سنگھ کا ایک دوست بول رہا تھا۔

''خیریت تو ہے؟'' میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور اس بات پر بھی حیران نہیں ہوا کہ اسے میرا نمبر کہاں سے ملا تھا۔

''آپ فوراً سلیم سنگھ کے فلیٹ پر آجائیں۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں منہ پر چھپکا مار کر اور ٹیکسی پکڑ کر اس کے یہاں پہنچا۔ سڑک پر ایمبولینس اور پولیس کی گاڑیاں دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا۔

دروازے کے باہر ہی سلیم سنگھ کے کئی دوست کھڑے تھے، سب کے چہرے ستے ہوئے تھے، آنکھیں سرخ ...... ایک نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ ایک پولیس والے نے مجھے روکنا چاہا لیکن تعارف کرانے پر مجھے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔

وہ اپنے اور میرا کے بستر پر لیٹا تھا، چہرے پر سکون اور گہری نیند تھی، سفید لیس کی چادر پر سرخ رنگ کے دھبے تھے، جو اب سیاہی مائل ہو گئے تھے۔ یہ رنگ اس کی

کٹی ہوئی کلائی سے نکلا تھا اور چادر پر نقش و نگار بنا گیا تھا۔

اس نے کہا تھا کہ ہم راجپوت رنگوں سے کھیلتے ہیں، اس نے اپنے وجود سے رنگ کی آخری بوند بھی نچوڑ لی تھی۔ میں ساکت صامت کھڑا اپنے آپ کو دیکھتا رہا۔ یہ میں تھا جو بستر پر تھا، یہ میں تھا جو کھڑا ہوا تھا اور خود کو دیکھ رہا تھا...... میں اسے چھونے کے لیے جھکا تو پولیس والے نے مجھے روک دیا۔ میں فرش پر بیٹھ گیا۔ وہ ننگے پیر تھا اور اس کے دونوں پیر مسہری سے کچھ نیچے لٹکے ہوئے تھے۔ میں ان پیروں کو دیکھتا رہا جسے پھیرے لگانے کے بعد بنی ٹھنی نے جھک کر ہاتھ لگایا تھا۔ اس نے جو کچھ بھی کیا تھا، مجھ سے آخری ملاقات کے بعد کیا تھا، رات کو اگر میں اسے اپنے ساتھ لے جاتا، اگر میں اس کے ساتھ رہ جاتا۔ میں اس کے پیروں پر سر جھکائے سوچتا رہا۔

اس کے لیے میری آنکھ سے ایک آنسو نہیں نکلا، جب اسے کریمیٹوریم لے جایا گیا، تب بھی نہیں۔ لیکن جب اس کے سرہانے سے ملنے والی چند سطری وصیت کے مطابق بنی ٹھنی کا پورٹریٹ مجھے دیا گیا تو میں دھاڑیں مار مار کر رو دیا۔ وہ پورٹریٹ میں نے اپنے گھر میں نہیں لگائی ہے، اسے بہت احتیاط سے اپنے سیف میں رکھ دیا ہے۔ میں ان جودھ پوری آنکھوں کو دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ میں ان رنگوں کو کس دل سے دیکھوں جنہیں سلیم سنگھ نے جانے کن پھولوں، چھالوں اور شاخوں سے کشید کیا تھا۔ نہیں، وہ اس کی نہیں میری بنائی ہوئی تصویر ہے، میں اس تصویر کو سب کی نگاہوں سے چھپا کر رکھتا ہوں اور سلیم سنگھ کی یاد بھی میرے اندر کہیں رہتی ہے۔ میں نے کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا لیکن میں تازہ رنگوں کی خوشبو سے رانا سلیم سنگھ کی یاد کو کبھی جدا نہ کر سکا...... اور کیسے جدا کروں کہ جب اس کی یاد آتی ہے تو میں خود کو یاد کرتا ہوں، اپنے خواب یاد کرتا ہوں، پھر ان خوابوں کو شراب میں ڈبونے لگتا ہوں۔

❀❀❀❀❀

گُم گُم بہت آرام سے ہے

میری دلاری دادی ماں

نمشکار

کئی ہفتوں بعد آج جب میں کابل واپس پہنچی تو ڈاک ملی۔ گھر سے آپ کے علاوہ بھی کئی چٹھیاں آئی ہیں۔ ماتاجی اور بھیا کی، اوما دیدی اور سشمتا کی۔ پر سب سے پیارا پتر آپ کا ہے جس میں آپ نے اتنے دنوں سے چٹھی نہ لکھنے پر مجھے کونے میں منہ دے کر کھڑا کر دینے، کان مروڑنے اور مرغا بنا دینے کی دھمکیاں دی ہیں۔ آپ کی یہ ساری ڈانٹ پھٹکار پڑھ کر مجھے لگا جیسے میں چھوٹی سی ہوگئی ہوں اور آپ کی گود میں چڑھی بیٹھی ہوں۔ آپ اپنی جھولا کرسی میں ہل رہی ہیں اور آپ کے ساتھ میں بھی جھول رہی ہوں۔ آپ مجھے کہانیاں سنا رہی ہیں۔ برابر میں رکھی ہوئی تپائی پر سفید چینی کا بڑا سا پیالہ دھرا ہے جس کا کنارا آپ کی آب رواں کی ساڑی کے کناری جیسا نیلا ہے۔ پیالے میں سے آپ اخروٹ، کشمش یا بادام کا دانہ اٹھا کر میرے منہ میں رکھ دیتی ہیں، میں شرارت سے آپ کی انگلیاں دانتوں میں دبا لیتی ہوں۔ آپ مجھے گھورتی ہیں اور پھر مجھے اپنے بیتے جنموں کی کہانیاں سنانے لگتی ہیں، جب آپ ہنس تھیں اور اڑتی ہوئی کیلاش کی چوٹی پر جا اتری تھیں، جب آپ مچھلی تھیں اور گنگا، جمنا، سرسوتی اور ساردا میں تیرتی پھرتی تھیں، جب آپ ہزار پتوں والا کنول تھیں اور آپ کی سندرتا دیکھنے اور آپ کی سگندھ سے مست ہونے کے لیے راجے مہاراجے آتے تھے۔ اور ایک تو بالکل

سچ مچ کا قصہ تھا۔ آپ کے بچپن کی کہانی جو کابل کے بنجارے رحمت کی تھی، پہلی مرتبہ اسے دیکھ کر آپ ڈر گئی تھیں اور سمجھی تھیں کہ اس کی جھولی میں چھوٹے چھوٹے بچے بھرے ہوئے ہیں، پھر آپ کی اس سے دوستی ہوگئی تھی۔ وہ آپ کی باتیں سنتا اور آپ کا چھوٹا سا آنچل بادام، کشمش اور اخروٹ سے بھر دیتا، ایک دن اس نے آپ سے کہا تھا کہ اس کی چھوٹی سی جھولی میں بڑا سا ہاتھی ہے۔ آپ نے بتایا تھا کہ جس دن رحمت بابا آٹھ برس کی جیل کاٹ کر آیا اسی دن آپ کے پھیرے ہونے والے تھے، وہ کسی دوسرے بنجارے سے آپ کے لیے میوہ مانگ کر لایا تھا اور آپ کو وہی میوہ دان کر کے چلا گیا تھا۔ اس کا قصہ جب آپ نے مجھے پہلی بار سنایا اور آپ کی آنکھوں میں آنسو آئے تب میں نے جانا تھا کہ بڑے بھی بچوں کی طرح رو سکتے ہیں۔ آپ نے بتایا تھا کہ رحمت بابا کی بھی آپ برابر کی ایک بیٹی تھی جو کابل میں رہتی تھی۔ اس کے پاس اس کی تصویر اتروانے کے لیے پیسے نہ تھے یا شاید اس زمانے میں فوٹو گرافر کابل میں نہ پائے جاتے ہوں، تو اس نے اپنی بیٹی کے ہاتھ کا رنگین چھاپا ایک کاغذ پر لے لیا تھا اور اس کاغذ کو سینے سے لگائے پھرتا تھا، بالکل اسی طرح جیسے پتا جی میری تصویر اپنے والٹ میں رکھتے تھے۔ آپ کے پتا جی اور میرے بڑے نانا جی نے رحمت بابا کو کابل جانے اور بیٹی سے ملنے کے لیے کچھ رقم بھی دی تھی جس پر بڑی نانی جی بہت ناراض ہوئی تھیں۔ آپ نے بتایا تھا کہ اس کے بعد پھر وہ کبھی نہیں آیا۔

ان دنوں جب درد سے چیختے ہوئے، خون میں ڈوبے ہوئے گھائل یا دم توڑتے ہوئے لوگ میرے پاس لائے جاتے ہیں تو میں سوچتی ہوں کہ اب سے ستر برس پہلے اگر آپ نے رحمت بابا کی جھولی کے بادام اور پستے نہ کھائے ہوتے، اگر میرے بڑے نانا جی نے اس کی کہانی نہ لکھی ہوتی تو کیا میں یہاں کابل یا قندھار میں، ہرات یا ہلمند میں ہوتی؟ شاید نہیں۔ بلکہ یقیناً نہیں۔

پچھلے اکتوبر کے وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہیں جب کابل پر امریکی ہوائی جہازوں نے بم گرانے شروع کیے تھے اور ٹیلی وژن پر وہ بمباری دکھائی جانے لگی تھی۔ آپ نے

اپنی جھولا کرسی برآمدے سے اٹھوا کر لاؤنج میں رکھوالی تھی اور سارا وقت ٹیلی وژن کے سامنے بیٹھی رہتیں۔ ماتا جی، سشمتا، بھیا سب ہی ناراض ہوتے کہ آخر آپ کیوں اپنی آنکھوں کے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔ یہ تو میں تھی جو اصل بات جانتی تھی، آپ کی دوستی تو بس مجھ سے رہی ہے یا شاید میں نے ہوش سنبھالتے ہی آپ کو اپنی جاگیر سمجھ لیا تھا اور کسی کو آپ کے قریب پھٹکنے نہیں دیا تھا۔ ظالم جاگیرداروں کی طرح میں نے ہمیشہ آپ سے پریم کا لگان پائی پائی کر کے وصول کیا۔ کوئی آپ کو اس طرح جانتا ہی نہیں جیسے میں جانتی ہوں۔ ساٹھ برس سے بھی پہلے بڑے نانا جی نے رحمت کابلی والا کا جو قصہ لکھا تھا، دنیا والے اس کہانی کے عاشق ہیں۔ پر ہمارے گھر میں آپ کے اور میرے سوا کوئی اس کا ذکر نہیں کرتا۔ وہ کہانی آپ کو اس لیے یاد رہی کہ آپ اس کی ہیروئن تھیں اور مجھے اس لیے کہ میں نے ان گنی مرتبہ آپ کی گود میں بیٹھ کر وہ قصہ سنا ہے۔

امریکی بمباری کے خلاف کول کتا، شما کیجیے گا، مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ کلکتہ، بمبئی اور مدراس کے نئے نام سن کر آپ کو غصہ آ جاتا ہے، ہاں تو جب کلکتہ کی سڑکوں پر لاکھ لوگوں کا جلوس نکلا تو میں بھی اس میں گئی تھی، ٹیلی وژن پر میری ایک جھلک دیکھ کر آپ بہت خوش ہوئی تھیں اور جلوس میں نہ جانے پر آپ نے بھیا اور سشمتا کو طعنے دیے تھے۔ پھر جب ریلیف ورک کے لیے کابل کے اندرا گاندھی انسٹی ٹیوٹ آف چائلڈ ہیلتھ کی طرف سے ڈاکٹروں کی مانگ آئی اور میں نے والنٹیر کیا تو یہ صرف آپ تھیں جنہوں نے مجھے آشیرواد دی، ورنہ گھر میں تو سب ہی ناراض ہوئے تھے۔ ماتا جی کا غصے سے برا حال تھا ''بھلا چلتا ہوا ہسپتال چھوڑ کر یوں موت کے کنویں میں کود جانا کس وید، کس گیتا میں آیا ہے؟'' اور آپ کی خوشی دیکھ کر انہوں نے کہا تھا ''تمہاری دادی ماں تو سٹھیا گئی ہیں لیکن تمہیں کیا ہوا ہے کہ اس مارا ماری میں جا رہی ہو؟''

مجھے اس بات کا دکھ ہوتا ہے دادی ماں کہ بڑے نانا جی کی اور آپ کی طرح میری ماتا جی آدرش وادی نہیں ہیں۔ وہ ایک پریکٹیکل بزنس وومن ہیں، نہ ہوتیں تو پتا جی کے چلے جانے کے بعد ان کا اتنا بڑا بزنس کیسے سنبھالتیں۔ میں آپ پر اور بڑے نانا جی پر گئی

ہوں، تب ہی جاگتی آنکھوں سپنے دیکھتی ہوں۔

لیجیے دادی ماں، میں تو چٹھی لکھنے کی بجائے کتاب لکھنے بیٹھ گئی۔ شاید ایسا ہے کہ میں نے یہاں آ کر اتنے دنوں میں آپ کے نام کوئی چٹھی نہیں بھیجی تو اب اس کی کمی پوری کر رہی ہوں۔

میں جانتی ہوں کہ کابل آپ کو بن دیکھے ہی اچھا لگتا ہے۔ آپ نے مجھے بتایا ہے کہ بچپن میں آپ نے رحمت بابا کی بیٹی کو اپنی ان دیکھی گوئیاں بنالیا تھا۔ خیالوں میں اس کی گڑیا سے اپنے گڈے کا بیاہ رچاتی تھیں۔ گڈا آپ کا اور گڑیا اس کی، سو گڑیا بیاہ کر کابل سے کلکتہ چلی آتی تھی۔ بڑے نانا جی کہانیاں لکھتے تھے اور آپ ان کی اکلوتی چہیتی بیٹی تھیں، آپ نے اگر اپنا اکیلا جیون کہانیوں سے بہلایا تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ لیکن بڑی نانی جی نے جب آپ سے یہ باتیں سنی تھیں تو ناراض ہوگئی تھیں۔ بھلا ہندو گڈے سے مسلمان گڑیا کا بیاہ کیسے ہوسکتا ہے۔ پھیرے ہوں گے یا نکاح؟ بڑے نانا جی نے یہ بات سنی تھی تو بہت خفا ہوئے تھے "تم عورتوں کو فساد پھیلانے کے سوا بھی کچھ آتا ہے؟ کم سے کم گڈے گڑیا کو تو دین دھرم کے چکر میں مت ڈالو۔" انہوں نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا تھا اور بڑی نانی جی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی تھیں۔ آپ نے یہ بات مجھے ہنس ہنس کر سنائی تھی۔ "پتا جی کا دل بہت بڑا تھا، اس میں ایشور اللہ، ہندو مسلمان سب رہتے تھے۔" آپ نے بڑے نانا جی کو یاد کرتے ہوئے کہا تھا اور جب میں نے میڈیکل کالج میں پہلی مرتبہ Heart Disection کیا تو اس میں بے اختیار اللہ ایشور، ہندو مسلمان کو ڈھونڈا تھا لیکن وہاں تو صرف مسلز، وینز اور آرٹریز تھیں۔

میں جب کابل کے لیے چلی ہوں تو آپ پرارتھنا کرنے برلا مندر گئیں، پھر آپ ناخدا مسجد بھی ہو آئیں۔ گھر میں جب ڈرائیور نے یہ بتایا تو سب حیران ہوگئے تھے۔ "یہ مسجد جانے کی کیا تک تھی؟" ماتا جی نے جھنجھلا کر کہا تھا۔ "ارے مجھے خیال سوجھا کہ یہ مسلمانوں کے ملک جارہی ہے تو اس کی رکھشا کے لیے مسجد ہو آؤں۔ اللہ سے کہہ آؤں کہ میری پوتی کا دھیان رکھیو۔" ماتا جی کا چہرہ آپ کی اس بات کو سن کر لال ہوگیا تھا اور

آپ نے بہت سادگی سے پوچھا تھا ''لو بہو، اس میں کیا برائی ہے۔ میرے پتا جی تو باؤل فقیروں کی منڈلی گھر بلاتے تھے۔ جھوم جھوم کر ان کے بھگتی گیت سنتے تھے، دان پُن کرتے تھے۔'' آپ کی یہ بات سن کر ماتا جی تیز قدموں سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم سے نکل گئی تھیں اور میں سب کی نظروں میں چور بن گئی تھی جس کی وجہ سے یہ ساری تناتنی ہوئی تھی۔

میری محبت میں آپ مندر گئیں، مسجد گئیں، حالانکہ خود تو آپ کچھ ناستک سی ہیں، صبح شام دیوی دیوتاؤں سے آپ کا جھگڑا چلتا ہے، لوگ کہتے ہیں کہ بڑے نانا جی بھی بالکل ایسے ہی تھے۔ تب ہی تو میرے ساتھ بھی خاصی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ میری سکھیاں شاید اسی لیے مجھے گڑبڑ جھالا کماری کہتی ہیں۔ آپ نے ایشور اور اللہ سے ڈائریکٹ ڈائلنگ پر بات کر کے بہت اطمینان سے مجھے کابل بھیج دیا، شاید ایک مرتبہ بھی آپ خواب میں اس شہر کو دیکھ لیتیں تو مجھے کبھی نہ آنے دیتیں۔ یہاں ہر گھر کی دیوار پر موت کا سایہ ہے، ہر گلی اور ہر بازار میں خون کی لکیریں ہیں۔ رحمت بابا تو جانے کب کا رخصت ہوا، اس کی بیٹی بھی اب کہیں نہیں رہی ہوگی۔ اس کی اولادیں جانے سوویت سینکوں کی گولی سے چھلنی ہوئیں یا امریکی بمباری سے، یا شاید فاقے سے مر گئی ہوں۔ یہاں ہر طرف تباہی کا راج ہے، اس ملک کا ہر شہر کھنڈر ہے۔ میں گھر سے چلی ہوں تو آپ نے میرے ہاتھوں کو پیار کرتے ہوئے کہا تھا ''ان سے سارے گھاؤ سی دینا۔'' لیکن دادی ماں یہاں میں گھاؤ سیتے سیتے تھک گئی پر گھائل ختم نہیں ہوتے۔

میں نے ان مہینوں میں آپ کو یا کسی کو بھی کوئی چٹھی نہیں بھیجی تو اس لیے کہ ہمیں تو نوالہ کھانے اور نیند لینے کی فرصت نہیں تھی۔ ہندوستانی، جرمن اور جاپانی ڈاکٹروں کی ہماری ٹیم شہر شہر پھرتی رہی ہے۔ ہم صبح سے شام تک اور رات کو جنریٹروں کی روشنی میں بچوں، عورتوں اور مردوں کے بدن سے کلسٹر بم کے ٹکڑے اور ریزے چنتے رہے، بارودی سرنگوں سے اڑ جانے والے ہاتھوں اور پیروں کے گھاؤ سیتے رہے۔ خون کی بُو میرے اندر بس گئی ہے۔ پہلے پہل میرا جی چاہا کہ اس بُو سے چھٹکارے کے لیے اپنے ہاتھوں اور کپڑوں پر خوشبو کی آدھی شیشی انڈیل لوں، لیکن پھر مجھے شرم آئی۔ جنہیں

مہینوں اور برسوں سے ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھانا نہ ملتا ہو، جن کے نتھنوں میں صرف خون اور بارود کی بُو ہو، ان کے بیچ رہتے ہوئے، صاف پانی سے گندے ہاتھ دھونا بھی نوابی ٹھاٹھ لگتا ہے۔

ایک سمے تھا دادی ماں کہ بامیان اور بلخ تک ہمارے اشوک اور کنشک کا راج تھا۔ لیکن دھرتی پر کب کسی ایک راجا کا راج رہا ہے۔ عرب آئے، ترک آئے، چنگیز خان کی فوجیں آئیں، اس نے اپنے پوتے کو بامیان فتح کرنے کے لیے بھیجا لیکن وہ لڑکا لڑائی میں کام آیا۔ چہیتے پوتے کی موت چنگیز خان کے لیے اتنا بڑا صدمہ تھی کہ اس نے بامیان کی وادی میں کسی ایک جان دار کو جیتا نہ چھوڑنے کی سوگند کھائی۔ سو کوئی مرد، عورت، بچہ، بوڑھا جیتا نہ چھوڑا گیا۔ حد تو یہ ہے کہ ماؤں کے پیٹ چیر کر ان کے بچے نکالے گئے اور ٹکڑے کر دیے گئے۔ بامیان کی گلیوں میں پھرنے والے کتے، بلیاں زندہ نہیں چھوڑے گئے اور اس کی ہواؤں میں اڑنے والے پرندے بھی تیروں سے چھید دیے گئے۔

ہم بامیان گئے تو کچھ دیر کے لیے وہاں گئے جہاں پہاڑوں کی اونچی اونچی چٹانوں کو تراش کر مہاتما بدھ کی مورتیاں بنائی گئی تھیں۔ چنگیز خان نے پوتے کے انتقام میں بامیان کا کوئی جاندار جیتا نہیں چھوڑا تھا۔ طالبان نے اپنا غصہ پتھر کی مورتیوں پر نکالا۔ میں نے ایک جاپانی ڈاکٹر کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ لیکن میری آنکھوں میں نمی بھی نہیں آئی۔ آپ خود سوچیں دادی ماں کہ جنھوں نے اپنے جیتے جاگتے لوگ، اپنی پوری نسل خود اپنے ہاتھوں سے تباہ کر دی، ان سے اس بات کی کیا شکایت کہ انھوں نے مہاتما بدھ کی وہ مورتیاں ڈائنامائٹ سے، توپ کے گولوں سے کیوں اڑا دیں۔

چنگیز خان اور اس جیسے دوسرے بادشاہوں، راجوں، مہاراجوں کا غصہ ان شہروں پر اترتا تھا جو ان کے راستے میں آتے تھے اور ان کی فوجوں کے خلاف ہتھیار اٹھاتے تھے لیکن دادی ماں امریکہ کا غصہ تو قندھار سے قندوز اور خوست سے قلعۂ جنگی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے لڑاکا ہوائی جہاز تورا بورا اور طالقان پر بمباری کرتے ہیں۔ یہاں کی دھرتی میں بارودی سرنگیں یوں بوئی گئی ہیں جیسے کسی کھیت میں بیج چھڑک دیے جاتے ہیں۔

موت کے بیج۔ بچے، بوڑھے، مرد اور عورتیں سب ہی ان کا نوالہ بنتے رہتے ہیں۔ جن کے ٹکڑے اڑ گئے، لوگ انہیں خوش نصیب سمجھتے ہیں، ورنہ یہاں کسی کا ایک ہاتھ نہیں اور کوئی دونوں ہاتھ کھو بیٹھا ہے، کسی کی ٹانگیں نہیں رہیں۔ میں نے وہ بھی دیکھے جن کے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر غائب ہیں۔ یوں جانیں کہ جیتا جاگتا انسان گوشت کا ایسا لوتھڑا بن گیا ہے جسے بھوک لگتی ہے، جو سوچ سکتا ہے اور لمحہ لمحہ اپنے ہونے کا دکھ بھوگتا ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ مجھے برسات سے کیسا عشق تھا، جہاں چھینٹا پڑا اور میں باؤلی ہوئی۔ ماتا جی سے کیسی جھڑکیاں سنتی تھی۔ بس نہیں چلتا تھا کہ بارش کے ساتھ میں بھی ندی نالوں میں، دریا میں چل نکلوں۔ ہاتھ پاؤں مٹی میں سنے ہوئے، کپڑوں سے پانی ٹپکتا ہوا۔ آپ ساڑی کا پلو اڑسے ہوئے میرے پیچھے آواز دیتی پھرتیں ''اری گُم گُم، چل اندر چل، اشنان کرکے کپڑے بدل، بیمار پڑ جائے گی۔'' ساتھ ہی آپ ہنستی جاتیں، بڑبڑاتی جاتیں، ''اس گھر میں بس ایک گُم گُم ہے جس کا دھرتی سے سچا ناتا ہے، ورنہ میرے گھر کے سارے بچے ولایتی ہوگئے، کھڑکیوں سے جھانک کر مینہ کا برستا ہوا جھالا دیکھ لیتے ہیں۔ رسوئیا نے دال بھری کچوریاں تل دیں تو انہیں میز پر بیٹھ کر کھالیا، لو بھیا برسات کے مزے لوٹ لیے۔ ارے بچے بھلا کہیں ایسے ہوتے ہیں۔''

ہم دونوں جب پانی میں بھیگتے ہوئے، چھپ چھپ کرتے اندر آتے اور چمکتی ہوئی ٹائلوں والا فرش ہمارے ہر قدم سے گندا ہوتا تو ماتا جی چپ چاپ ہمیں دیکھتی رہتیں۔ آپ ان کی ساسو ماں تھیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ خود بڑی ٹھکرائن تھیں۔ بڑے ناناجی دکانیں، مکان، باغ، بغیچے اپنے دیہانت سے پہلے سب آپ کے نام لگا گئے تھے۔ بھلا کس کی مجال تھی کہ آپ سے کچھ کہتا۔ ماتا جی آپ سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں، اس لیے شامت رگھودا کی آتی جنہیں وہ چیخ چیخ کر فرش صاف کرنے کا حکم دیتیں۔ ایسے میں آپ چپکے سے میرے کان میں کہتیں ''دیکھ گُم گُم دیکھ، تیری ماں کے کان سے دھواں نکل رہا ہے۔'' میں ٹھی ٹھی کرکے ہنستی اور نیچی آواز میں فائر بریگیڈ بلانے کا مشورہ دیتی۔ تب آپ میرا کان مروڑتیں ''منہ بند رکھ، تیری ماں نے سن لیا تو

تجھے کھانا نہیں ملے گا''، ''پھر کیا ہوا دادی ماں آپ اور میں ٹالی گنج کلب چلیں گے''،
''ٹالی گنج کلب چلیں گے'' آپ میری نقل اتارتیں پھر دھیمی آواز میں ڈانٹتیں ''اور وہاں
جا کر تین دن کا کھانا تو آدھے گھنٹے میں ٹھونس لے گی، پھر پیٹ پکڑے پھرے گی۔ اس
کے بعد ڈاکٹر بنرجی کو بلاؤ، ہسپتال لے کر بھاگو۔ نا بابا تو بھوکی ہی بھلی۔'' ''آپ تو
دادی ماں بالکل کنجوس مارواڑی ہیں۔ ارے تھوڑا سا پستہ بادام دے دیں گی تو کال
نہیں پڑ جائے گا۔'' میں ٹھنکتی، پھر مجھے کاجو یاد آ جاتے، بھنے ہوئے خستہ نمکین کاجو، بالکل
سنہرے رنگ کے۔ لیجیے یہ سب کچھ یاد کرتے ہوئے اس وقت بھی میرے منہ میں پانی
آ گیا ہے۔ ''ہائے دادی ماں۔ مجھے کاجو کی بھوک لگی ہے۔ آپ کی الماری میں شیشے کا
مرتبان بھرا ہوا ہے۔'' میری آنکھیں جگنو کی طرح چمکنے لگتیں۔ آپ پہلے مجھے گھورتیں،
پھر میری پیٹھ پر ایک ہلکا سا دھموکا جڑتیں ''میری الماری میں کیا ہے، تجھے کیسے معلوم؟
بڑی شرلک ہومز بنی پھرتی ہے''، ''مجھے سب معلوم ہے، آپ میری دادی ماں ہیں، تو
پھر مجھے کیسے معلوم نہیں ہوگا۔'' میں تیز لہجے میں کہتی۔

لیجیے دادی ماں، میں بھی جانے کہاں سے کہاں نکل گئی۔ شاید گھر مجھے بہت یاد آ رہا
ہے، آپ کی مسہری پر اوندھے لیٹنے کو اور آپ سے بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔
اتنے دنوں بعد آپ سے باتیں کرنے بیٹھی ہوں تو برسات کے پرنالے کی طرح باتیں
شراٹے سے بہتی چلی جا رہی ہیں۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ جب میں یہاں آئی تو
مجھے برسات سے ڈر لگنے لگا۔ یہاں کے بچے برسات میں نہا نہیں سکتے، کاغذ کی ناؤ بنا کر
بہتے پانی میں چلا نہیں سکتے، اس لیے کہ برسات کا تیز پانی بارودی سرنگوں کی جگہ بدل دیتا
ہے۔ وہ جگہ جو پہلے محفوظ تھی، وہاں بارود بچھ جاتی ہے۔

آپ نے مجھے بنگال کی بھک مری کے کیسے بھیانک قصے سنائے ہیں، ایسی بھک
مری کہ جب ماؤں نے دو نوالے بھات کے لیے اپنے بچے بیچ دیے تھے۔ بڑے نانا جی
کے صندوق کے سامان کو دھوپ دکھاتے ہوئے ایک بار آپ نے اس کال سے مرنے
والوں کی تصویریں مجھے دکھائی تھیں۔ فٹ پاتھ پر مرتے ہوئے بچوں، عورتوں اور مردوں

کی تصویریں۔ یوں جیسے شمشان گھاٹ میں مردے انتم سنسکار کے لیے اپنی باری کا انتظار کررہے ہوں۔ یہاں بھی دادی ماں بھوک کا راج ہے۔ میں نے ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے ہوئے ایسے ہزاروں بچے اور عورتیں دیکھیں جنھوں نے سینکڑوں میل کا سفر کیا اور پھر ریلیف کیمپوں سے چند میل کے فاصلے پر گرگئیں، ان میں چند قدم چلنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ بچے اپنی حیران آنکھوں اور عورتیں اپنے پھٹے ہوئے چکٹ نیلے برقعوں کی جالیوں سے نیلے آسمان کو تکتی تھیں۔ اس انتظار میں کہ موت آئے اور اپنے ساتھ بھوک، بیماری اور تھکن سے نجات کا نسخہ لائے۔ یہاں عورتوں کے ساتھ جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہورہا ہے، وہ آپ کو لکھنے بیٹھوں تو جس کاغذ پر لکھوں گی وہ جل جائے گا۔

آپ کو یاد ہوگا جگن ناتھ یاترا کے لیے کیسی تیاریاں ہوتی تھیں۔ آپ میرے لیے لکڑی کا چھوٹا سا رتھ منگواتیں، ساتھ میں جگن ناتھ جی کی، ان کے بڑے بھیا بلرام کی اور چھوٹی بہن سبھدرا کی مورتیاں آتیں۔ آپ سوئی دھاگہ لے کر ان مورتیوں کے لیے چھوٹے چھوٹے ریشمی کپڑے سیتیں، پھر ان پر گوٹے کناری کی ٹنکائی ہوتی۔ رتھ یاترا والے دن منہ اندھیرے باغ سے پھول توڑے جاتے، ہم دونوں اسے مل کر سجاتے اور جب میں نئے کپڑے پہن کر اپنا رتھ لے کر نکلتی تو اڑوس پڑوس کے بچوں کے رتھوں میں میرے رتھ کی شان ہی نرالی ہوتی۔ شوراتری اور دیپاولی پر مٹی کے دیے آتے، میڈیکل اسٹور سے برف کی طرح سفید روئی کا پیکٹ منگایا جاتا، اس روئی سے آپ ان دیوں کے لیے بتی بنتیں، گاؤں سے آیا ہوا اصلی گھی ان دیوں میں پڑتا، پھر رات آتی تو میرے دیوں کی برات جگمگ کرتی، دیوالی، دسہرے پر آپ چاؤ سے میرے لیے شکر کے کھلونے منگاتیں۔ گھوڑے، ہاتھی، رنگ رنگ کی ترکاریاں، منہ میں رکھو تو بتاشے کی طرح گھل جائیں۔ اب تک ان کا مزا میری زبان پر ہے۔ میں لندن، پیرس، زیورچ گھوم آئی، ان سب جگہوں کی بڑھیا چاکلیٹ کھا چکی لیکن آپ کے کھلائے ہوئے شکر کے کھلونوں کے سامنے سب کا مزہ پھیکا رہا ہے۔ میں نے جب کئی طالبان لڑکوں کی مرہم پٹی کی، کچھ کا آپریشن کیا تو انھیں غور سے دیکھتی رہی، جن کے سروں پر بچپن میں کسی گھر کی چھت نہ ہو،

جنہیں اپنی گود میں بٹھا کر کلیجے سے لگانے والیاں اور لگانے والے نہ ہوں، جن کے دانتوں نے رس گلہ اور لڈو کھاتے ہوئے شرارت سے کسی ماں، نانی دادی کی انگلیوں پر کاٹا نہ ہو، جنہیں کسی نے چپکے سے مٹھی بھر بادام اور کشمش نہ دیے ہوں، جنہیں کسی دادی یا نانی نے کہانیاں نہ سنائی ہوں، جن کے لیے کسی ماں نے پکوریاں نہ تلی ہوں اور ملیدہ نہ بنایا ہو، وہ بڑے ہو کر تو پھر دوسروں کا گلا ہی گھونٹتے پھریں گے۔ ان کے من میں مٹھاس اور دلوں میں دکھ سمجھنے کا احساس کیسے پیدا ہوگا۔ دنیا طالبان کو برا بھلا کہتی ہے، میں بھی یہاں آئی تو ان کے لیے میرے دل میں غصہ اور نفرت تھی لیکن یہاں رہ کر وہ میری سمجھ میں آگئے۔ کسی غریب اور بنجر ملک کے بچوں سے جب ان کا بچپن چھن جائے۔ جنہیں بڑی بہنوں نے انگلی تھام کر سہج سہج چلایا نہ ہو، ان سے آنکھ مچولی نہ کھیلی ہو، پھر وہاں طالبان ہی اٹھتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں عورتوں کے نام سے۔

ان دنوں میں جہاں جی رہی ہوں، وہ امریکہ کا وار تھیٹر ہے چنگیز خان کا لشکر بامیان کا زن بچہ کولہو پلوا کر آگے بڑھ گیا تھا لیکن آج کے چنگیز کہیں نہیں جاتے، وہ ڈریکولا کی طرح قوموں کی گردن میں اپنے دانت اتار دیتے ہیں اور خون چوستے رہتے ہیں۔ اپنے ہوائی جہازوں سے موت اور مکھن کی ٹکیاں' بسکٹ کے پیکٹ اور بارودی سرنگیں ایک ساتھ پھینکتے ہیں۔

ایک بار بڑے نانا جی کے صندوق کا سامان، ان کی ڈائریاں، ان کے خط پتر اور تصویریں جب آپ دھوپ دکھا کر واپس رکھ رہی تھیں تو آپ نے مجھے وہ میلا سا کاغذ دکھایا تھا جو آپ کے بیاہ کے دن رحمت بابا کی جھولی سے گر گیا تھا۔ بڑے نانا جی نے وہ سنبھال کر رکھ لیا تھا کہ رحمت اگر کبھی آیا تو اسے دے دیں گے، لیکن وہ پھر کبھی نہیں آیا اور اس کی بیٹی کے چھوٹے سے ہاتھ کا رنگین چھاپا آج بھی بڑے نانا جی کے صندوق میں رکھا ہوا ہے۔

کابل کی گلیوں میں دادی ماں مجھے آپ کے بچپن کا ہیرو تو کیا ملتا، اس کی بیٹی، اس کی نواسیاں اور پوتیاں بھی نہیں ملیں، ملتیں بھی تو کیسے کہ وہ سب گھر کی کال کوٹھریوں میں

خاک ہوگئیں۔ اس کی کسی پر پوتی، کسی پر نواسی کی شاید ہتھیلیاں بھی نہ ہوں جن کے رنگین چھاپے ان کے چاہنے والے باپ اپنے کلیجے سے لگا کر پھریں۔ میں نے ان لڑکیوں کی کلائیوں کے گھاؤ سیے ہیں، جن کی ہتھیلیاں نہیں رہیں، جو اب کبھی عید پر مہندی نہیں لگائیں گی، چوڑیاں نہیں پہنیں گی۔ میری سہیلی رضیہ تو آپ کو اب تک کینیڈا سے کارڈ بھیجتی رہتی ہے۔ ہر عید شب برات پر مہندی لگوانے کے لیے وہ آپ کے پاس دوڑی آتی تھی۔ ''دادی ماں جیسی مہندی آپ نے ہولی پر کُم کُم کے لگائی تھی، ویسی ہی مجھے بھی لگانا'' وہ فرمائش کرتی۔ ''اری باؤلی ہوئی ہے، مجھے بھلا خاک یاد ہے کیسے پھول بوٹے بنائے تھے، بس اب چپکی بیٹھی رہ اور ہاتھ مت ہلائیو'' آپ اسے ڈانٹتیں اور سوئی کی نوک سے اس کی گلابی ہتھیلی پر یوں پھول بوٹے بناتی جاتیں جیسے ریشم سے کڑھائی کر رہی ہوں۔ یہاں ہزاروں لڑکیاں ایسی ہیں جن کی ہتھیلیوں کے لیے اب کبھی عید اور شب برات نہیں آئے گی۔

آپ نے مجھے سنایا تھا کہ پلاسی میں سراج الدولہ بہادر جب کمپنی بہادر کی فوجوں سے ہار گئے اور بنگال پر کمپنی کا راج ہوا تو انگریزوں نے ڈھاکہ کی ململ بننے والے بنکروں کے انگوٹھے کٹوا دیے تھے۔ یہ سناتے ہوئے آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ میں نے آپ کے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا تھا کہ ایسا کیوں ہوا تھا، تب آپ نے بتایا تھا کہ ڈھاکہ کی ململ کا تھان انگوٹھی کے چھلے میں سے گزر جاتا تھا۔ ہمارے بنکروں کی کاریگری کے سامنے مانچسٹر کی ملوں میں تیار ہونے والے کپڑے کا چراغ نہیں جلتا تھا سو انہوں نے ہمارے بنکروں کے انگوٹھے اڑا دیے۔

یہاں جب میں بارودی سرنگوں سے اڑی ہوئی ہتھیلیاں دیکھتی ہوں، ان کے گھاؤ سیتی ہوں تو چھپ چھپ کر روتی ہوں۔ ہم نے تو انگریزوں کو اپنے دیس سے نکال دیا تھا، اب دوبارہ سے ان کے بھائی بند ہمارے آس پڑوس میں کہاں سے آ بیٹھے؟ ہمارے انگوٹھوں، ہتھیلیوں، پیروں اور سروں کی بھینٹ کب تک ان کی چوکھٹ پر چڑھتی رہے گی؟

کالنگا کے میدان میں جیتتے ہوئے اشوک نے جب لاکھ سپاہیوں کی لاشیں دیکھیں تو اس کا دل دنیا سے اٹھ گیا تھا۔ اس روز اس نے صرف اپنی تلوار نہیں توڑی تھی، اس

دن کے بعد ہزاروں میل پر پھیلے ہوئے اس کے راج پاٹ میں ہر سپاہی کی تلوار کو زنگ لگتا رہا تھا۔ آج کے یہ راجے مہاراجے رام جانے کس مٹی کے بنے ہیں کہ دوسرے ملکوں کو اپنے قبضے میں کرتے جاتے ہیں اور پھر بھی دھرتی پر پھیلتے جانے کی بھوک کسی طرح نہیں مٹتی؟ یہ قوموں کو، نسلوں کو کھاتے ہیں اور پھر اگلے ملک کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔ کوروکشیتر کا ایک نیا میدان، ایک نیا وار تھیٹر سجاتے ہیں۔

میں نے دادی ماں لاشوں کے ڈھیر دیکھے، وہ کھیلتے ہوئے بچے جنھیں ہوائی جہازوں سے ہونے والی گولیوں کی بوچھاڑ نے سلادیا تھا، وہ عورتیں جو اپنی جان بچانے کے لیے بھاگی تھیں اور جن کے برقعے اور بدن ایک ساتھ چھلنی ہوئے تھے۔ میں نے ان دلہنوں اور دولہاؤں کے بدن سے گولیاں نکالی ہیں جن کی براتوں کو دہشت گردوں کا ٹولا کہہ کر ان پر گولیاں برسائی گئیں، بم مارے گئے۔

پھر دادی ماں ایک رات مجھ پر عجیب گزری۔ ہم بامیان اور شبرغان سے ہوتے ہوئے دشت لیلیٰ میں کیمپ کر رہے تھے جہاں ٹیلی وژن چینلوں کے اور اخباروں کے لوگوں کی ڈار اتری ہوئی تھی۔ طالبان کی ان Mass Graves کی خبروں اور تصویروں کی تلاش میں جنھیں کنٹینروں میں مزار شریف سے شبرغان لایا گیا اور وہ سب دم گھٹنے سے ہلاک ہوگئے تو انھیں خندقیں کھود کر دشتِ لیلیٰ میں دفن کر دیا گیا۔ برسوں پہلے جب طالبان نے اس علاقے کو فتح کیا تو یہاں کے لوگوں کا قتل عام کیا اور پھر اسے چھپانے کے لیے Mass Graves میں دفن کیا، اب وقت ان کے لیے لٹو کی طرح گھوم گیا ہے، تو ان کا بستر بھی دشت لیلیٰ کی خندقوں میں لگا۔ دشت لیلیٰ کو یوں سمجھیں دادی ماں جیسے ہمارے راجپوتانے کے ریتیلے میدانوں کی کوئی چھوٹی سی آبادی۔ کچے گھروں کی اس بستی پر بھی بمباری ہوئی تھی۔ سو لوگوں کے پاس نہ کھانے کو، نہ سر چھپانے کو۔ ہم ایک دن کے لیے وہاں کچھ زخمیوں کی دیکھ ریکھ کے لیے رکے تھے۔ شام ہوئی اور کام ختم ہوا تو میں تھکن سے نڈھال اپنے خیمے میں پہنچی اور بستر پر لیٹتے ہی سو گئی۔ اچانک کسی آواز سے میری آنکھ کھلی تو خیمے میں اندھیرا تھا۔ یوں لگا جیسے کوئی جانور خیمے کو

اپنے ناخنوں سے کھرچ رہا ہو۔ میں کچھ سوچے سمجھے بغیر ہڑبڑا کر اپنے خیمے سے باہر آ گئی۔ آسمان پر ماگھ کا سبزی مائل نیلا چاند، زمین پر دشتِ لیلیٰ کی ریت، کچھ فاصلے پر Mass Graves اور میری نگاہوں کے سامنے میرے خیمے سے ٹیک لگائے ہوئے ریت پر ایک لڑکا۔ قمیص پر خون کے سوکھے اور تازہ دھبے، آنکھوں میں وحشت اور خوف، سارے بدن سے کانپتا ہوا۔ وہ کسی امریکی گولی کا شکار ہوا تھا، اور اب گرتا پڑتا، چھپتا چھپاتا ہمارے کیمپ تک پہنچا تھا۔ جانے کب زخمی ہوا تھا۔ یہ سوچ کر ہی میرے اعصاب تن گئے کہ شاید اب بھی وہ ہتھیار بند ہو۔ پہلا خیال مجھے کسی گارڈ کو آواز دینے کا آیا۔ لیکن پھر دادی ماں ایسی انہونی ہوئی کہ اسے لکھتے ہوئے اس وقت بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔ آن کی آن میں اس لڑکے کا چہرہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اس نے پیروں کے پاس پڑی ہوئی جھولی سے کچھ نکالا اور میری طرف بڑھایا۔ میں نے اس کے ہاتھ کی طرف دیکھا، اس میں بادام، کشمش اور اخروٹ تھے۔ وہ آپ کو آواز دے رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر اس کے چہرے پر نظر کی، ایشور کی قسم ماگھ کے چاند کی روشنی میں وہاں رحمت بابا تھا، اس کی قمیص پر خون کے دھبے تھے، بڑے نانا جی نے لکھا تھا کہ وہ ماگھ کے مہینے میں گھر لوٹ جاتا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپ کے بچپن کو، بڑے نانا جی کی کہانی کو میں گرفتار کیسے کراتی؟ میں اسے اپنے خیمے میں لے آئی۔ دادی ماں اس رات میں نے موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، اپنے ہاتھوں سے چھوا۔ اس رات میں نے جانا کہ گولی دوست کی ہنسلی میں لگی ہو یا دشمن کی پسلی میں، اسے نکالنا میرا مقدر ہے۔ اس رات اس لڑکے کا گھاؤ سیتے ہوئے میں نہ اس کی سن سکی، نہ اپنی کہہ سکی۔ اس لیے دادی ماں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی زبان نہیں جانتے تھے۔ اس وقت مجھے آپ کا خیال آتا رہا اور ان لوگوں کے قصے یاد آتے رہے جو آپ نے سنائے تھے۔ ٹیپو، سراج الدولہ، بابو کنور سنگھ، لکشمی بائی، حضرت محل ......

اس رات جب پو پھٹنے والی تھی، میں نے اسے ایک تھیلے میں کچھ دوائیں، کھانے کے ڈبے اور کمبل دیا، اور جانے کا اشارہ کیا۔ وہ مجھے دیکھتا رہا، پھر لڑکھڑاتا ہوا اٹھا، وہ

تھیلا اور کمبل کندھے پر ڈال رہا تھا کہ مجھے کچھ خیال آیا، میں نے سرہانے پڑے ہوئے پرس سے کچھ پیسے نکالے، اس نے سر ہلا کر لینے سے انکار کیا، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، میں نے دادی ماں نوٹ اس کے ہاتھ میں رکھ کر مٹھی بند کر دی۔ وہ چند لمحوں تک مجھے دیکھتا رہا، پھر اس نے وہی ہاتھ پیشانی تک لے جا کر مجھے سلام کیا، تھیلا اور کمبل کندھے پر ڈالا اور خیمے سے نکل گیا، میں اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ کہرے اور چاندنی کے غبار میں لپٹا ہوا تنہا وجود۔ چند قدم چل کر وہ پلٹا اور میری طرف دیکھا۔ وہ ہارے ہوئے قبیلے کی آنکھیں تھیں۔ پھر ان سب آنکھوں نے میری طرف سے منہ پھیر لیا اور چلتی چلی گئیں۔ تنہائی اور تاریخ کی اندھی گپھاؤں کی طرف۔ ترائی کے جنگلوں اور دشتِ لیلیٰ میں پھیلی ہوئی گم نام قبروں کی طرف۔ اس لمحے وقت مجھ پر سے سن سن کرتا گزر گیا۔ میری عمر پر لگا کر اڑ گئی۔ اب میں ہزار برس کی ہوں شاید دو ہزار برس کی۔ آپ خوش نصیب ہیں دادی ماں کہ آپ نے تاریخ سے ہار جانے والوں کا قصہ پڑھا ہے، ان کی آنکھوں میں اترا ہوا تنہائی کا زہر نہیں دیکھا۔

رحمت کابلی والا آپ کے بچپن کی سندر سہانی یاد تھا لیکن اس رات وہ آپ کی گُم گُم کو درد کا دوشالہ اوڑھا گیا۔ اچھا ہوا کہ بڑے نانا جی گزر گئے۔ وہ اس زمانے میں ہوتے تو پرتاب سنگھ اور کنچن مالا کی کہانی لکھنے کی بجائے دھرتی کے گھاؤ لکھتے، ان کھوئی ہوئی ہتھیلیوں کا قصہ لکھتے جن پر اب کبھی مہندی نہیں لگے گی۔

یہاں کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا ہے، جنریٹر سے ہونے والی گرمی کے باوجود میرے اندر ٹھنڈک سی پھیل رہی ہے۔ اور کیا لکھوں؟ سب کچھ تو میں نے آپ کو لکھ دیا ہے۔ ماتا جی کو یا گھر میں کسی اور کو کچھ مت بتایئے گا۔ یہی کہیے گا کہ کابل میں گُم گُم بہت آرام سے ہے۔

آپ کی گُم گُم

❖❖❖❖❖

جاگے ہیں خواب میں

لہریں لیتے ہوئے دریا تھے، ان پر تیرتے ہوئے روشن کنول تھے اور بلاوا تھا۔ اُس نے بلاوے سے بچ کر نکلنا چاہا تو دور سے پاپا کی آواز آئی اور وہ ان کی آواز کے ساتھ دریا میں اترتی چلی گئی۔

کنول بجھ گئے، ہر طرف اندھیرا بچھ گیا، اس نے تیر کر کنارے تک پہنچنا چاہا۔ راستے میں گرداب تھے، قحط کے ماروں کی طرح سب کچھ نگلتے ہوئے۔ شہر، دریا، جنگل، راستے، انسان۔ اُس نے چیخنا چاہا لیکن آواز اور لفظوں کو گرداب نے نگل لیا تھا۔

نرم اور مہربان انگلیاں اس کے بالوں سے الجھنے لگیں۔ اُس نے گہرا سانس لیا۔ کنارہ شاید یہیں کہیں تھا۔

''لالہ۔ لالہ۔'' دور سے کسی کی آواز آئی۔ شہد، خوشبو اور روشنی آواز۔

اس نے آنکھیں کھولیں۔ ڈوبتے ہوئے دن کی اداس روشنی پردوں سے چھن رہی تھی اور مما اس پر جھکی ہوئی تھیں۔ ان کی نرم اور مہربان انگلیاں اس کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔

''کوئی خواب دیکھا تم نے؟'' انہوں نے وحشت زدہ آواز میں پوچھا۔

''نہیں مما، میں تو گہری نیند میں تھی۔'' اس نے جھوٹ بولا۔ خوف سے اس کی ہتھیلیاں بھیگی ہوئی تھیں۔

''تمہاری چیخیں اسٹڈی تک جا رہی تھیں۔''

''لیکن میں نے تو کوئی خواب نہیں دیکھا ہے'' لالہ نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی۔

سارہ نے یوں سر ہلایا جیسے وہ اس کی بات پر اعتبار کر رہی ہوں لیکن آنکھوں میں بے اعتباری تھی۔ وہ دو دن پہلے لوٹی تھی، کسی اور دنیا میں کھوئی ہوئی، خیالوں میں گم۔ ان دو دنوں میں کئی بار انہیں یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ کسی دیوار سے باتیں کر رہی ہیں۔ وہ آنے کے بعد کسی سے بھی نہیں ملی تھی۔ چندر شیکھر اس سے ملنے آیا تھا، سوزان نے اسے کئی فون کیے تھے لیکن اس نے دونوں کو ٹال دیا تھا۔ پھر وہ تنگ آ کر گھر آ گیا تھا۔

''لوگ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ تمہاری زبان سے حالات سننا چاہتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں، تمہاری بھیجی ہوئی رپورٹیں چھپ چکیں، اب تم سے ایک رپورتاژ لکھوایا جائے۔'' چندر شیکھر نے سکنجبین کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا تھا۔

''میں کہیں نہیں جانا چاہتی۔ کسی سے نہیں ملنا چاہتی۔ پلیز مجھے آرام کرنے دو''۔ لالہ کی آواز میں روکھا پن تھا۔

''او کے مائی ڈیئر۔ اگر تم آرام کرنا چاہتی ہو تو ٹھیک ہے، لیکن کچھ دیر کو آفس تو آؤ۔'' چندر شیکھر نے اسے غور سے دیکھا۔

''آؤں گی لیکن چند دن بعد۔''

یہ جواب سن کر وہ خاموشی سے چلا گیا تھا۔

''لالہ۔ کہاں تو تم اس کے ایک فون پر آگ کے سمندر میں پھاند پڑیں اور کہاں اب اس سے ڈھنگ سے بات بھی نہیں کر رہیں۔'' ممّا نے قدرے ناراض لہجے میں کہا تھا۔

''ایسی بات نہیں ہے ممّا۔ میں دفتر بھی جاؤں گی۔ رپورتاژ بھی لکھوں گی، سب سے ملوں گی لیکن ابھی کسی بات کو جی نہیں چاہتا۔''

''تم نے وہاں جانے کی ہامی کیوں بھری تھی؟ یوں بھی تم اپنی چھٹیاں گزارنے گئی تھیں۔''

''میں کیسے انکار کر سکتی تھی۔ استنبول اور بغداد میں فاصلہ ہی کتنا ہے؟ سرحدیں چند گھنٹوں بعد بند ہونے والی تھیں اور پھر یہ بھی ہے کہ میں اس علاقے کی تہذیب، تاریخ اور معاشرت سے واقف تھی، پاپا نے مجھے وہاں کی اتنی کہانیاں سنائی تھیں کہ وہ مجھے دلّی کی طرح اپنا لگتا تھا۔''

''لیکن تم تو چھٹی پر تھیں۔''

''کیسی نان پروفیشنل بات کر رہی ہیں مما؟ آپ خود لکھنے والی ہیں، جانتی ہیں کہ لفظ سوچنے والے، لکھنے والے ہر وقت آن ڈیوٹی ہوتے ہیں۔ وہ آخری سانس تک اپنا قلم نہیں رکھ سکتے۔'' لالہ زور سے ہنسی ''اور میں تو جرنلسٹ ہوں''

سارہ جھینپ گئیں، اس وقت وہ انہیں پرانی لالہ لگی، ہنستی ہوئی، چھیڑتی ہوئی۔ ان دو دنوں میں انہوں نے پہلی مرتبہ اسے ہنستے دیکھا تھا۔ ان کے دل کو آرام سا آیا۔

''شام ہو رہی ہے۔ میرے خیال میں اب تم اٹھ ہی جاؤ۔ نہا لو، چائے کے ساتھ کچھ کھا لو۔ یوں بھی اس وقت سوتی رہ جاؤ گی تو پھر رات کروٹیں بدلتے کٹے گی۔'' انہوں نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھیں۔

''جی ہاں، میرا جی بھی چائے کو چاہ رہا ہے، میں شاور لے کر آتی ہوں۔'' لالہ نے پیروں پر پڑی ہوئی چادر ہٹاتے ہوئے کہا اور مما کو باہر نکل کر کمرے کا دروازہ بند کرتے دیکھا تو اسے سکون محسوس ہوا۔ واپس آ کر اُس نے انہیں دیکھا تو دل کٹ گیا تھا۔ پہلے والی مما جانے کہاں چلی گئی تھیں۔ اس کے نہ ہونے کے چند ہفتے انہوں نے انگاروں پر بسر کیے تھے اور اذیت کے وہ دن ان کے چہرے پر اپنے نقش چھوڑتے ہوئے گزر گئے تھے۔ پاپا کے جانے کے بعد ان کی جان لالہ میں اٹکی رہتی تھی۔ اسے پاپا یاد آئے۔ مما کے لیے کچے دھاگے سے بندھے وہ ہندوستان چلے آئے تھے اور پھر یہاں کے رنگ میں یوں رنگے گئے تھے جیسے ان کی پشتوں نے زندگی یہیں بسر کی ہو۔ مما لکھنے والی، وہ رنگ اور برش سے کھیلنے والے۔ اس کی نظر رائٹنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی ان دونوں کی تصویر پر جم گئی۔ مما بنارسی ساڑی کا پلو سنبھالے مسکرا رہی ہیں اور پاپا سیاہ شیروانی اور جودھ

پوری صافے میں راجستھانی رانا لگ رہے ہیں۔ ویسی ہی نوکیلی اور اہتمام سے بنی ہوئی مونچھیں۔ شہر برباد میں پاپا اسے کس قدر یاد آئے تھے۔ آتے ہی وہ ان کی کتابوں میں سے ''دی عریبین نائٹس'' نکال لائی تھی۔ اور پھر ان کی خوشبو اور وہ خود اس کے پاس آ بیٹھے تھے۔ انہوں نے اسے وہ کہانیاں سنائی تھیں جن میں سندباد جہازی تھا، الہٰ دین اور اس کا چراغ تھا، ابوالحسن تھا، قصہ سوتے جاگتے کا۔ اسے ہنسی آئی تھی، پاپا اسے وہی چھوٹی سی بچی سمجھ رہے تھے تب ہی درمیان سے صفحے کے صفحے غائب کر رہے تھے۔

لالہ نے پاپا اور ممّا کی تصویر کے ساتھ رکھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا پھر ہمت کرکے اٹھی اور شاور کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔ پانی اسے زندہ کرنے لگا۔ بچے شور مچا رہے تھے۔ کالے میگھا پانی دے۔ پھر بادل برسنے لگے۔ ہر طرف دھند تھی، اس نے دھند میں جھانکا، شاید کوئی در، کوئی دروازہ کھلا ہو۔ راستہ کہیں نہیں تھا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا اچھنے لگا۔ لالہ نے جلدی سے دیوار کا سہارا لیا۔ دریا کی لہریں اسے اپنی بانہوں میں لیے ہوئے تھیں۔ کچھ سونے کچھ جاگنے کا عالم۔ اس نے اپنے آپ کو تلاش کیا۔ یہ شانے تھے، یہ چہرہ اور یہ گردن۔ ہاں وہ پور پور سلامتی کے ساتھ واپس آ گئی تھی۔ اس نے سر کو جھٹکا، آنکھوں کے سامنے چھائی ہوئی دھند چھٹ گئی۔ وہ تولیہ لپیٹ کر نکلی تو شہر آرام کرسی میں نیم دراز تھی۔

لالہ کے اندر سکون کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس نے لباس پہنا۔ شہر نے ہیر ڈرائیر سے اس کے بال خشک کیے، لالہ نے قد آدم آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ وہ پہلے جیسی ہی تھی ہاں وزن ذرا کم ہو گیا تھا یا شاید کچھ اور بھی بدل گیا تھا۔ کسی نے دروازے پر دستک دی، شہر دستک سنتے ہی پردے کی اوٹ میں ہو گئی تھی۔ وہ اس کے سوا کسی کے سامنے نہیں آتی تھی۔

''کون ہے؟'' لالہ نے بہ آواز بلند پوچھا۔

''ہم رامو ہیں بٹیا۔ بڑی بٹیا یاد کرت ہیں۔'' پورب کے رامو کی آواز آئی۔ وفاداروں کی یہ نسل اب عنقا ہو گئی تھی۔

''رامو چاچا ہم ابھی آوت ہیں۔'' لالہ نے ان ہی کے پوربی لہجے میں ہانک لگائی اور دروازے کی طرف بڑھی۔

کیسی چٹ پٹی چاٹ تھی جو رامو بھیا نے بنائی تھی۔ وہ چٹخارے لے کر کھاتی رہی۔ ممّا اس کی یوں خاطریں کر رہی تھیں جیسے وہ مہمان آئی ہو۔ چائے کی گرم پیالی کو اس نے پینے سے پہلے اپنی ہتھیلیوں کے حصار میں لے لیا۔ تپش۔ اس کا جی گھبرانے لگا۔ ممّا کو کیسے بتائے وہاں کتنی تپش تھی۔ سارا شہر تنور۔ جلتے ہوئے شہر کے بارے میں وہ صرف شہر سے باتیں کر سکتی تھی۔ ان کی ملاقات بھی تو وہیں ہوئی تھی۔ اس کو وحشت سی ہونے لگی، شہر اس کے کمرے میں تنہا تھی، وہ کسی سے ملنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

سارہ، لالہ کی آنکھوں کو پڑھنے کی کوشش کرتی رہیں پھر اچانک انہوں نے اسے کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا۔''ارے یہ تم کہاں چلیں۔ تمہاری تو چائے کی پیالی بھی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔'' ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ٹہلنے کو جی چاہ رہا ہے ممّا'' اس نے گہرا سانس لیا۔

''اس وقت ٹہلنے کہاں جاؤ گی۔ اب تو اندھیرا ہونے والا ہے۔'' سارہ کی نظر کھڑکی سے باہر بھٹکی۔

''بس ذرا لودھی گارڈنز تک۔''

''لیکن لالہ اب تو کچھ دیر میں وہاں سے لوگ پلٹنے لگیں گے۔'' سارہ نے اسے یاد دلایا۔

''میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گی۔'' اس کے لہجے میں اصرار تھا۔

''اچھا تو پھر رامو کو ساتھ لے جاؤ''۔ سارہ نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

''کمال کرتی ہیں ممّا آپ بھی۔ رامو کو ساتھ لے جانے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔'' لالہ کا لہجہ تیکھا تھا۔

''میری جان۔ وہ تمہیں گاڑی میں لے جائے گا تو جلدی پہنچ جاؤ گی، پھر وہی لے آئے گا۔ مجھے بھی اطمینان رہے گا۔'' سارہ نے نرمی سے کہا۔

''کمال ہے۔ کون سوچ سکتا ہے کہ میں ابھی چند دنوں پہلے وار زون میں تھی۔''
لالہ نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں، لیکن یہ وار زون نہیں تمہارا اپنا گھر ہے۔ بس اب تم جاؤ۔ میں راموسے کہتی ہوں گاڑی نکالے۔''

☆☆☆

لودھی گارڈنز میں ٹہلنے کے لیے آنے والوں کی بھیڑ کم ہوتی جارہی تھی، بعض گاڑیاں واپس جارہی تھیں۔

راموبھیا گاڑی سے اتر کر کھڑے ہوگئے، انہوں نے بنڈی کی جیب سے بیڑی کا بنڈل اور ماچس نکالی۔ شعلہ سا لپکا اور وہ دہل گئی تمام عمارتیں سوکھی لکڑی کی طرح جلنے لگیں۔ وہ جلدی سے وہاں سے ہٹ گئی اور بسیرا کرتی ہوئی چڑیوں کے شور میں اور پیڑوں کے گہرے ہوتے ہوئے سائے میں چلنے لگی۔ ہر طرف سے خواب اُمنڈنے لگے، کچھ سونے کچھ جاگنے کا عالم..... اس لمحے بھی اُسے یقین نہیں تھا کہ وہ واپس آگئی ہے، زندہ ہے، موجود ہے، اس کے پیر سلامت ہیں اور اس کا بوجھ اٹھائے ہوئے چل رہے ہیں، اس کے ہاتھ سلامت ہیں جن سے وہ تیز ہوا میں اڑتے ہوئے اپنے بال سنوار رہی ہے، اس کی آنکھیں سلامت ہیں جن سے وہ دل دار اور دل نواز گلیوں، باغوں اور بازاروں کو دیکھ رہی ہے۔ آگ، گولیاں، دھماکے اور خون کے دھبے پیچھے رہ گئے ہیں۔ خستہ تن لاشے کہیں نہیں ہیں، روتے ہوئے اور خون سے لت پت بچوں کو سینے سے لگائے ہوئے، چیختی ہوئی، ڈاکٹروں اور ہسپتالوں کو ڈھونڈتی ہوئی مائیں کہیں نہیں ہیں۔ جنگ زدہ انسانوں کو، ان کے جلتے ہوئے گھروں اور بازاروں کو وہ پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ شہروں کے بدن کے جلنے اور ہڈیوں کے چٹخنے کی آوازیں یہاں نہیں آتیں، شہریوں کے پگھلتے ہوئے جسموں کی بُو یہاں تک نہیں پہنچتی۔

وہ جب تک جاگتی رہتی سب کچھ ٹھیک رہتا لیکن بستر پر لیٹتے ہی مرتے ہوئے لوگوں کی چیخیں، خون کی بساند، دیواروں اور پیڑوں سے چپک جانے والے انسانی بدن

کے چیتھڑے اس کا تعاقب کرنے لگتے۔ بے امان شہر میں نیند اس سے رخصت ہوئی تھی اور جب آتی تو اُس کے ساتھ سر کٹے اور بے دھڑ بچوں کا، بے حرمت کی جانے والی عورتوں اور جلتے ہوئے مردوں کا غول ہوتا۔ وہ چیخیں مارتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ جاتی، چہرہ آنسوؤں سے تر بتر۔ نیند کی گولیوں کا اثر بغداد میں ہی ختم ہو گیا تھا۔ جہاں موت تقسیم کرتی ہوئی گولیاں چل رہی ہوں، وہاں نیند کی گولیوں کی کیا بساط۔ وقت کے دامن میں سب کے لیے صرف ہلاکت کا خوف تھا۔ کوئی ان دیکھی گولی، کسی کلسٹر بم سے نکلے ہوئے آہنی ٹکڑے۔

پھر اچانک چھپتا چھپاتا کوئی عراقی ایک وقت کے کھانے کے لیے، بچے کے دودھ کے لیے اپنے تھیلے میں بھرا ہوا سامان، یا گھڑی سامنے رکھ دیتا، تو اس کا بدن شرمندگی سے سرد پڑ جاتا۔ لیکن امریکی؟ سب کچھ لوٹنے یا تباہ کرنے آئے تھے۔ دعویٰ کائنات کو سمجھنے کا۔ خاندان یا شہر کے نہیں، دنیا کے نودولتیے۔ ان کے پر داداؤں اور سگڑ داداؤں نے جتنی دولت کمائی تھی، اُسے وہ آگ لگا رہے تھے اور ساری دنیا کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے۔

وہ دو زمینوں اور دو زمانوں کے درمیان کھڑی تھی۔ اس نے ان کے درمیان خود کو ڈھونڈا۔ خواب کہاں ختم ہوتا تھا اور حقیقت کہاں سے شروع ہوتی تھی؟ ایک جانی پہچانی آواز آئی اور وہ لڑکھڑا گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا رامو بھیا کھڑے تھے۔

''بٹیا۔ گھر نہیں چلت رہیں، سارے میں اندھیرا پڑ گوا؟''

☆☆☆

رات کے بارہ بج گئے تھے اور شہر اب تک نہیں آئی تھی، اسے شہر سے اپنی پہلی ملاقات یاد آئی۔

وہ حملے کا ساتواں دن تھا۔ خداوند خدا جس نے چھ دنوں میں دنیا بنائی تھی، ساتویں دن آرام کیا تھا۔ ایسا آرام، ایسی گہری نیند جس سے وہ پھر کبھی بیدار نہیں ہوا تھا، تب ہی اس کی بنائی ہوئی دنیا میں اتنا فساد، ظلم، ناانصافی اور سفاکی تھی۔ وہ ہر بات سے بے خبر

عرشِ بریں پر آرام کرتا تھا، فرشِ زمیں پر بارود بچھی ہوئی تھی، نفرت اور ہوس لہریں لیتی تھی، انسان روندے جاتے تھے اور حیوان حکمرانی کرتے تھے۔

وہ حملے کا ساتواں دن تھا جب شام کے دھندلکے میں وہ لوگ اپنی آنکھوں سے شہر کی جلتی ہوئی چتا کو دیکھ کر پلٹ رہے تھے۔ وہ سب ساتھ تھے۔ الیکٹرانک میڈیا اور اخباری دنیا کے بڑے نام۔ کرسٹین امان پور، رابرٹ فسک، ستیش جیکب، سوزان گولڈن برگ۔ دنیا بھر میں پہچانے جانے والے، سب ہی اپنے خیالوں میں گم تھے، سب ہی کے دل آنے والے لمحوں سے مضطرب۔ سوزان اور لالہ ان لوگوں سے کچھ پیچھے رہ گئی تھیں۔ سوزان اب تک کئی محاذ جنگ دیکھ چکی تھی لیکن لالہ کے لیے یہ پہلا تجربہ تھا۔ ٹکڑے کر دینے اور اپنی بنیادوں سے ہلا دینے والا تجربہ۔

وہ قونیہ میں تھی اور مولانا روم کے تکیے پر مولویہ درویشوں کا رقص دیکھ رہی تھی، ان کی 'ھُو' کی ضرب سن رہی تھی۔ راحتِ روح و روانم تتنا ھا یاھو۔ اور اس لمحے جب یاھو کی ضرب دل کو پگھلا رہی تھی، اس کا سیٹلائٹ فون زندہ ہو گیا تھا۔ وہ اس بے ادبی پر شرمندہ ہوتے ہوئے تیزی سے باہر چلی گئی تھی۔ دلّی سے بیورو چیف چندر شیکھر بول رہا تھا ''عراق کی سرحدیں بند ہونے والی ہیں، تم استنبول سے فوراً بغداد کے لیے چل نکلو۔''

''لیکن میں تو قونیہ میں ہوں۔''

''تم ٹمبکٹو میں ہو تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بغداد وار زون بننے والا ہے یہ تمہاری پروفیشنل لائف کا پہلا بڑا بریک تھرو ہوگا۔'' دوسری طرف سے چندر شیکھر نے کہا تھا اور وہ مولانا روم کے تکیے پر رقصاں مولویہ درویشوں کو 'ھُو' کی ضرب لگاتے چھوڑ کر باہر نکلی تھی اور پھر راستے میں دم لینے کے لیے نہیں رکی تھی۔ وار زون میں جانے کا خیال' لہو میں بھنور ڈال رہا تھا۔

پہلے پہل اپنا بستر اس نے 'المنصور' میں لگایا تھا، سرکاری سرپرستی میں چلنے والا فائیو اسٹار ہوٹل، بعد میں وہ دوسروں کے ساتھ، 'الرشید' منتقل ہو گئی تھی۔ ہوٹل میریڈین مشرف بہ اسلام ہو کر ہوٹل فلسطین ہو چکا تھا۔ وہاں وہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے جو ترکی، ہالینڈ،

فرانس، کینیڈا اور برطانیہ سے آئے تھے۔ اپنے اپنے شعبوں کے کامیاب اور مشہور لوگ جنہوں نے اعلان کیا تھا کہ انسانی ڈھال بن کر بغداد آئے ہیں۔ وہ صبح سویرے جنگ کے اور امریکی حملے کے خلاف بینر لے کر آزادی چوک کی طرف جاتے، وہاں گھنٹوں مظاہرہ کرتے، عراقی بھی ان کے ساتھ ہو جاتے، دلوں کو یقین سا آجاتا، امریکی اپنے ہی لوگوں کو بھلا کیسے ماریں گے۔ انسانی سپر۔ جنگ کے خلاف انسانوں کا انتہائی اقدام۔ عیسائی دنیا میں مظاہرے ہو رہے تھے۔ لاکھوں کے مظاہرے۔ مسلم اُمہّ سوتی تھی۔ اقبال کے سارے شعر تاریخ کے عجائب گھر میں رکھنے کے قابل ہو گئے تھے۔ ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے۔ نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاک کاشغر۔ علامہ صاحب کا جغرافیہ بالکل کمزور تھا، ورنہ کاشغر کو مسلم اُمہّ کے کھاتے میں نہ ڈالتے۔ آج کا زمانہ ہوتا تو چینی سفارت خانہ پاکستان سے شدید احتجاج کرتا کہ آپ کے قومی شاعر ہمارا علاقہ مسلمانوں کو کیسے بخشے دیتے ہیں۔

اُس نے سر کو جھٹکا۔

ہاں وہ حملے کی ساتویں رات تھی۔ سوزان اور وہ پیچھے رہ گئی تھیں۔ اچانک فضا اُس سنسناہٹ سے بھر گئی تھی جو بمبار طیاروں کی آمد کا نشان دیتی ہے۔ سوزان جو اس سے دو قدم آگے تھی۔ اُس نے پلٹ کر لالہ کو دیکھا تھا اور بھاگنے کے لیے کہا تھا۔ ستیش بھی بھاگ رہا تھا اور مڑ کر ان دونوں پر چیخ رہا تھا۔ ''جلدی کرو۔ دوڑو'' لالہ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ شاید وہ چلنا اور بھاگنا بھول گئی تھی اور اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئی تھی۔ تب کسی نے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور اس کے پیروں کو پر لگ گئے تھے، چند ہی لمحوں میں وہ نسبتاً محفوظ جگہ پر تھی۔ بی باون بمبار سر پر آ پہنچے تھے اور اپنا بوجھ ہلکا کر رہے تھے۔ 500 پونڈ کے بم پھٹ رہے تھے اور زمین ان کے پیروں کے نیچے لرز رہی تھی۔ وہ اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر اور سر کو گھٹنوں میں چھپا کر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں بعد اُسے اپنے شانوں کے گرد کسی گرم اور محبت بھرے لمس کا احساس ہوا، اُس نے چونک کر اُسے دیکھا۔ دور سے اُٹھتے ہوئے شعلوں کی روشنی میں وہ سرمہ لگی آنکھیں تھیں۔ تیکھے عرب خدوخال، زیتونی

رنگت اور سیاہ بال۔

بمبار چلے گئے تو سب نے ایک دوسرے کو آوازیں دیں۔ سوزان اس کے قریب آ گئی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، وہ آنکھیں، وہ خدوخال چشم زدن میں کہیں غائب ہو گئے۔ یہ شہر سے اُس کی پہلی ملاقات تھی۔ اب وہ اس کے ساتھ رہتی تھی۔ ہوٹل کے کمرے میں جب کوئی نہ ہوتا، وہ اس کے بستر پر دراز ہو جاتی، اپنی تاریخ دہراتی، اپنی تہذیب کے قصیدے پڑھتی۔ بولنے پر آتی تو بولتی چلی جاتی۔

''سنو میری جان۔ یہ ہم سومیری تھے جنہوں نے دن اور رات کو 24 گھنٹوں میں اور گھنٹے کو 60 منٹ میں تقسیم کیا تھا۔ یہ ہم تھے جنہوں نے دنیا کو لکھنا سکھایا۔''

لالہ نے اسے ڈانٹ دیا'' تو پھر ساری خطا تمہاری ہے۔ تمہارے سومیری سگڑ داداؤں اور سگڑ دادیوں کی ہے۔ نہ تم نے لکھائی ایجاد کی ہوتی، نہ میں جرنلسٹ بنتی۔ نہ تم لوگوں نے وقت کو گھنٹوں اور منٹوں میں تقسیم کیا ہوتا، نہ انسان اُن مشقتوں سے گزرتا، جن سے گزرتا ہے۔''

''خاموش رہو دختر ہندی۔ یہ ہم تھے جنہوں نے کمہار کا چاک، پہیے اور رتھ ایجاد کیے تھے۔'' شہر ابرو اٹھا کر اُسے دیکھتی۔

''تو پھر کیوں جنگوں کو، ہلاکو کے لشکر اور امریکی فوجوں کو روتی ہو۔ ساری گڑبڑ تمہارے سومیری باپ داداؤں کی ہے۔ رتھوں پر چڑھی ہوئی منجنیقیں جنہوں نے بغداد کی فصیلوں پر آگ برسائی اور یہ آرمرڈ کاریں، توپیں اور ٹینک جن میں چار، آٹھ اور سولہ پہیے ہیں۔ کیسا ظلم کیا سمیریوں نے۔ نہ پہیہ ایجاد ہوتا، نہ منجنیقیں، ٹینک اور بمبار طیارے وجود میں آتے۔''

شہر بات کو ٹال جاتی'' ہمارے سارگون اول کی فوجوں نے دور دور تک دھاوا کیا، فتح پر فتح حاصل کی تو اس فتح کا اعلان اس نے خلیج فارس میں اپنے ہتھیار دھو کر کیا تھا۔'' شہر کی آواز میں کیسی تمکنت اور طنازی تھی۔ وہ جنگ کے خلاف تھی لیکن جب اپنے لوگوں کی فتوحات کا ذکر کرتی تو اترانے لگتی۔ فتح کے سامنے انسان کس طرح اپنے گھٹنے ٹیک

دیتے ہیں۔

''جارج بش کے جنگی جہاز بھی خلیج فارس میں اپنے پہلوؤں کو دھوتے ہیں، ان جہازوں کے عرشے سے بمبار طیارے اڑتے ہیں اور گائیڈڈ مزائل داغے جاتے ہیں۔'' لالہ نے اُسے یاد لایا۔

''ہاں لیکن آج دھاوا کرنے والے یہ نہیں کہتے کہ وہ تیل کی دولت سمیٹنے آئے ہیں۔ وہ تو آزادی کا بیج بونے اور جمہوریت کی فصل اُگانے آئے ہیں۔ ہمارے بادشاہ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ اکاد کے بادشاہ منش تو سو، نے عیلام پر حملہ کرنے سے پہلے منادی کرادی تھی کہ وہ چاندی کی کانوں اور سنگِ چقماق کے ذخیروں پر قبضے کے لیے حملہ کر رہا ہے۔''

لالہ کے اندر طیش لہریں لینے لگا۔'' یہ تم کیا اپنے بادشاہوں اور ان کی فتوحات کے قصیدے پڑھ رہی ہو۔ ہر فتح اپنے دامن میں نا انصافی، بھوک، قتل و غارت کو سمیٹے آتی ہے۔ پانچ ہزار برس پہلے کا منش ہو یا آج کا بش سب ہی کے ہاتھ خون میں ڈوبے ہوئے ہیں۔''

تاریخ کے تنور میں قومیں اور قبیلے اور نسلیں دم پخت۔ موت کی ضیافت کے لیے دسترخوان چنا ہوا۔ آیئے صاحبان۔ یہ جاپانی اور کوریائی ذائقہ ہے۔ لیجیے یہ رہا ویت نامی شاشلیک، ادھر جرمن اور پولش یہودیوں کا باربی کیو ہے، افغان تکّی، فلسطینی تکّے اور عراقی کباب۔ سب ہی کچھ حاضر ہے حضور، عالی جاہ یہ صرف پچپن ساٹھ برس کی جنگوں کا ثمر ہے۔

پہلے کے اسیران جنگ کو رونے کی فرصت تو تھی۔ لیکن اب ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک ملک سے دوسرے ملک کھدیڑے جانے والوں کو رونے کی فرصت بھی نہیں رہی۔ بابل کی ندیوں کے کنارے مشقت کرنے والے اسیران جنگ کو انٹرنیشنل ریڈ کراس اور یو این ایچ سی آر کے طول طویل فارم بھرنے، ایک دفتر سے دوسرے دفتر تک دوڑنے، شناختی کاغذات بنوانے اور خشک دودھ، چائے کی پتی اور نان کے لیے قطار

نہیں لگانی پڑتی تھی، تب ہی یرمیاہ اور یسعیاہ نے وہ نوحے لکھے جو ڈھائی ہزار برس بعد بھی زندہ ہیں۔ آج کے بے زمین و بے آسمان لوگوں کو اتنی مہلت ہی کہاں ملتی ہے کہ وہ کسی ندی، کسی دریا کے کنارے بیٹھیں اور گریہ و ماتم کریں۔

جلتے ہوئے شہر پر دھوئیں کی چادر پھیلی ہوئی تھی اور اس پردے پر گزرے زمانوں کے لشکر گزر رہے تھے۔ گھڑسوار بابل و نینوا کو روند رہے تھے۔ منارۂ بابل جل رہا تھا، بابل کے آویزاں باغات جل رہے تھے، کتب خانے خاکستر ہو رہے تھے، روضۂ امام کے گنبد چھلنی ہو رہے تھے۔ دجلہ لاشوں سے بھرا ہوا تھا۔ ٹینک محلوں کی سیڑھیاں چڑھ کر ان کی دیواریں گرا کر ایوانوں میں گھس رہے تھے اور امریکی میرین ہزار قلموں والے فانوسوں کو اپنی چاند ماری کا نشانہ بنا رہے تھے، زمین پر کانچ کا فرش بچھ رہا تھا۔

اُس نے جب پہلی مرتبہ دریائے دجلہ کو دیکھا تھا حیران رہ گئی تھی۔ مٹیالے رنگ کا گندا پانی۔ پاپا کیا اسی دریا کے عاشق تھے؟ ایک ہزار ایک راتوں کی کہانیاں اسی دجلہ کے کنارے شہرزاد نے کہی تھیں، جو اسے پاپا نے بچپن میں سنائی تھیں دنیا جنہیں آج تک سنتی تھی؟ دجلہ مچھیروں کی چھوٹی چھوٹی کشتیوں سے بھرا ہوا، سب اپنے جال دریا میں پھینکتے ہوئے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ کچھ ہی دیر میں نوچندی جمعرات کا چاند ڈوب جائے گا اور اس کے ساتھ عراقیوں کے مقدر کا ستارہ بھی غروب ہو جائے گا۔ نوروز سے ایک دن پہلے 20 مارچ کو جب فجر کی اذان ہو رہی ہوگی شہر کے بدن پر پہلے میزائل کا زخم لگے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی سب لوگ جیسے نیند سے چونک جائیں گے۔ وہ جو سمجھ رہے تھے کہ حملہ نہیں ہوگا۔ ان کی تمام خوش فہمیاں دجلہ کے پانیوں میں بتاشے کی طرح گھل جائیں گی اور پھر ری پبلکن محل، وزارت اسلحہ کی عمارت اور دوسری سرکاری عمارتیں سوکھی لکڑیوں کی طرح جلیں گی اور ان کے قریب سے گزرتے ہوئے عراقیوں کی ہمت نہ ہوگی کہ وہ ان عمارتوں کی جلی ہوئی لاشیں دیکھیں جو صرف چند دن پہلے طاقت و جبروت کی نشانیاں تھیں۔

امریکی پاپ کارن کے شوقین۔ انہوں نے بغداد کو پاپ کارن مشین بنا دیا جس

میں وہ عراقیوں کو، بھٹے کے دانوں کی طرح بھون رہے ہیں۔ یہیں کہیں آتش نمرود دہکائی گئی تھی لیکن آتش نمرود تو ہر زمانے اور ہر زمین میں دہکائی گئی۔ ہیروشیما اور ناگاساکی، مائی لائی اور تورا بورا، بغداد اور بصرہ۔ آتش نمرود کا امریکن ورژن۔ نمرود نے یہ سارا اہتمام اکیلے ابراہیم کے لیے کیا تھا۔ یہاں تو لاکھوں اور ہزاروں لوگ آتش نمرود کے امریکن ورژن کا ایندھن۔ امریکی سپاہیوں نے رائفل کی سنگینوں اور اپنے چاقوؤں کو بابل کے کھنڈرات میں مہارت سے استعمال کیا۔ وہ اینٹیں کالے بازار میں سونے کے مول بیچنے کے لیے چرالی گئیں جن پر ہزاروں برس پہلے یہ کندہ کیا گیا تھا کہ

'میں ہوں بنوکدرضر۔ بابل کا بادشاہ'

کسی مفتوح شہر اور اس کے شہری اس سے بڑا گریہ اور کیا کرتے کہ انہوں نے کہا:

"افسوس! شہر کے لیے
اور خزانوں کے لیے میری روح سسکیاں بھرتی ہے
وہ (حملہ آور) عالی شان مقبرے کے اندر تک گھس گیا
وہ معبد سے جلیل القدر ملکہ کو نکال لایا
اے میرے برباد شہر کی خاتون! تو کب لوٹے گی؟"

برباد شہروں کی عورتیں بھلا کب لوٹتی ہیں۔ یزدجرد سوئم کی پوتی مسجد کے فرش پر بٹھائی جاتی ہے۔ اور امیر المومنین المستعصم باللہ کی بیویاں، بیٹیاں اور بہویں ہلاکو خان کے لشکریوں میں تقسیم ہوتی ہیں۔ زیادہ پرانی بات تو نہیں تھی۔ اپنے یہاں کی روندی ہوئی مسلمان، ہندو اور سکھ عورتیں کوڑے کرکٹ کی طرح یاد فراموشی کی جھاڑو سے آزادی کے قالین کے نیچے چھپادی گئی تھیں۔

☆☆☆

نیند آنکھوں سے رخصت ہوگئی تھی اور شہر بھی نہیں آئی تھی۔ کروٹیں بدلتے ہوئے اس کے پہلو دکھنے لگے۔ اس نے ٹیبل لیمپ جلا کر پاپا کی 'دی عربین نائٹس' اٹھائی اور کچھ پڑھنا چاہا لیکن لفظ کہیں اندھی گھپاؤں میں چھپ گئے تھے اور صفحوں پر تباہ شدہ

بغداد کی گلیوں اور سڑکوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ اسے بغداد سے واپسی کا لمحہ یاد آیا۔

اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر سوزان اس کے ساتھ تھی۔ کتنے ہی لوگ سوزان کو دیکھ کر لپکے تھے، کسی نے سلام کیا تھا، کسی نے بغداد سے بھیجے جانے والے ڈسپیچ کی داد دی تھی۔ سوزان گولڈن برگ کو دلّی ایئرپورٹ کے سارے افسر اور اکثر پورٹر بھی پہچانتے تھے۔ یہی عالم مارک ٹیلی کا تھا جو ٹلّی صاحب کے نام سے مشہور تھا۔ اخباروں نے، ٹیلی وژن چینلوں نے دنیا کے جغرافیے کو ایک کوزے میں بند کردیا تھا۔

وہ دونوں ٹرالی دھکیلتی ہوئی باہر نکلی ہی تھیں کہ سوزان کے سیٹلائٹ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ رک کر کسی سے باتیں کرنے لگی۔ لالہ آگے بڑھتی چلی گئی۔ یہ وہی لمحہ تھا جب شہر آ گئی تھی اور اس نے جھک کر کہا تھا ''آؤ ہم دونوں نکل چلتے ہیں۔''

لیکن ان کے راستے تو بند تھے۔ ڈیسک پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے پلکیں جھپکائیں، اس کے بال گہرے سیاہ اور بھویں برف کی طرح سفید تھیں، اس نے چٹکی سے اپنے یونیفارم پر جمی ہوئی صدیوں کی گرد جھاڑی۔ پی کیپ ترچھی کی اور آگے جھک کر پوچھا ''تمہارا نام؟''

''مغرب میں لالہ ڈینیئل ہوں۔ مشرق میں لالہ دانیال۔''

''اس کا کیا مطلب ہوا؟''

لالہ اس کی طرف جھکی۔ ''ساری گڑ بڑ میری مما نے کی۔ وہ دلّی سے پڑھنے سوربون گئی تھیں۔ بس پھر ہوگیا عشق ایک فرنچ آرٹسٹ سے۔''

نوجوان نے برا سا منہ بنایا ''میں تم انسانوں کے عشق سے بہت تنگ ہوں۔ جسے دیکھو، جب دیکھو عشق کیے جاتا ہے۔''

''کیوں تم نے کبھی عشق نہیں کیا؟'' شہر نے ایک ادا سے پوچھا۔

''کس سے کرتا؟ میں ازل سے اکیلا۔''

''سنا شہر تم نے۔ ایک نمبر کا جھوٹا۔ میں ازل سے تنہا ہوں۔'' لالہ نے شہر کو دیکھا، حلاوت بھری مسکراہٹ۔ کانوں کے آویزے روشنی میں جگمگائے۔

اسی وقت تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی سوزان اس کی طرف آئی ''یہ تم کس سے باتیں کررہی تھیں؟''

''ایک جھوٹے کو گھر پہنچا رہی تھی۔''

سوزان نے ایک گہرا سانس لیا۔ وہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔

لالہ نے دیکھا۔ شہر کہیں نہیں تھی۔ سیاہ بالوں اور سفید بھوؤں والا نوجوان بھی چلا گیا تھا۔ سوزان نے ٹیکسی لینے کے لیے قدم آگے بڑھایا۔ لالہ اس کے ساتھ تھی۔ ''میں دوسری ٹیکسی میں چلی جاؤں گی۔''

''نہیں ہم دونوں ساتھ جارہے ہیں۔ میں تمہیں صفدر جنگ اتارتی ہوئی چلی جاؤں گی۔''

لالہ دانیال نے ایک آہ بھری اور ٹیبل لیمپ کو آف کردیا۔

آزادی کہیں نہیں تھی۔ نہ کتاب کے صفحوں پر، نہ دلّی کی سڑکوں پر۔ ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی۔

☆☆☆

چندر شیکھر کا فون آیا ''چینل سیون والے تمہیں اپنے مارننگ پروگرام میں انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔''

''لیکن وہ تو منہ اندھیرے بلا لیتے ہیں اور وہ بھی Live پروگرام میں۔'' لالہ کچھ پریشان سی ہوگئی۔

''تمہارے لیے کیمرہ اور مائیک کون سے نئے ہیں۔ صبح سویرے یہ دونوں تمہیں بریک فاسٹ میں نہیں کھالیں گے۔'' چندر شیکھر نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں کہا اور اس نے چینل سیون اور چندر شیکھر کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

گاڑی صبح ساڑھے چھ بجے آگئی اور وہ ممّا کی بنائی ہوئی کافی کی پیالی پی کر نکل گئی۔

☆☆☆

سارہ ڈینیل نے اپنی تڑختی ہوئی کنپٹیوں کو دبایا۔ بلیک کافی کی اس پیالی سے بھی انہیں آرام نہیں آیا تھا جو انہوں نے لالہ کے ساتھ پی تھی۔ وہ اُسے چپکے چپکے دیکھتی رہی تھیں۔ کیا یہ اُن کی اور ڈینیل کی لالہ تھی۔؟ صرف چند گھنٹوں پہلے کی تو بات تھی جب آدھی رات اِدھر اور آدھی رات اُدھر وہ پانی پینے کے لیے اٹھی تھیں۔ انہوں نے ریفریجٹر کھولا تھا اور چونک گئی تھیں۔ لالہ کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ اتنی رات گئے وہ کسے فون کر رہی ہے؟ انہیں حیرت ہوئی۔ کچھ دیر پہلے انہوں نے اُسے اپنے ہاتھ سے ٹرینکولائزر کھلائی تھی۔ اُسے تو گہری نیند میں ہونا چاہیے تھا۔ انہوں نے اُس کے دروازے پر اپنے ناخنوں سے دستک دی۔ لالہ نے دستک شاید نہیں سنی تھی، اس کے زور زور سے ہنسنے کی آواز آرہی تھی۔ انہوں نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ دو قدم آگے بڑھیں اور پھر وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔ نیم روشن کمرے میں گول میز پر بچھی ہوئی شطرنج کی بساط انہیں صاف نظر آرہی تھی۔ بساط کے سامنے کرسی پر لالہ بیٹھی تھی، اس نے ایک سفید مہرہ بڑھایا اور پھر سامنے دیکھ کر بات کرنے لگی۔ لیکن وہاں تو کوئی نہیں تھا۔ وہ سکتے کے عالم میں اُسے دیکھتی رہیں۔ لالہ نے دوبارہ اپنا ہاتھ بڑھایا اور دوسری طرف رکھا ہوا سیاہ مہرہ بڑھایا۔ کشت۔ سفید پیادہ پٹ گیا تھا۔ لالہ ہنسنے لگی۔ بے روح ہنسی۔

انہیں کپکپی چڑھنے لگی۔ وہ زندگی سے پرے رہنے والی لالہ سے کچھ پوچھنے کے لیے آگے کیسے بڑھتیں۔ وہ اُلٹے قدموں پیچھے ہٹیں اور آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔ اپنے تکیے میں منہ چھپا کر روتے ہوئے انہیں یقین نہ آیا کہ یہ سانحہ ان کے ساتھ گزر گیا ہے۔ وہ ڈینیل کے چلے جانے پر اس طرح روئی تھیں۔ کیا یہ بھی موت کا ایک عالم تھا؟۔ پھر انہوں نے اپنے آپ کو سمجھایا موت سے لڑنا ممکن نہیں لیکن زندگی کی ٹیڑھ سے لڑا جا سکتا ہے۔ انہوں نے طے کیا کہ اب وہ لالہ کو ڈاکٹر مکھرجی کے سپرد کر دیں گی۔ وہ جب ان کے اندر سے پھسلتی ہوئی دنیا میں آئی تھی تو ڈاکٹر مکھرجی کے مہربان ہاتھوں نے اسے سنبھالا تھا۔ اب 24 برس بعد بھی وہی بکھرتی ہوئی لالہ کو سمیٹ لیں گے۔

☆☆☆

لالہ نے ڈرائیور سے ائیر کنڈیشنر بند کرنے کے لیے کہا اور شیشہ اتار دیا۔ باہر خنکی تھی اور پو پھٹنے کا سرمئی پن۔ شہر کچھ جاگ اور کچھ سو رہا تھا۔ شمال، جنوب، مشرق، مغرب، گولف لنکس، گولف کلب، اوبرائے شیرٹن، ہمایوں کا مقبرہ۔ مسافتیں پیروں کے نیچے سے نکلتی چلی گئیں۔ موڑ کاٹتے ہوئے گاڑی ذرا دھیمی ہوئی تو لالہ کی نظر فٹ پاتھ پر پڑی۔ وہاں اخباروں کے ڈھیر تھے۔ ہاکر تھے جو ان اخباروں کو اپنی اپنی سائیکلوں پر رکھ رہے تھے۔ کچھ ہی دیر جاتی ہے کہ قتل و غارت گری کی خوفناک خبروں، ہیروئنوں کے اسکینڈلوں، کسی ناراض شوہر کے ہاتھوں قتل ہو جانے والی بیوی کے رشتہ داروں کے بیانوں، فیشن ماڈلز کی تصویروں اور فلموں کے چٹخارے دار تبصروں سے بھرے ہوئے یہ اخبار گھر گھر پھیل جائیں گے۔

''تمہارا شہر کیسا ہرا بھرا ہے۔'' شہر نے پرندوں کی چہکار سے بھرے ہوئے پیڑوں کو دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''اس شہر نے ہر زمانے میں گہرے زخم سہے ہیں۔''

''میرا بغداد سینکڑوں برس پہلے بھی خون سے نہایا تھا۔ آج بھی وہاں خون کا دریا بہتا ہے۔'' شہر کی آواز تھی یا سسکی۔

''ہر زمانے میں شہروں کا اور عورتوں کا ایک سا مقدر ہے'' لالہ نے ذرا تیز لہجے میں کہا اور اپنے شہر کی بربادیوں میں چلتی چلی گئی۔ دل خون کرتے ہوئے شہر آشوب 'مرزا قربان علی بیگ سالک دلّی والے نے آہ بھری۔ ہاں دنیا بھر کی عورتوں کا مقدر ایک جیسا ہے۔ لکھوں میں پردہ نشینوں کا حال کیا، نکل کے گھر سے چلی ہیں پیادہ پا۔ یہ بیبیاں بتاشوں کی طرح لال کرتی والوں اور خاکیوں میں تقسیم ہو رہی تھیں۔ لالہ دانیال کو گھمیری سی آئی۔

زمین و زماں رقص میں تھے، قونیہ کے درویشوں کے لبوں سے نکلتی ہوئی 'ھُو' کی ضرب رقص میں تھی۔ ہرے بھرے پیڑ، جمنا کی لہریں، شمسی تالاب کے پانیوں پر سانس لیتی ہوئی سنگھاڑے کی سر سبز بیلیں رقص کرتی تھیں۔ جامع مسجد کی سیڑھیاں چڑھتے

ہوئے سرمد کا کٹا ہوا سر، اس کی گردن سے پھوٹتی ہوئی خون کی دھارائیں دھمال ڈالتی تھیں۔ مسجد روشن الدولہ کا صحن، نادر شاہ اور ابدالی کی تلواریں دائرے بناتی تھیں۔ تھامس مٹکاف اور میجر ہڈسن کی کاربائین سے نکلتی ہوئی گولیاں رقصاں تھیں۔

تیز رفتار گاڑی مناظر کے اندر سے گزرتی رہی۔ غالب دلّی والے کی گنگناتی ہوئی آواز دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں۔ سب خواب در خواب تھا۔ وہ شہر کا ہاتھ تھامے ہوئے گزرتی چلی گئی۔ لاہوری دروازے سے چاندنی چوک۔ سہمی ہوئی نہر، کنارے پر لرزتے ہوئے پیڑ۔ کاشان و اصفہان کے قالین جہاں بکتے تھے وہاں زمین پر مُردوں کا بچھونا۔ کتے لاشوں کو کھاتے ہوئے، گدھ کھلی ہوئی آنکھوں کو نوچتے ہوئے۔ چاوڑی سے آتی ہوئی آواز دل کو برمارہی تھی۔ جمنا تیرے، جھولا جھولیں سکھیاں۔ لالہ دانیال نے گردن گھما کر دیکھا۔ جھولے کہاں تھے؟ جھولنے والیاں کہاں تھیں؟ محلوں اور حویلیوں سے کولکیوں اور کوٹھریوں سے نکل کر بھاگتی ہوئی سفید و سیاہ شکاریوں کی مٹھیوں میں پھڑ پھڑاتی ہوئی بلبلیں، کوئیلیں، مینائیں اور قمریاں، سارا شہر محلہ چڑیماران تھا۔ مخمل و سنجاف اور حریر و دیبا کے فرشی غراروں، کھڑے پائچوں اور چوڑی دار پاجاموں میں الجھتی ہوئی، گرتی ہوئی۔ تقدیر کے اشارے پر رقص کرتی ہوئی بیگمات اور باندیاں، مغل بچیاں اور راجپوتانیاں، شہر چتا تھا اور اس کی بیٹیاں جوہر کرتی تھیں۔ سکھیوں سے کنوئیں پٹے پڑے تھے اور سرسبز پیڑوں پر سبزہ خط آثار چہروں والے جھولتے تھے۔ سر مٹکاف نے مسکرا کر اپنے چُرٹ کی راکھ جھاڑی، لیفٹننٹ کرنل نکلسن نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا۔ جلتے ہوئے شہروں کی راکھ اڑتی تھی، وقت کی غلام گردشوں میں شہر غلام، آبادیاں باندیاں، بخت نصر سے بش جونیئر تک ایک ہی کہانی۔ جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے۔ کوتوالی چبوترے کے سامنے بچھی ہوئی کرسیاں، کرسیوں پر کمپنی بہادر کے افسر ڈٹے ہوئے، اپنے اپنے چُرٹ سلگاتے ہوئے، شہر والوں کا رقصِ بسمل دیکھتے ہوئے۔ جمنا کی آنکھیں اپنے کناروں سے چھلکتی ہوئی، دجلہ کی سرخ لہروں نے اٹھ اٹھ کر اپنے شہریوں کو دیکھا۔ محقق طوسی کا قلم

کاغذ پر چل رہا تھا اور وہ امیر المومنین کے حرم کی سات سو عورتوں کی لشکرِ ہلاکو میں تقسیم کو بے اعتنائی سے لکھ رہا تھا۔ شیراز کے سعدی کا سر خاک سے بھرا ہوا تھا۔ نازنینانِ حرم کی بے حرمتی کا ماتم کرتے ہوئے اس کی آواز لہو رو رہی تھی۔

لالہ دانیال کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، شہر نے آنچل سے اس کی آنکھیں خشک کیں۔ جمنا و دجلہ دونوں لہو رنگ تھے۔ ہلاکت پہلے نیزے کی انی اور تلوار کی دھار میں رہتی تھی۔ اب گائیڈڈ مزائیلوں کے پروں پر بیٹھ کر سفر کرتی تھی، کلسٹر بم میں چھپی ہوئی فولادی تتلیاں بچوں کے بدن میں اتر جاتی تھیں۔ لیکن دلّی اور بغداد کو لوٹنے والے نصاریٰ کو کیا کہیے۔ بغداد کے محلے کرخ میں قتل عام کرنے والے کلمہ گو تھے، کلمہ گو نادرشاہ درانی اور احمد شاہ ابدالی نے دلّی کو جی بھر کر لوٹا۔ لالہ دانیال کو زور کی ہنسی آئی۔ کلمہ گو کردوں کے لیے مسٹرڈ گیس۔ کلمہ گو ایرانی اپنے ہی پیشواؤں کے فتوؤں سے قتل ہوتے ہوئے۔ کلمہ گو بنگالیوں کے سروں کی کھیتی کلمہ گو پاکستانی مجاہدوں نے کاٹی۔ کلمہ گو فلسطینی دریائے اردن کے کنارے، کلمہ گو جالندھری جرنیل کے ہاتھوں قتل ہو رہے تھے۔ دل تو ایوبی ہوا، آنکھیں ہوئیں یعقوبیاں۔

خوابوں کے پرے ان کا پیچھا کر رہے تھے اور ان دونوں کے گھوڑے لاہوری دروازے سے گزر رہے تھے، ان کے برابر اونچی تو پچی بنا ایک اور سوار چلنے لگا۔ اس نے ان دونوں کو دلچسپی سے دیکھا۔ کائنات میں عورتوں سے زیادہ بھی کوئی دلچسپ چیز ہو سکتی ہے۔ وہ اپنے اس نادر خیال پر مسکرایا۔

''میں لیفٹیننٹ رابرٹس ہوں۔'' ساتھ چلتے ہوئے شخص نے اپنے گھوڑے کی لگامیں کھینچتے ہوئے، اترا کر کہا۔

لالہ نے گردن گھما کر اُسے دیکھا ''کچھ برس بعد تم لارڈ رابرٹس کہلاؤ گے۔''

لیفٹیننٹ رابرٹس نے چونک کر اُسے دیکھا ''تم ستارہ شناس ہو؟''

''میں نے تمہاری لکھی ہوئی کتاب پڑھی ہے''۔

''لیکن میں نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔'' اُس نے چیں بہ جبیں ہو کر اس لڑکی کو

دیکھا جو گھوڑے کی پیٹھ پر جمی بیٹھی تھی۔

''لکھو گے۔ جلد لکھو گے۔ پہلے تم ہمیں ملیامیٹ کرتے ہو۔ پھر ہماری بربادی کی داستان لکھتے ہو۔ ڈائریز، ڈسپیچیز''

بغداد کی بربادی پر چھپنے والی نئی اور دلّی کی تباہی پر لکھی جانے والی تمام پرانی کتابوں کی فہرست لالہ کی نگاہوں میں تیر گئی۔ ''تم کیا سمجھتے ہو لفٹین صاحب۔ اب ہم بھی اخبار نکالتے ہیں، کتابیں چھاپتے ہیں۔ اپنے مقتول شہروں کا آنکھوں دیکھا حال خود لکھتے ہیں۔'' اس نے لیفٹیننٹ رابرٹس کو ڈانٹا۔ ''اور اب ہمیں بھی ''سر'' کا خطاب ملتا ہے۔تمہاری ملکہ دیتی ہے۔ لارڈ ناپال۔ لارڈ نذیر۔''

لیفٹیننٹ رابرٹس نے اس تک چڑھی نیٹو گرل کو دیکھا۔ پشواز پہن لے تو عین مین کیمپ فالوور۔ نوچ گرل۔ ہائے ہائے مجھ سے پہلے والے کیا عیش کر گئے۔ لیکن پھر اسے غصہ آنے لگا۔ ''ہماری کوئین بھلا کسی نیٹو کو لارڈ کے خطاب سے نوازیں گی؟'' اس نے جھنجھلا کر کہا

''شٹ اپ۔ تمہاری کوئین وکٹوریہ کی ہڈیوں کو بھی چونا لگ چکا۔ یہ کوئین الزبتھ دی سیکنڈ کا زمانہ ہے۔''

''تمہاری تاریخ بہت کمزور ہے۔ سو میں سے صفر۔'' لیفٹیننٹ رابرٹس نے اُسے گھور کر دیکھا۔

''سلطنت برطانیہ پر سورج کبھی کا غروب ہو چکا، تم صفر ہو چکے۔'' لالہ کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

''صفر تو ہم نے تمہیں بنایا ہے۔ ہم تجارت کرنے آئے تھے، اب حکومت کرتے ہیں۔ لال قلعہ ہمارا ہے۔ زمین خدا کی، ملک ملکہ وکٹوریہ کا۔ چاندنی چوک میں سولیاں گڑی ہیں۔ لوگ تماشا دیکھنے آتے ہیں۔ آؤ تم بھی چلو۔''

''میں سولیوں پر پھڑکتے ہوئے اپنے لوگوں کا تماشہ نہیں دیکھ سکتی۔ مجھ میں ہمت نہیں ہے۔''

''مائی ڈیر گرل۔ ہمت پیدا کرو۔ ہمت۔ دنیا ابھی اور بری جگہ ہونے والی ہے''۔ لیفٹیننٹ رابرٹس نے اپنی ٹوپی کو ہاتھ لگایا، ہلکے سے گردن خم کی، تعظیم کا برطانوی انداز اور آگے بڑھ گیا۔ دنیا واقعی بری جگہ ہوگئی تھی۔

لالہ کی آنکھوں میں خوابوں کے بگولے تھے جو سب کچھ اڑائے لیے جاتے تھے۔ اُس نے سر کو جھٹکا، نیچے دریا کی لہریں تھیں۔ ''یہ جمنا ہے یا دجلہ؟'' اس نے شہر سے پوچھا۔

''سارے دریا ایک ہیں۔ تمام شہر ایک ہیں۔ تمام انسانوں کا مقدر ایک ہے'' شہر کا لہجہ اداس ہوگیا۔ ''میں شہرزاد ہوں، ایک ہزار ایک راتوں تک میں نے کہانیاں سنائی ہیں، ایک ہزار ایک داستانیں، تب کہیں جان کی امان پائی۔ ان داستانوں میں سانس لیتی ہوئی عورتیں مرد، شہر، دریا۔ فنا سب کا مقدر، نیستی سب کی تقدیر۔'' شہر کی آواز اداسی کا دجلہ تھی، شاید جمنا، شاید گنگا۔

☆☆☆

ڈرائیور کشن لال نے چونک کر گردن گھمائی۔ کیا میم صاحب اس سے کچھ کہہ رہی تھی؟ پھر کشن لال کو جھٹکا سا لگا، اس نے ایک بار پھر سر گھما کر پیچھے دیکھا، میم صاحب تو خود سے باتیں کر رہی تھی۔ شرما صاحب کا بھی دماغ چل گیا ہے۔ جانے کیسے کیسے پاگلوں کو بلا کر کیمرے کے سامنے بٹھا دیتے ہیں۔ اس نے اپنے سر کو کھجایا لیکن بیٹا کشن لال اپن کو کیا۔ بچو اپنی ڈیوٹی دو۔ اوور ٹائم لگاؤ۔ پگار پکڑو اور گھر والوں کو روکڑا بھیجو۔

گاڑی اب پُل پر سے گزر رہی تھی۔ اس نوکری کے کارن صبح سویرے جمنا جی کے درشن ہو جاتے تھے۔ کشن لال نے دریا کو پرنام کیا پھر پل بھر کے لیے آسمان کی طرف دیکھا جہاں سے ایک ہوائی جہاز نیچے آرہا تھا جس کی روشنیاں کھلی ہوئی تھیں۔ کاش وہ بھی کبھی اس اڑن کھٹولے پر بیٹھے۔

گاڑی لہرا کر پل کی ریلنگ کی طرف لپکتے ہوئے فٹ پاتھ سے ٹکرائی۔ کشن لال کی ہتھیلیاں خوف سے بھیگ گئیں۔ اس نے تیزی سے اسٹیرنگ وہیل کو کاٹا۔ زوردار

دھماکہ ہوا، فٹ پاتھ کی دھار نے ٹائر کو پھاڑ دیا تھا۔

لالہ کی نگاہ ونڈ اسکرین کی طرف اٹھی اور بدن میں خوف کی لکیر کھینچ گئی۔ بی باون بمبار سر پر آ پہنچے تھے۔

''روکو۔ گاڑی روکو''۔ لالہ ہذیانی انداز میں چیخی۔ یہ ڈرائیور شاید اندھا تھا۔ اسے سڑک پر بھاگتے ہوئے بچے نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ کلسٹر بم، فولادی تتلیاں ان کا پیچھا کر رہی تھیں۔

ڈگمگاتی ہوئی گاڑی کو سنبھالتے اور بریک لگاتے ہوئے کشن لال کے دل کی دھڑکن تھم سی گئی۔ کیسا خطرناک ایکسی ڈنٹ ہو سکتا تھا۔ اوپر سے میم صاحب چیخ رہی تھیں۔

لالہ خواب میں جاگنے لگی، اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور شہر کا ہاتھ تھام کر چیختے ہوئے بچوں کی طرف لپکی، اس نے انہیں روکنا چاہا لیکن وہ دریا میں کود رہے تھے۔ لالہ ریلنگ پر جھک گئی، وہاں دریا میں ہاتھ پیر مارتے ہوئے بہت سے بچے تھے، اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ انہیں ڈوبنے کے لیے کیسے چھوڑ سکتی تھی۔

گڑبڑایا ہوا کشن لال ڈگی سے اسٹپنی اور جیک نکالنے کے لیے دروازہ کھول کر باہر آیا، اسی لمحے اس نے میم صاحب کو گاڑی سے نکل کر بھاگتے اور ریلنگ پر جھکتے ہوئے دیکھا، پھر وہ نگاہوں سے غائب ہو گئی۔ کشن لال کو تھرتھری چھوٹ گئی۔ وہ ریلنگ کی طرف لپکا۔ اس نے میم صاحب کو دریا میں ڈوبتے ابھرتے دیکھا اور مدد کے لیے پکارنے لگا۔

کہیں کوئی نہیں تھا جو کسی کی مدد کو پہنچتا۔

❖❖❖

تنہائی کا چاہِ بابل

ریل میں سوار ہوتے ہی سمیر نے روزانہ کی طرح ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں، یہ بہت اچھے لوگ تھے، اخبار خریدتے تھے، پڑھتے تھے اور پھر ریل یا بس میں ہی چھوڑ جاتے تھے، اسے مڑا تڑا ایک اخبار نظر آ گیا جسے اس نے فوراً اٹھا لیا اور یہ دیکھنے لگا کہ اس کے ستارے آج کے لیے کیا کہتے ہیں۔

"سنسنی خیز۔ یوں لگتا ہے جیسے آپ دوبارہ پیدا ہوئے ہیں اور ایک نئے تجربے کے لیے تیار ہیں۔ آپ نے جو کچھ کیا ہے اس کا حساب چکائیں گے! وقت آ گیا ہے کہ خواب اور حقیقت میں توازن قائم کریں۔"

اس نے عبارت کو دو مرتبہ پڑھا۔ کیا اس میں ماریا کے حوالے سے کوئی اشارہ تھا۔؟ کس بات کا حساب چکانے کی بات کی گئی ہے؟ سیٹی بجانے کے لیے اس نے ہونٹوں کا دائرہ بنایا ہی تھا کہ اسے یاد آ گیا کہ وہ ہجوم میں ہے۔ اجنبی ہجوم، جس کے اکثر لوگ اسے شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کچھ دنوں سے دنیا سر کے بل کھڑی ہو گئی تھی۔

اس نے سیٹی بجانے کا ارادہ ترک کر کے اخبار تہہ کیا اور اپنے شولڈر بیگ میں رکھ لیا۔

وہ سوچتا رہا، اپنے اور اپنے گھر والوں کے بارے میں، ماریا کے بارے میں، غلطی ستاروں کی تھی کہ اس کا باپ برسوں پہلے ختم ہو گیا تھا۔ اس کی ماں بیوہ اور وہ تینوں بہن بھائی یتیم ہو گئے تھے۔

غلطی ستاروں کی تھی کہ وہ غریب تھے اور اس کے چچا کا خاندان خوشحال۔

لیکن نہیں۔ اس نے اپنے سر کو جھٹکا۔ اس کے ستارے خراب ہوتے تو اسے اسکالرشپ کیسے مل سکتی تھی' وہ انگلینڈ کیسے آ سکتا تھا؟ عربی کا استاد بننے کا خواب کچھ ہی دنوں میں پورا ہونے والا تھا لیکن وہ فلسفے کا استاد بننا چاہتا تھا۔ فلسفہ پڑھنا اس کے بچپن کا خواب تھا لیکن ادب اور فلسفہ بھی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے اسٹیشن کا انتظار کرنے لگا۔

انتظار جس پر اس کی دنیا قائم تھی۔

☆☆☆

سارا دن گزر گیا اور کچھ بھی نہیں ہوا' کچھ بھی نہیں۔ ماریا کسی کتاب میں مگن رہی تھی اور لیکچر کے دوران بھی سب کچھ معمول کے مطابق رہا۔ نہ سنسنی خیزی' نہ دوبارہ پیدا ہونے کا احساس۔ وہ جس بار میں کام کرتا تھا وہاں جھاگ سے بھرے ہوئے بیئر کے مگ' وائن کے گلاس' فرنچ فرائز' بھنے ہوئے بادام اور مونگ پھلیوں کے پیالے پینے والوں کا دل بہلاتے تھے۔ سگریٹوں کا نیلگوں دھواں' شراب کی بوجھل خوشبو' آوازوں کا شور' سب کچھ روز کی طرح تھا۔ اس نے رخصت ہونے والے ایک جوڑے کی دی ہوئی ٹپ کو اپنی جیب میں رکھا۔ میز کو ڈسٹر سے صاف کیا' موسیقی کے شور میں گھڑی کو دیکھا جو زندگی کو نگل رہی تھی۔ اس کے کام کا وقت ختم ہوگیا تھا۔ ڈینیئل اس کی جگہ لینے کے لیے آ پہنچا تھا' اس نے اپنا ایپرن اتار کر کھونٹی پر لٹکایا' ملحقہ کمرے میں جا کر اپنا شولڈر بیگ اٹھایا اور برساتی پہن کر باہر کی طرف لپکا۔ باہر چہرے پر ہونٹ رکھتی ہوئی خنک ہوا تھی' تازہ اور بارش سے بھیگی ہوئی ہوا۔ تیز موسیقی کا شور بار کے اندر رہ گیا تھا۔ اور وہ سارے لوگ بھی جن کی کھوپڑیوں میں بھوسا بھرا ہوا تھا' جن کی شریانوں میں نشہ بہتا تھا اور جن کے معدے ہر وقت ''کچھ اور'' ''کچھ اور'' کی گردان کرتے رہتے تھے۔

وہ فلسفے کی گہرائیوں میں ڈوب جانا چاہتا تھا۔ اس کی جنم بھومی پر کیسے کیسے جید فلسفیوں کے قدم پڑے تھے لیکن ستاروں نے اس کے ساتھ ظلم کیا تھا۔ اس کا باپ سوتے میں ختم ہوگیا اور وہ ایک غریب مراکشی طالب علم پہلے سے بھی زیادہ غریب

ہوگیا۔ بیوہ ماں' دو چھوٹی بہنیں اور وہ خود۔ ان ذمہ داریوں سے وہ کیسے نگاہیں چرا سکتا تھا اور تب وہ پڑھائی اور کام دونوں میں بار برداری کے بے زبان خچر کی طرح جُت گیا۔ لوگوں نے کہا کہ پڑھائی چھوڑ دو لیکن اس کا تصور تو وہ خواب میں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اور پھر معجزہ ہوگیا' اس نے ماسٹرز میں شاندار کامیابی حاصل کرلی' اس کے استادوں نے کہا تھا کہ اب وہ کالج میں پڑھا سکتا ہے لیکن عین ان ہی دنوں استاد محمد احمد نے اسے ایک اخبار دکھایا جس میں عربی ادب میں ماسٹرز کی اسکالرشپ کا اشتہار تھا۔ لندن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کا۔ لیکن میں تو فلسفہ پڑھنا چاہتا ہوں۔ فلسفہ تم زندگی بھر پڑھ سکتے ہو۔ استاد نے آنکھیں دکھائی تھیں۔ کسی بہانے یہاں سے نکلو۔ اس نے درخواست دی تھی اور چند ہفتوں بعد اسے اطلاع ملی تھی کہ وہ برطانوی سفارتخانے سے رابطہ کرے تاکہ سفر سے متعلق تمام کارروائیاں پوری ہوسکیں۔ اسے اس خبر پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ اپنی خوشی کا اظہار کس طرح کرے۔ لیکن پھر اسے اندازہ ہوگیا کہ بیوہ ماں اور چھوٹی بہنیں سہم گئی ہیں۔ دیارِ غرب جانے والے پلٹ کر کب آتے ہیں۔ اس نے قسمیں کھائی تھیں انہیں یقین دلایا تھا کہ وہ دوسروں کی طرح غداری نہیں کرے گا۔ اپنے خون' خاندان اور اپنی اُس خاک سے جس سے اُس کا خمیر اٹھا تھا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلتا رہا۔ 2006ء کے اکتوبر کی پانچویں تاریخ تھی۔ بی بی سی ریڈیو 4 سے اس کا پسندیدہ پروگرام صبح آتا تھا لیکن اس وقت وہ کالج کی راہداری سے گزر رہا ہوتا تھا اسی لیے اس پروگرام کو وہ ہر ہفتے رات کو اس وقت سنتا جب ساؤتھ بینک سے گزرتے ہوئے واٹرلو اسٹیشن کی طرف چلتا تھا۔

ہر جمعرات کی طرح آج بھی اس نے اپنے ریڈیو ٹرانزسٹر کا ایر پلگ کان میں لگایا' مراکشی چمڑے کے گہرے عنابی کوٹ کا سرپوش درست کرتے ہوئے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈالے اور چلتا رہا۔ یہ کوٹ اس کے چچازاد بھائی نے انگلینڈ کے سفر کے بارے میں سن کر تحفے کے طور پر دیا تھا۔ اس روز اس کے چچا نے اسے اور سارے گھر

والوں کو گھر بلایا تھا۔ ضیافت شاندار تھی اور اس کے چچا کی دولت کے شایان شان۔ اس رات اس کی چچازاد بہن سارہ نے اپنی سرمگیں آنکھوں سے شرما کر اسے دیکھا تھا اور گھر جا کر سمیر کی ماں نے تلخ لہجے میں اسے بتایا تھا کہ یہ عنایتیں کاغذ کے اس پرزے کی عطا ہیں جس نے اسے یہ اطلاع دی کہ اسے لندن میں داخلہ مل گیا ہے۔ یہ پرزہ دنیا میں اس کی آنے والی کامیابیوں کا مژدہ سناتا تھا اور اس کے ملنے کے بعد ہی اس کے چچا کو یہ احساس ہوا تھا کہ سمیر اپنے خاندان کا ایک ابھرتا ہوا ستارہ ہے۔ اسے وہ دن یاد آئے تھے جب اس کے چچا نے سگے بھائی کو دفن کرنے کے بعد انہیں پلٹ کر نہیں پوچھا تھا اور اپنی اس ٹینری میں مصروف ہو گیا تھا جہاں چمڑا کمایا جاتا تھا' مدور تالابوں میں رنگا جاتا تھا اور سونے کے بھاؤ بکتا تھا۔

بوندیں اس کے چمڑے کے کوٹ پر سے پھسل رہی تھیں اور خنکی اس کی روح کو یخ کر رہی تھی۔ اس کی ہڈیوں نے اپنے شہر کاسا بلانکا کو یاد کیا جہاں دھوپ کا سنہرا پن آنکھوں کو روشن کرتا تھا۔ یہاں لندن میں بادل ہر وقت سر پر جھکے کھڑے رہتے اور بوندیں برستی رہتیں۔ وہ گرم دھوپ کے سنہرے پن کو ترس گیا تھا لیکن ماں کو اس نے کچھ نہیں لکھا تھا۔ اسے خط لکھتے ہوئے وہ ہمیشہ طنجہ' رباط اور فض کی اس سنہری دھوپ سے سنہرے خواب بنتا تھا جسے وہ اپنے دل میں چھپا لایا تھا اور جو لندن کی بھیگی ہوئی ہواؤں اور کہر زدہ شاموں میں اس کی روح گرم رکھتی تھی۔

اس کے ساتھ پڑھنے والے لڑکے اور لڑکیاں چونچال اور خوشحال تھے۔ وہ ایک غریب مراکشی' وہ ان سب سے مختلف تھا۔ اس کی جرابوں میں چھید تھے۔ اس کے جوتوں کے تلے گھسے ہوئے تھے اور اس کی قمیص کا کالر شکستہ تھا۔ وہ جی جان سے پڑھتا' چند گھنٹوں کے لیے ایک بار میں کام کرتا اور ماریا پر مرمٹا تھا جو اس کے ساتھ پڑھتی تھی لیکن جس کی طرف پیش قدمی کی اس میں ہمت نہ تھی۔ جرابوں کی طرح اس کی جیبوں میں بھی چھید تھے اور کیسے نہ ہوتے کہ وہ اپنی بیوہ ماں اور دو چھوٹی بہنوں کا کفیل تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ماریا کو کافی کی ایک پیالی یا وائن کے ایک پیالے کی دعوت

دے لیکن جانتا تھا کہ ایک دعوت بہت سی مداراتوں کی دہلیز ہوتی ہے۔ اس کے پاس اچھا اور صاف لباس کہاں تھا؟ وہ ماریا کے لیے پھول کیسے خریدتا؟ اسے کوئی چھوٹا سا تحفہ بھی کیسے دیتا؟ وہ سب کچھ سوچتا اور دل کو بہلاتا۔ ستارے کبھی تو اس کے بھی دن پھیریں گے۔ کبھی تو اس کی جیب میں بھی بہت سے کھنکتے ہوئے سکے اور ملکہ کی تصویر والے تازہ کرارے نوٹ ہوں گے۔

چلتے چلتے اسے تالمود کی ایک حکایت یاد آئی۔ یہ مقدونیہ کے سکندر کا قصہ سناتی تھی۔ اس حکایت میں بتایا گیا تھا کہ سکندر باغ عدن کے دروازے پر پہنچا اور دستک دی۔ محافظوں نے جھانک کر دیکھا لیکن دروازہ نہ کھولا تو سکندر نے مطالبہ کیا کہ اس دروازے کو اس کے لیے کھول دیا جائے۔ محافظوں نے اسے آگاہ کیا کہ یہ رب الارباب کا پھاٹک ہے اور صرف پرہیز گاروں کے لیے کھلتا ہے۔ تب سکندر نے لاف و گزاف کیا' وہ فاتح اعظم تھا اور یہ اس کا حق تھا کہ وہ باغ عدن میں داخل ہو۔ یہ سن کر پھاٹک کے محافظوں نے اسے ایک انسانی آنکھ دی۔ ایک انسانی آنکھ جو سکندر کی مٹھی میں آ گئی۔ محافظوں نے کہا کہ وہ جائے اور اس کا وزن کر کے دیکھے۔ سکندر نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس آنکھ کو اُس ترازو میں تولیں جس میں ہیرے تلتے ہیں۔ اس روز آدھی دنیا فتح کرنے والے کو معلوم ہوا کہ اس کے لشکر میں موجود تمام سونا' چاندی' ہیرے' جواہر جنہیں وہ اپنی فتوحات کے دوران سمیٹتا رہا تھا' ان سب کا وزن مٹھی میں آ جانے والی اس انسانی آنکھ کے وزن سے کم ہے۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک انسانی آنکھ منوں سونے' چاندی' ہیرے اور جواہرات سے زیادہ وزن رکھتی ہو؟ تب سکندر مقدونی نے دربار کے دانش مندوں کو طلب کیا اور یہ مسئلہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے یک زبان ہو کر جواب دیا کہ آنکھ لامحدود انسانی خواہشات کا استعارہ ہے اور ان خواہشات کو پورا کرنے کے لیے دنیا کے تمام خزانے ناکافی ہیں۔ پھر ان میں سے ایک دانش مند نے اس آنکھ پر چٹکی بھر خاک ڈال دی اور کہا کہ اب اسے تولا جائے۔ سکندر نے دیکھا کہ میزان میں رکھی ہوئی چند مثقال چاندی بھی اس آنکھ کے وزن سے

بہت زیادہ تھی۔ پھر وہ کچھ کہے بغیر اس دروازے سے لوٹ گیا تھا کہ اسی میں دانائی تھی۔

سمیر نے یہ حکایت پہلے اپنی ماں سے سنی پھر ربی داؤد کی کتاب میں پڑھی تھی اور اپنے دل پر کندہ کر لی تھی۔ اسی حکایت نے اسے عیش و طرب کی اس دنیا میں راستی پر رہنے اور اپنا دل مارنے کی ہمت دی تھی۔ یا شاید یہ طاقت اسے فلسفے نے دی ہو جس پر وہ کم عمری میں ہی عاشق ہو گیا تھا۔ اس کی کیا بساط کہ وہ خواہشوں کی دلدل میں اتر نہ جاتا لیکن فلسفہ اس کی دستگیری کو آتا تھا۔ اور ربّی داؤد کی حکایت اسے لڑکھڑانے نہیں دیتی تھی۔ چند مہینے اور رہ گئے تھے پھر وہ واپس چلا جائے گا اور طنجہ کی کسی یونیورسٹی میں عربی ادب پڑھائے گا اور فارغ وقت میں فلسفے میں ڈوب جائے گا۔ واپسی کے خیال سے ہی اس کا دم لوٹنے لگتا۔ ماریا تو یہیں رہ جائے گی۔ وہ اپنے دل کو سمجھاتا' ماریا کو یہیں رہنا تھا' کروڑ پتی باپ کی بیٹی' جس کا باپ ہاؤس آف لارڈز کا ممبر تھا اور جو عربی ادب اس لیے پڑھ رہی تھی کہ یہ اس کے باپ کی خواہش تھی' جو اسے مشرق اوسط کا ماہر بنتے دیکھنا چاہتا تھا۔

وہ جب کاسابلانکا لوٹ جانے کی خواہش کرتا تو اس کے ساتھ پڑھنے والے مصری اور فلسطینی لڑکے ہنستے ''تم یہاں کیوں نہیں رہنا چاہتے؟'' وہ اس سے پوچھتے۔

''نہیں' میں یہاں نہیں رہ سکتا' یہاں کا موسم میری روح کو یخ کر دیتا ہے۔ میں واپس جاؤں گا اور یونیورسٹی میں پڑھاؤں گا۔ ہمارے یہاں اچھے استاد نہیں ملتے'' وہ آہستہ سے کہتا۔

''تم یروشلم کیوں نہیں چلے جاتے۔'' فلسطین کے ابو ہاشم کے لہجے میں طنز کی کاٹ ہوتی۔

''میں وہاں کیوں جاؤں؟ وہاں کی فضاؤں میں عقیدے کی حکمرانی ہے۔ عقیدے اور فلسفے کی تو کبھی نہیں بنی۔ ہزار برس پہلے ہماری ہواؤں میں فلسفیوں کی خوشبو تیرتی تھی۔''

''اور تمہارے سمندر میں تیرنے والی مچھلیاں بھی فلسفہ پڑھتی اور پڑھاتی تھیں' ' ابو

ہاشم اس پر طنز کرتا۔

''تمہارے جد نے ان ہی مچھلیوں کا شکار کیا تھا اور تمہاری جدہ نے تل کر اسے کھلایا تھا' تب ہی تم فلسفے میں طاق ہو۔'' سعید مصری نے کہا تھا۔

''تم غلط کہہ رہے ہو سعید۔ یہ الف لیلہ والی کہانی کی مچھلیاں تھیں جنہیں تلا جائے تو وہ آنچ پر سے اٹھ کر باتیں کرتی تھیں۔'' یہ اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا مائیکل تھا جو کم سے کم لطیفے سنانے میں ہرگز بخیل نہ تھا۔

ماریا ان سب کی باتیں سن کر مسکراتی اور پھر اپنی لمبی اور خم کھائی ہوئی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھتی تو اس کے اندر جیسے نیزے اتر جاتے۔ خواہش کے نیزے۔ تب وہ سکندر مقدونی کے دربار کے دانش مند کی طرح اپنی آنکھ پر چٹکی بھر خاک ڈال لیتا۔ خواہش کا کوئی شمار نہ تھا' وہ جانتا تھا کہ آنکھوں کے سمندر میں خواہشیں مگر مچھ کی طرح جبڑے کھولے تیرتی ہیں اور انسانوں کو نگل جاتی ہیں اور وہ نبی یونس تو نہ تھا جسے مچھلی نے نگلا تھا اور پھر اُگل بھی دیا تھا۔

وہ چلتا چلا گیا۔ اس کی پنڈلیاں تھکن سے تڑخ رہی تھیں اور آنکھوں میں نیند چبھ رہی تھی۔ اسے اپنا خچر یاد آیا۔ وہ دن یاد آئے جب وہ اس پر لد جاتا اور اسے ٹخ ٹخاتا ہوا میلوں دوڑاتا۔ جہاں جی چاہتا ہو آتا۔ اسے اپنے خچر کی ٹانگیں یاد آئیں جو بھاگ بھاگ کر تھک جاتی ہوں گی لیکن خچر شکایت نہیں کر سکتے تھے۔ گھر سے دوری کتنی غیر اہم چیزوں کو کس قدر اہم بنا دیتی ہے' خاکستری کھال والا خچر اسے کس قدر یاد آتا تھا۔ وہ لندن کی سڑکوں پر چلتا چلا جاتا اور دنیا اس کی نگاہوں کے سامنے کسی ماہر مراکشی رقاصہ کی طرح عشوہ و ادا کے ساتھ رقص کرتی۔ وہ اپنے ٹرانزسٹر پر وہ سارے پروگرام سنتا رہتا جو اسے پسند تھے اور اس کے ذہن کی تربیت کرتے تھے, ان میں سے ایک بی بی سی ریڈیو 4 بھی تھا۔

اس کے کانوں میں بی بی سی ریڈیو 4 کے اناؤنسر کی آواز گونجی'' اب آپ Sir Anthony Kenny اور Amira Benson, Peter Adamson سے

مشہور زمانہ فلسفی Averroes پر گفتگو سنیں گے۔" وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی لیکن ساتھ ہی اسے طیش آنے لگا۔ ہمارے ابن رشد کو اوی روس کہتے ہیں۔ ولد الحرام۔ پھر اسے شرم آ گئی۔ اگر ماں نے، بہنوں نے سن لیا ہوتا؟۔ اس کے کان کی لویں اس خنکی میں بھی گرم ہو گئیں۔ اس نے سر کو جھٹکا اور توجہ سے ان تینوں کی گفتگو سننے لگا۔

واٹرلو اسٹیشن تک پہنچتے ہوئے بھی ان تینوں کی گفتگو جاری تھی اور اس کا دل وجد کر رہا تھا۔ یہ اس کے وطن کی سرزمین تھی جسے کچھ دنوں کے لیے سہی اس عظیم جلاوطن فلسفی کا مدفن ہونے کی سعادت نصیب ہوئی تھی، بعد میں اس کی ہڈیاں قرطبہ لے جائی گئی تھیں اور وہ اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوا تھا۔

اس کی نگاہ ان روشن رنگین اشتہاروں کی طرف بھٹکی جو لوگوں کو اٹلی، اسپین اور یونان کی طرف بلاتے تھے۔ اس نے آرزو مند نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور پھر یہ دیکھ کر پلیٹ فارم پر دوڑ لگا دی کہ نور بری جانے والی ٹرین کو روانہ ہونے میں صرف دو منٹ رہ گئے ہیں۔ الیکٹرانک بورڈ پر لکھے ہوئے لفظ اور ہندسے سب کو منزل کی خبر دے رہے تھے۔ منزل۔ اسے ہنسی آئی۔ پلیٹ فارم نمبر دس۔ آٹھ۔ چھ۔ چار۔ وہ اپنا ٹریول کارڈ جیب میں رکھتے ہوئے اس ٹرین کی طرف لپکا جس کا انجن سانس لے رہا تھا۔ ایک سیاہ فام عورت نے جو نیلے یونیفارم میں تھی اسے اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے کمپارٹمنٹ میں چڑھ گیا۔ اس وقت مسافر عموماً کم ہوتے تھے۔ لیکن آج وہ بالکل خالی تھا۔ اس نے سکون کا سانس لیا۔ اب وہ اپنی تھکی ہوئی ٹانگیں سامنے کی سیٹ پر رکھ سکتا تھا۔ اس نے ٹانگیں پھیلائیں، تھکن اس کے ریشے ریشے میں بسی ہوئی تھی اور بھوک اس کی آنتوں میں پھیرے ڈال رہی تھی۔ اس نے اپنے اس کمرے کا تصور کیا جو کسی زمانے میں لینڈ لیڈی کے گھر کا اسٹور تھا۔ لیکن اب افریقی اور ایشیائی لوگوں کے بیڈ روم کا کام دیتا تھا۔ لکڑی کا بنا ہوا وہ اسٹور جو سردیوں کے موسم میں برف کی طرح ٹھنڈا رہتا تھا اور جہاں ہیٹنگ سسٹم بھی نہیں تھا۔ جہاں آگ نہیں جلائی جا سکتی تھی۔ وہ بجلی کا ہیٹر تو

خرید سکتا تھا لیکن بجلی کا بل۔؟ ایک بڑی عیاشی۔ اسے کھڑکی کے طاق پر رکھی ہوئی حلوے کی پلیٹ اور پیٹا بریڈ یاد آئی اور اس کا ذائقہ اس کے منہ میں گھل گیا۔ گرم کافی سے لبریز مگ جس پر وہ اپنے ہاتھ گرم کرے گا' ٹھنڈا بستر جو کچھ دیر بعد اس کے بدن کی حرارت سے گرم ہو جائے گا۔ وہ پڑھنے کے لیے نیم دراز ہو جائے گا لیکن کچھ ہی دیر بعد نیند اس کی آنکھوں میں بستر بچھائے گی۔ نینداور نان جویں' دنیا کی سب سے بڑی راحت۔

ٹرین اسے اپنی بانہوں میں جھلا رہی تھی وہ اونگھنے لگا۔ گاڑی آہستہ ہوئی اور دو پولیس والے چڑھ آئے۔ ایک لحظے کے لیے اسے گھبراہٹ سی ہوئی' وہ اپنی نشست پر سمٹ گیا۔ پولیس والے اسے برے لگتے تھے۔ بہت ہی برے۔ ان کے درمیان ایک بوڑھا تھا۔ سمیر کے دل پر گھونسا لگا۔ وہ اس بوڑھے عرب کو بانہوں سے پکڑے ہوئے تھے جس کے بدن پر نسواری رنگ کے کمبل کا طوغ تھا۔ پیروں میں چمڑے کے جوتے۔ پولیس والوں نے اسے بے دردی سے دھکیلا تو وہ لڑکھڑا گیا۔ سمیر اپنا خوف بھلا کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس بوڑھے عرب کو سہارا دیا۔ دونوں افسر کچھ بڑبڑائے' سمیر کی یہ حرکت انہیں ناگوار گزری تھی لیکن سمیر کیا کرتا۔ وہ شخص عرب تھا اور بوڑھا تھا۔ اور تب سمیر کو اس کے ہاتھوں میں پڑی ہوئی ہتھکڑیاں دکھائی دیں۔ اس نے اپنی آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کی۔ نائن الیون کے بعد دنیا سر کے بل کھڑی ہوگئی تھی۔ عرب اور ایشیائی شک وشبے کی دلدل میں دھکیل دیئے گئے تھے۔

ریل پل پر سے گزر رہی تھی۔ اس کی نظر اٹھی نیشنل تھیٹر کی عمارت روشنیوں سے جگمگا رہی تھی اور اس کا عکس دریا کی لہروں میں تیرتا تھا۔ کچھ دیر پہلے اس نے واٹرلو اسٹیشن پر اس ڈرامے کا اشتہار دیکھا تھا۔ تھیٹر کے اوپر گلیلیو اور بریخت کا نام دور سے نظر آ رہا تھا۔ سمیر نے بوڑھے کو گہرے سانس لیتے سنا تو اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی تھیٹر کی روشنیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا سر طوغ کے سرپوش میں چھپا ہوا تھا اور چہرہ نیم تاریکی میں تھا۔

پولیس افسروں میں سے ایک نے دوسرے سے کچھ کہا پھر اپنی جیب سے چابی نکال کر ایک ہاتھ کی ہتھکڑی کھولی اور اسے نشست کے ساتھ لگے ہوئے ڈنڈے میں ڈال کر بند کر دیا۔ اب بوڑھا اپنی نشست کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ سمیر کا جی چاہا کہ ان پولیس والوں کا مار مار کر بھرتہ بنا دے لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ بیکار ہے' وہ اسے بھی باندھ کر لے جاتے اور جیل میں ڈال دیتے۔ یا شاید گوانتاناموبھیج دیتے۔ وہاں سے کیسی ہولناک خبریں اور تصویریں آتی تھیں۔ ان دونوں پولیس افسروں نے اسے گھور کر دیکھا' ایک نظر بوڑھے پر ڈالی اور پھر کمپارٹمنٹ کو دوسرے کمپارٹمنٹ سے جوڑنے والا دروازہ کھول کر دوسری طرف چلے گئے۔

سمیر جلدی سے بوڑھے کے پاس جا بیٹھا اور اس کے اس بازو کو سہلانے لگا جو ابھی ہتھکڑی سے آزاد ہوا تھا۔ لیکن وہ بازو کہاں تھا وہاں تو بس ہڈی پر چمڑا منڈھا ہوا تھا پھر وہ اس بوڑھے سے باتیں کرنے لگا۔ عربی بولتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ صحرا میں کسی ٹھنڈے میٹھے چشمے کا پانی پی رہا ہو۔ اس نے بوڑھے سے گرفتاری کا سبب پوچھا تو وہ ہنس دیا۔

''میں ان کے خیال میں دہشت گرد ہوں۔ القاعدہ''

''یہ پاگل ہو گئے ہیں۔ بالکل پاگل۔'' سمیر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''دنیا ہمیشہ ایسے لوگوں سے بھری ہوئی تھی اور ہمیشہ بھری رہے گی۔ آج مجھے دہشت گرد کہہ کر ماردیں گے۔ کل فیلسوف کہہ کر قتل کرتے تھے میرا اور مجھ ایسے لوگوں کا مقدر ہمیشہ تحقیر اور تکفیر ہے۔ زمانہ سوچنے اور سچ بولنے والوں کا دشمن رہا ہے۔''

سمیر نے سر کھجایا۔ بڑے میاں بہت کتابی عربی بول رہے تھے' ان کے کئی جملے اس کی سمجھ میں نہیں آئے تھے لیکن انہوں نے فلسفے کا بھی ذکر کیا تھا۔

''آپ فلسفہ پڑھاتے ہیں؟'' اس نے ادب سے پوچھا۔

''نہیں۔ فلسفہ مجھ پر حرام کیا جا چکا' میری کتابیں چوک میں جلائی جا چکیں۔ مجھے جلاوطن کیا گیا۔'' بوڑھے نے آہ بھری۔

''کتابیں؟ آپ کی کتابیں جلائی گئیں؟'' سمیر کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ یہ سب کچھ تو بہت پہلے ہوتا تھا۔ مسلمان کتابیں جلاتے تھے۔ عیسائی کتابیں جلاتے تھے۔ Inquisition......اس کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔

''یہ سب کچھ تو سینکڑوں برس پہلے ہوتا تھا۔ اب یہ سب کچھ کہاں ہوا؟' اس کی خبر کیوں نہیں چھپی؟'' سمیر نے حیرت سے مردِ بزرگ کو دیکھا۔ سمیر لائبریری میں اخباروں کو پڑھتا نہیں تھا دیمک کی طرح چاٹ جاتا تھا۔

''کمال کرتے ہو نوجوان۔ آٹھ سو برس پہلے کی بات آج کے اخباروں میں کیوں چھپے گی۔'' مرد بزرگ نے کچھ ناراض ہو کر سمیر کو دیکھا۔

وہ انہیں شک بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ بڑے میاں پر شاید بہت زیادہ تشدد ہوا ہے تب ہی ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔

''لیکن'' ....

''لیکن ویکن کچھ نہیں عزیز۔ زمانہ مجھ سے برگشتہ ہو گیا تھا۔ میں امیر المومنین کا مقرب خاص۔ شہر کا قاضی القضاۃ پھر مجھے زندیق اور ملحد کہا گیا۔ میری گردن نہیں اتاری گئی لیکن مجھے سزا دی گئی اور سزا بھی کیسی۔ مجھے مسجد کی سیڑھیوں پر بٹھایا گیا کہ میں نمازیوں کے جوتے صاف کروں۔ میں نے ان بدبختوں کے جوتے صاف کیے جنہیں علم و حکمت سے' دانش و بینش سے نفرت تھی۔ نمازیوں سے کہا گیا کہ جب وہ نماز پڑھ کر واپس ہوں اور مجھ سے اپنے صاف جوتے وصول کریں تو عوض میں مجھ پر تھوکیں۔ میں نادر روزگار تھا۔ ارسطو کا شارح' سیاستِ افلاطون کی شرح میں نے لکھی۔ لیکن ہم نے ہمیشہ اپنی ذہانتوں سے نفرت کی۔ میں نے بس قوم عاد کے وجود کے بارے میں اپنی رائے ہی تو ظاہر کی تھی۔۔۔ کسی اور کا بیان نقل کیا تھا کہ سیارہ زہرہ کو دیوی کہا جاتا ہے۔''

سمیر کا سر چکرانے لگا۔ یہ شخص ابھی کہہ رہا تھا کہ اسے دہشت گرد سمجھ کر گرفتار کیا ہے اور اب یہ آٹھ سو برس پہلے کی بات کر رہا ہے۔ یہ مخبوط الحواس ہے یا میں مجنون

ہو چکا ہوں۔ سمیر نے اس دروازے کی طرف دیکھا جس سے پولیس والے برابر کے کمپارٹمنٹ میں گئے تھے۔ ریل رات کے اندھیرے میں فاصلوں کو نگل رہی تھی۔ نیشنل تھیٹر کی روشنیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔

''میں نیشنل تھیٹر میں گلیلیو دیکھنے جارہا تھا جب انہوں نے مجھے پکڑا۔ اب خدا جانے یہ مجھے کہاں لے جائیں گے۔ میں گلیلیو سے مل بھی نہ سکا۔'' بوڑھے کے لہجے میں تاسف تھا۔

''لیکن بزرگ محترم یہ تو گلیلیو پر ایک ڈرامہ ہے جسے جرمن ادیب بریخت نے لکھا ہے۔'' سمیر نے بوڑھے کو سمجھانا چاہا۔

''جانتا ہوں عزیز۔ بریخت کو بھی جانتا ہوں۔ مل چکا ہوں اس سے لیکن گلیلیو سے مل کر اسے مبارکباد دینا چاہ رہا تھا۔''

''کیسی مبارکباد؟'' سمیر کی عقل حیران تھی۔ بڑے میاں دہشت گرد نہیں پاگل ہیں۔ وہ بھی آخری درجے کے۔ اگلی پچھلی صدیوں کا آملیٹ بنائے دے رہے ہیں۔

''اس نے کہا تھا کہ سورج ساکن ہے اور زمین اس کے گرد گھومتی ہے۔ سو اسے قید کیا گیا' کہا گیا کہ وہ کفر بکتا ہے۔ میں اسے مبارکباد دینا چاہتا ہوں کہ کلیسائے روم نے 359 برس بعد سہی اس کے خلاف کفر والحاد کا فتویٰ ساقط تو کیا۔'' بڑے میاں بے تکان بول رہے تھے۔

سمیر کو ویٹکن کا بیان یاد آیا۔ پاپائے روم نے'' Mea Culpa..... Mea Maxima Culpa ''غلطی ہوئی...... بہت سنگین غلطی ہوئی'' جیسا جملہ نہیں کہا تھا لیکن یہ بیان بھی غلطی کے اعتراف سے کیا کم تھا۔

''میرے منبر و محراب سے میرے حق میں آٹھ سو برس کے دوران کبھی کوئی آواز نہ اٹھی۔ مجھ سے منسوب کیا گیا کہ میں نے سیارہ زہرہ کو خدا جانا۔ میرا شمار ملاحدہ اور زندقہ میں ہوا۔ سزا دی گئی' جلاوطن ہوا' موت اپنے وطن میں نہ آئی۔ فرشتگانِ خدا ہاروت اور ماروت زہرہ کے عشق میں چاہ بابل میں قیدی ہوئے۔ مجھ بندۂ خدا پر سیارہ

زہرہ کو خدا جاننے کا الزام لگا۔ میں تنہائی کے چاہ بابل میں قید ہوا۔'' اس کی آواز میں صدیوں کے آنسوؤں کا نم تھا۔

''بزرگ محترم۔ میں آپ کا نام جاننے کی سعادت......''

بوڑھے نے اس کا جملہ پورا نہ ہونے دیا'' میں ابوالولید محمد بن احمد بن محمد ابن رشد' قرطبہ کے قاضیوں کے گھر میں پیدا ہوا تھا۔''

سمیر کو زور کا چکر آیا اور اس کا حلق خشک ہو گیا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ نہیں یہ ناممکنات میں سے ہے۔ کیا واقعی وہ اس کے حضور میں تھا جس کے بعد مسلمانوں کی مملکت میں عقل کے دروازے بند ہوئے اور جس نے یورپ کے تن مردہ میں عقل وخرد کی روح پھونکی؟

وہ بوڑھے کی قدم بوسی کے لیے اس کے پیروں کی طرف جھکا۔ اسے پڑھی ہوئی کتابیں یاد آ گئیں۔ یہ وہی تھا جس کے زوال کا آغاز خلیفہ المنصور کے اس سوال سے ہوا تھا کہ دنیا وقت میں پیدا ہوئی یا وقت سے باہر؟۔ اس نے جواب میں کہا تھا کہ دنیا وقت سے باہر پیدا ہوئی۔ یہ وہی تھا جس کی چند کتابوں کو سمیر کے بزرگ آگ کے شعلوں سے بچا کر اپنی جیبوں اور آستینوں میں چھپا کر لے گئے تھے اور سارے یورپ میں پھیل گئے تھے۔ جس کے ارسطو کے تراجم چار سو برس تک میلان' کیمبرج اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں پڑھائے گئے۔ اس کے لیے کرسٹوفر کولمبس نے کہا تھا کہ ابن رشد ان مصنفین میں سے ہے جن کی کتابوں نے مجھے نئی دنیا کی تلاش میں روانہ کیا۔ اس کی تصویریں یورپ کے تمام بڑے مصوروں نے بنائی تھیں۔ برنینی اور رافیل نے اور جسے ملٹن اور دانتے نے جہنم میں جگہ دی تھی۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کا جہنم ایک دوسرے سے جدا نہ تھا۔

اس کے کانوں میں کسی عورت کی چیخ گونجی۔ سمیر نے چونک کر سر اٹھایا تو وہ اسٹیل کی بار سے ٹکرا کر جھنجھنا گیا۔ اس نے سر کو جھٹکا' بوڑھا کہاں چلا گیا تھا اور یہ عورت کہاں سے آ گئی تھی اور کیوں چیخ رہی تھی؟ سمیر نے نیند سے بھری ہوئی آنکھوں سے اس عورت کو دیکھا۔ برابر کے کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر کنڈکٹر اندر آ گیا۔ وہ عورت سمیر کی

طرف اشارہ کر کے کچھ کہہ رہی تھی۔ سمیر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

لیکن وہ بوڑھا کہاں گیا؟ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔

اگلے اسٹیشن پر جب کنڈکٹر نے سمیر کو اتارا تو نور بری کا اسٹیشن ابھی دور تھا۔ تھکن، نیند، بھوک اور حیرت سے وہ نڈھال تھا۔ کہیں سے دو پولیس والے پلیٹ فارم پر نمودار ہوگئے۔ بڑھیا انہیں بتا رہی تھی کہ وہ موبائل پر کسی سے عربی میں باتیں کر رہا تھا اور عجیب عجیب حرکتیں کر رہا تھا۔

''لیکن میرے پاس موبائل نہیں ہے۔'' سمیر نے احتجاج کیا۔

''تم کس سے باتیں کر رہے تھے؟''

''ابوالولید محمد بن احمد بن محمد ابن رشد سے۔'' سمیر نے جھنجھلا کر کہا ''لیکن وہ بوڑھا کہاں گیا؟ وہ تو میرے ساتھ تھا۔''

''تو کیا تمہارے ساتھ کوئی بوڑھا بھی تھا۔'' ایک پولیس افسر نے اسے غور سے دیکھا۔

''ہاں۔ وہ گلیلیو سے ملنے آیا تھا۔ پولیس والوں نے اسے پکڑ لیا۔''

''گلیلیو سے ملنے؟''

''کون تھا وہ؟'' وہ اسے پلیٹ فارم پر بنے ہوئے ایک کمرے میں لے آئے تھے؟ یہ شاید پولیس والوں کے لیے مخصوص تھا۔

''میں نے ابھی تمہیں نام بتایا ہے۔'' سمیر کی جھنجھلاہٹ بڑھنے لگی۔

'' تم تو بہت سے مسلمانوں کے نام لے رہے تھے۔''

''بہت سے نہیں صرف ایک نام۔ ہم عربوں کے نام ایسے ہی ہوتے ہیں۔''

''عرب'' دونوں پولیس افسروں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور سر ہلایا۔

یہ لوگ عذاب بن گئے تھے۔ جس کا جی چاہتا تھا منہ اٹھائے انگلینڈ چلا آتا تھا۔

دونوں گہری نگاہوں سے اسے دیکھتے رہے۔

سمیر کو بھوک لگ رہی تھی لیکن اس سے کہیں زیادہ نیند اسے بے حال کیے ہوئے

تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بزرگ کہاں گیا جو مفتون تھا لیکن تھا تو اسی کی طرح عرب۔ ذہن کہر میں ڈوبا ہوا شہر ہو گیا تھا جس میں ساری روشنیاں چھپ گئی تھیں۔

''مجھے جانے دو۔'' سمیر نے کہا'' میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ تم مجھے روک نہیں سکتے۔'' سمیر نے اپنا غصہ ضبط کیا۔ یہ سراسر ظلم تھا۔

''ہم تمہیں یوں نہیں چھوڑ سکتے۔'' ایک پولیس افسر نے کہا۔

'' ہمیں تفتیش کرنی ہوگی۔ تم کس راستے سے یہاں آئے تھے؟ کون لایا تھا؟'' دوسرے نے پوچھا۔

سمیر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا'' میں ایر فرانس سے آیا تھا۔ ہیتھرو ایئر پورٹ پر اترا تھا''

''تمہارے کاغذات؟'' پولیس افسر نے میز پر رکھے ہوئے کمپیوٹر کا مانیٹر اپنی طرف گھمایا۔

سمیر نے اپنی جیب سے کاغذات نکالے اور اس کے سامنے رکھ دیئے۔ وہ انہیں الٹنے پلٹنے لگا۔ اس نے قدرے حیرت سے سمیر کو دیکھا۔

''تمہارا نام؟''

''سمیر شموئیل''

''شموئیل؟ تم نے اپنا نام کیوں بدلا؟'' پولیس افسر کی نگاہیں اس کے چہرے کو ٹٹول رہی تھیں۔

''میں اپنا نام کیسے بدل سکتا تھا۔ نام باپ رکھتے ہیں' پیدا ہونے والے بیٹے نہیں۔''

''تمہارا مذہب؟''

''میں یہودی ہوں۔''

''یہودی؟'' دونوں پولیس افسروں کے چہروں پر ناقابلِ یقین حیرت تھی ''لیکن تم تو مراکو سے آئے ہو۔''

''ہاں میں کاسابلانکا سے آیا ہوں۔''

''تو پھر تم یہودی کیسے ہو سکتے ہو؟ وہاں تو مسلمان رہتے ہیں۔''

''وہاں یہودی اور عیسائی بھی رہتے ہیں۔'' سمیر نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔

ایک پولیس افسر نے کی بورڈ پر انگلیاں دوڑائیں۔ اسکرین پر سمیر کی تصویر اور اس کے کاغذات میں درج تفصیلات ابھر آئیں۔

ایک مراکشی طالب علم جو وظیفے پر آیا تھا' اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں پڑھتا تھا۔ اس نے دوسرے کی طرف دیکھا ''یہ درست کہہ رہا ہے۔''

''تو پھر مجھے جانے دو۔'' سمیر نے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔

''نہیں' تم کہیں نہیں جاسکتے۔'' ایک نے اس کو بازو سے پکڑ کر بٹھا دیا۔ ''دہشت گردوں کے بہت سے Cell ہیں۔ کوئی کرسچن ہے۔ کوئی شنٹو اور بدھ مت کا ماننے والا جاپانی۔ اب تم یہودی نکل آئے۔ ہمیں تفتیش کرنی ہوگی۔''

''تم موبائل پر کس سے عربی میں باتیں کر رہے تھے؟ کیا انفارمیشن دے رہے تھے؟''

''میرے پاس موبائل ہے ہی نہیں تو اس پر بات کیسے کرتا؟'' سمیر کو غصہ آنے لگا' یہ لوگ کوئی معقول بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔

''لیکن وہ بڑھیا کہہ رہی تھی۔''

''بکواس کر رہی تھی'' سمیر کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔'' ابن رشد مجھ سے بات کر رہا تھا۔ گلیلیو سے ملنا چاہتا تھا۔ تم لوگوں نے اسے دہشت گرد سمجھ کر گرفتار کرلیا۔ میں اور وہ عربی میں باتیں کر رہے تھے۔ تم اپنے ان دوستوں کو کیوں نہیں بلاتے جو اسے گرفتار کر کے لائے تھے۔ ان سے کیوں نہیں پوچھتے'' سمیر کی آواز تیز ہوگئی۔

وہ دونوں اسے دیکھتے رہے پھر کمرے میں تنہا چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ دروازہ ان کے پیچھے بند ہوگیا۔ سمیر نے نیند سے بے حال ہو کر میز پر سر رکھ دیا۔

انہوں نے چند فون کیے۔ لیکن ہر جگہ سے جواب نفی میں ملا۔ ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا۔ کسی بوڑھے عرب کو گرفتار نہیں کیا گیا تھا۔ یہ لڑکا کبھی ابن رشد کا نام لیتا تھا' کبھی

گلیلیو کا۔

''یہ سب کوڈ ورڈز ہیں۔'' ایک نے کہا۔

''نیشنل تھیٹر میں بریخت کا ڈرامہ ''گلیلیو'' چل رہا ہے' وہاں کی نگرانی شروع کرنی ہوگی۔ فوراً۔'' دوسرے نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرا۔

وہ اندر آئے تو سمیر میز پر سر رکھے سو رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے اسے ہلایا وہ ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ اس نے نیند میں ڈوبی ہوئی سرخ آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

''تم کتنی زبانیں جانتے ہو۔''

''عربی میری مادری اور عبرانی مذہبی زبان ہے۔ فرنچ اور اسپینش میں نے اسکول اور کالج میں پڑھیں۔ انگلش میں نے یہاں آنے کے لیے سیکھی۔'' سمیر کے لہجے میں غرور تھا۔

دونوں افسروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اہم نکتہ۔ پانچ زبانیں جانتا ہے۔ کوئی بہت بڑا نیٹ ورک ہے۔ اب تک یہودی شامل نہیں ہوتے تھے۔ اب وہ بھی ہونے لگے۔

''تم نے اتنی زبانیں کیوں سیکھیں؟''

سمیر نے چونک کر دونوں کو دیکھا۔ ''اتنی زبانیں جاننا تو بہت فخر کی بات ہوتی ہے۔ ہمارا ابن بطوطہ جانے کتنی زبانیں جانتا تھا اور ہر ملک میں ایک بیوی رکھتا تھا۔''

''کون ابن بطوطہ؟ کیا اسامہ بن لادن کا کوئی ساتھی؟ اسامہ کی بھی کئی بیویاں ہیں''

''جہنم میں جاؤ۔ ہمارے ابن بطوطہ کو نہیں جانتے' جاہل کہیں کے۔'' سمیر نے انہیں حقارت سے دیکھا۔

وہ جب اسے سیل میں بند کر کے جا رہے تھے تو نیند اور بھوک کے باوجود اس کا دل اس بوڑھے کے لیے خون ہو رہا تھا جو اس کی طرح آلِ ابراہیم میں سے تھا اور تنہائی کے چاہِ بابل میں رہتا تھا۔

❖❖❖

نیند کا زرد لباس

پرسوں دن بھر وہ دالان کے ایک کونے میں بیٹھی کاپی پر جھکی لکھتی رہی اور دھوپ سے بچنے کے لیے اپنی نشست بدلتی رہی۔ لفظوں اور سطروں کو کاٹتی اور پھر سے لکھتی رہی۔ اس دن سے پہلے وہ مجھ سے ایک ایک لفظ پوچھتی تھی لیکن پرسوں اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ شام کو میں نے دیکھا کہ اس کی انگلیاں روشنائی سے لتھڑی ہوئی ہیں اور وہ کیاری کے پاس بیٹھی انہیں صابن سے رگڑ کر دھو رہی ہے۔

رات آئی تو ہم دونوں اپنی چارپائی پر لیٹے رہے' آسمان کی سیاہی مائل نیلگونی میں ذیقعد کی تیسری رات کا چاند ہماری آنکھوں کے سامنے طلوع ہوا اور ڈوب گیا۔ وہ اسے ایک ٹک دیکھتی رہی پھر اس نے ایک گہری آہ بھری ''اگلی عید ہم جانے کہاں کریں گے؟'' یہ سوال نہ تھا' خود کلامی تھی۔

سرکاری حکم کا خنجر ہم دونوں کے' ہم سب کے سینوں میں اترا ہوا تھا۔ کچھ فاصلے سے ہتھوڑے کی آواز آرہی تھی۔ اس کے بابا اور میرے پھوپھا نے ہمارے گھر کے سامنے کی کھلی جگہ پر ایک خیمہ لگالیا تھا تاکہ ہمیں تکلیف نہ ہو اور اب وہ آہنی میخوں کو اکھاڑ رہا تھا۔ پھوپھی مرجانہ ٹاٹ کے بوروں میں برتن بھانڈے بھر رہی تھی۔ کپڑوں کی پیٹی اس نے سب سے پہلے تیار کرلی تھی۔ آٹے' چاول' شکر اور گھی کا کنستر' مٹی کے تیل کا پیپا' لالٹین' بالٹیاں' چائے' نمک اور خشک میوے کی ٹوکریاں' پھوپھی مرجانہ ابا کے ماموں کی بیٹی تھی جسے وہ بہت چاہتے تھے۔ ان کے دکھے ہوئے دل پر ہم سب نے مرہم

رکھنے کی کوشش کی تھی اور اب اچانک ان سب لوگوں سے بستی خالی کرانے کا حکم آ گیا تھا جس کے سامنے سب بے بس تھے۔

''ہم اب جہاں جائیں گے' وہاں کی زمین بھی ایسی ہی مٹیالی ہوگی' آسمان بھی اتنا ہی نیلا ہوگا لیکن شمسہ باجی وہاں تم نہیں ہوگی۔'' اس کے لہجے کا درد میرے دل پر آرے چلا گیا تھا۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ یہ شب سرخاب ہے' جدائی کی رات۔

پھوپھی مرجانہ' پھوپھا' پروین اور اس کے دو بھائی سال بھر پہلے باجوڑ آئے تھے۔ پھوپھا بہت خوددار تھا' رات ہوتی اور حجرے میں جلتے ہوئے چراغ کا تیل ختم ہونے لگتا اور زور زور سے باتیں کرنے والے مردوں کی آوازوں کو بھی نیند آنے لگتی تو میرا پھوپھا اور اس کے دونوں بیٹے باہر خیمے میں جا سوتے۔ سردیاں ختم ہوئیں تو پروین اور میں ایک ہی چارپائی پر آنگن میں سونے کے لیے لیٹتے لیکن سونے سے پہلے پروین کی باتوں کا پٹارا کھل جاتا۔ وہ بموں کی برسات اور میزائلوں کی سنسناہٹ کے ساتھ سفر کرتی ہوئی اپنی چہیتی بہن اور بھائی کی اور اپنی ایک ہتھیلی کی جدائی سہہ کر ہمارے علاقے میں پہنچی تھی۔ یہ خانماں بربادوں کا قافلہ تھا جس میں ہزارہا لوگ اور ان کے جانور تھے۔ ہمارے بستی کے کھلے میدان خیموں سے بھر گئے' جن کے رشتہ دار ہمارے یہاں آباد تھے انہوں نے اپنے بے خانماں رشتوں کے لیے اپنے دلوں اور گھروں کے دروازے کھول دیے تھے۔

کراچی میں اپنی نانی کے بیوہ ہوجانے کے بعد مجھے باجوڑ میں اپنے گھر کا رخ کرنا پڑا تھا۔ یہ نانا اور نانی کی محبت تھی کہ انہوں نے برسوں مجھے اپنے پاس رکھا اور میں وہاں سے دسویں جماعت پاس کرسکی تھی۔ اب جبکہ میں کالج جانے کے خواب دیکھ رہی تھی نانا قبر میں اترے اور میرے خواب بھی ان کی قبر میں سوگئے۔ بابا جب مجھے گھر واپس لے جانے کے لیے آئے تو اپنے بیٹوں کی دست نگر ہوجانے والی نانی نے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے اور بیشمار دعاؤں کے ساتھ مجھے رخصت کردیا تھا۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ ان میں سے کوئی دعا قبول نہیں ہوگی۔ مظلوموں کی دعائیں آسمان پر باریاب نہیں ہوتیں' ہم کہاں کی نرالی تھیں۔

گھر پہنچ کر میں نے اپنا برقع اتار کر کھونٹی پر لٹکایا اور اماں کے گلے لگ کر ہچکیاں لیتی رہی۔ میں کالج اور یونیورسٹی سے پڑھوں اور پروفیسر بنوں۔ یہ نانی کا اور اماں کا خواب تھا جو انہوں نے میری آنکھوں میں رکھ دیا تھا لیکن تقدیر کا تیر ہمارے سینوں میں پیدائش کے وقت سے ہی پیوست ہوتا ہے۔ اسے سینے سے کھینچ کر ہم کیسے نکالیں؟۔

مجھے اس کی آمد کا پہلا لمحہ یاد ہے۔

کراچی سے آنے کے بعد میں نے اپنے گھر میں مکتب کھول لیا تھا۔ دالان میں چٹائی پر آس پاس کی لڑکیاں بیٹھ کر پڑھتیں۔ میں اسی کو اپنی معراج سمجھتی تھی کہ ہماری لڑکیاں کچھ پڑھ لیں، لکھنا سیکھ لیں۔ لڑکیوں کے لیے اسکول تھے۔ لیکن انہیں دور کے اسکولوں میں جانے کی اجازت نہ تھی۔

بابا جب ان لوگوں کو لے کر گھر میں داخل ہوئے تو اس کی نظر دالان میں بیٹھی لڑکیوں پر اور پھر مجھ پڑی تھی۔ میں اسے اور پھوپھی کو دیکھتے ہی دالان کی تین سیڑھیاں اتر کر صحن میں چلی گئی تھی جہاں پھوپھی مرجانہ اماں سے گلے مل رہی تھی۔

''تم شمسہ باجی ہو؟'' اس کے لہجے میں اشتیاق تھا۔ ''ماما مجھے تمہارے بارے میں بتاتے ہوئے آئے ہیں۔'' میں مسکرائی تھی اور اس کی پیشانی چوم لی تھی۔

''باجی۔ تم مجھے بھی پڑھاؤ گی؟'' اس نے مجھ سے پوچھا تھا اور ایک نظر دالان کی طرف ڈالی تھی جہاں بیٹھی ہوئی لڑکیاں اپنی کتابیں بھول کر ہماری طرف دیکھ رہی تھیں ''لیکن بابا کے پاس روپے نہیں ہیں''۔ اس کے لہجے میں آزردگی تھی۔

''میری جان تم میرا خون ہو اور خون کے رشتوں کے درمیان روپے نہیں آتے۔'' میں نے اس سے کہا تھا اور اس کے سفید رخساروں کے نیچے شمعیں جل اٹھی تھیں۔

میں اسے کیا بتاتی کہ میرے پاس آنے والی بیشتر بچیوں کے ہاتھ خالی تھے۔ یوں بھی ان میں سے اکثر کے باپ لڑکیوں کے پڑھنے لکھنے کو فضول سمجھتے تھے اور کچھ کے خیال میں یہ شیطانی کام تھا۔ یہ ان کی مائیں تھیں جنہوں نے خود کبھی کتاب کا منہ نہیں دیکھا تھا لیکن اپنی بیٹیوں کے لیے وہ لفظوں اور کتابوں کے خواب دیکھتی تھیں۔

اکثر میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک ہی گھر میں رہنے والے شوہر اور بیوی کی سوچ میں اتنا فرق کیوں ہے؟ میں خوش بخت تھی کہ اپنے بابا اور اماں کی رضا سے میں نے میٹرک کیا۔ میں خاندان کی سب سے پڑھی لکھی لڑکی ۔ بابا اس بات پر فخر کرتے ہیں لیکن قبیلے کے کئی مرد انہیں بے غیرت سمجھتے ہیں۔

''یہ تمہارا خدائی خوار بیٹی۔'' وہ جملہ پورا نہیں کرتے' اپنے طیش اور نفرت کو زمین پر تھوک دیتے ہیں۔ بابا بہادر ہیں کہ ان جملوں کا اثر نہیں لیتے۔ میں ان کے لیے چھپ کر روتی ہوں کہ میری وجہ سے انہیں اتنے کڑوے جملے سننے پڑتے ہیں۔ اماں چپکے چپکے ان کی ہمت بڑھاتی ہیں ''غم مت کرو بخت زمین خان۔ یہ گمراہ ہیں' ان کی وجہ سے ہمیں اپنا راستہ کھوٹا نہیں کرنا چاہیے۔''

بابا انہیں پشاور سے بیاہ کر لائے تھے۔ انہوں نے پانچ جماعتیں پڑھی ہیں۔ ان کا یہ ہنر' میرے بابا کے خاندان میں عیب بن گیا۔

میں پروین کو دیکھتی ہوں' وہ سو رہی ہے...... جاگتی ہوتی تو اب تک جانے کتنے سوال کر چکی ہوتی۔ مشکل اور خطرناک سوال ایسے سوال تو مرد بھی نہیں کرتے۔ میں اکثر اسے آنکھیں دکھاتی اور خاموش رہنے کا اشارہ کرتی۔ کبھی کبھی یہ پوچھ لیتی کہ یہ وسوسے اس کے ذہن میں کہاں سے آتے ہیں۔

''مجھے نہیں معلوم باجی۔ لیکن یوں آتے ہیں جیسے تندور سے کوئی شرارہ اڑے یا چولہے میں جلتی ہوئی لکڑی سے شعلہ لپکے۔''

میں نے جب اسے پڑھانا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ میرے پاس آنے والی لڑکیوں سے زیادہ پڑھی ہوئی ہے۔ لکھنا اسے ٹوٹا پھوٹا آتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ پڑھنا اسے اس کے بابا نے سکھایا تھا۔ وہ شہر جاتا تو اس کے لیے کہانیوں کی کتابیں اور رسالے لے کر آتا' جنہیں وہ چھپا کر رکھتی اور جب گھر میں اس کے بھائی نہ ہوتے تو انہیں پڑھتی اور خیالوں میں کہاں کہاں نہ ہو آتی۔ اس نے الف لیلہ کی کئی کہانیاں پڑھ رکھی تھیں۔ شاہنامۂ فردوسی کے اشعار اور گلستان و بوستان کی حکایتیں اسے یاد تھیں۔

''باجی پروانہ مجھے حاتم طائی اور ابوالحسن کی کہانیاں سناتی تھیں۔ انہوں نے مکتب میں مثنوی مولانا روم کی حکایتیں پڑھی تھیں۔ پھر علم کے طالبان آ گئے اور لڑکیوں کے مکتبوں پر تالا پڑ گیا۔ ''لڑکیاں پڑھیں گی تو کرشتان بن جائیں گی۔'' وہ ان کی نقل اتارتی اور زہریلے لہجے میں کہتی۔ ''پھر باجی پروانہ اور بھائی جلال کو بموں نے اڑا دیا۔'' وہ اپنا ہونٹ کاٹنے لگتی اور اپنے دائیں ہاتھ کو دیکھتی جس کی ہتھیلی نہیں رہی تھی۔ وہ ہر کام اپنے بائیں ہاتھ سے کرتی' اس ہاتھ سے اس نے لکھنا کتنی جلدی سیکھ لیا تھا۔ ہر کام کی اسے جلدی رہتی تھی۔ پڑھنے کی جلدی' لکھنے کی جلدی' سوال کرنے کی جلدی۔

کل رات اس نے بہت سی باتیں پوچھی تھیں۔ ان میں سے اکثر کے جواب مجھے نہیں معلوم تھے۔ مجھے اس سے یہ کہتے ہوئے شرم آتی تھی کہ وہ مجھ سے زیادہ ذہین ہے تب ہی ایسے سوال کرتی ہے۔ چٹیل پہاڑوں اور چلغوزے جیسے دماغ رکھنے والوں نے ہماری کیسی ذہانتیں ضائع کر دیں۔

کل رات ہم دونوں کو معلوم تھا کہ یہ آخری رات ہے جو ہم ایک ساتھ گزار رہے ہیں۔ شب سرخاب...... سرخاب کا جوڑا تو صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ایک ہو جاتا ہے لیکن ہم پھر جانے کبھی مل بھی سکیں یا نہیں۔

''باجی کیا یہ واقعی شہیدوں کی آنکھیں ہیں جو ہمیں دیکھتی ہیں اور کہتی ہیں کہ تم بھی اپنے باپ اور بھائی راہ خدا میں بھیج دو؟'' ایک رات اس نے آسمان پر پلکیں جھپکاتے ہوئے ستاروں کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

میں نے اس کا وہ بازو چوما تھا جس کی ہتھیلی نہیں تھی۔ اس میں جڑی ہوئی انگلیاں نہیں تھیں۔ ''کتابیں کچھ اور کہتی ہیں پروین۔'' میں نے آہستہ سے کہا تھا۔

چند لمحوں کے لیے وہ چپ ہو گئی تھی اور پھر اس نے پوچھا تھا ''ہمارے یہاں وہ کتابیں کب پڑھائی جائیں گی جن میں سب کچھ سچ لکھا ہو۔'' اس کے لہجے کی وہ کیفیت تھی جیسے کئی دن کے فاقے سے ہو اور چند نوالوں کے لیے ترس رہی ہو۔

''ایسی باتیں مت کیا کرو ابھی تم چھوٹی ہو۔'' میں نے اس سے کہا تو وہ ناراض

ہو گئی تھی۔

''میں اور چھوٹی؟ باجی میں نے اپنی پیاری بہن اور بھائی کو اپنی آنکھوں سے مرتے دیکھا ہے۔ میں ہتھیلی نہیں رکھتی۔ میں کابل سے یہاں تک کبھی اونٹ، کبھی خچر، کبھی ٹرک پر بیٹھ کر پہنچی ہوں۔ میں نے فاقہ کیا ہے، راستے میں انسانوں کی لاشیں دیکھی ہیں بچوں کے ڈھانچے۔ تم بادلوں کے پانی سے نہاتی ہو، میں بموں اور میزائلوں کی برسات سے گزری ہوں، تم کہتی ہو میں چھوٹی ہوں۔ چھوٹی تو تم ہو باجی جو یہاں بیٹھی ہو۔ میں تو کوہ مرُ کی تین چوٹیوں جتنی بوڑھی ہوں۔'' اس کے جملوں میں انگاروں کی دہک تھی۔ میں نے اسے اپنے سینے سے لگالیا۔

''دل کا تنور اس طرح نہیں دہکاؤ میری بو گوشہ'' میں نے کہا اور وہ میری زبان سے ''بو گوشہ'' سنتے ہی ہنس پڑی۔

''تم بو گوشہ کہتی ہوئی کتنی پیاری لگتی ہو۔ شیریں بھی تمہاری ہی طرح ہو گی، تب ہی خسرو اس کی تصویر دیکھ کر عاشق ہو گیا تھا۔'' اس نے لگاوٹ سے کہا اور میرے کانوں کی لویں تپنے لگیں۔

''تمہیں قصہ شیریں و خسرو کس نے سنایا ہے۔ بھلا تمہاری عمر ہے یہ داستانیں سننے کی۔'' میں نے اس سے ناراض ہونے کی کوشش کی۔

''یہ شکایت تم اپنی پھوپھی اور میری ماں سے کرو۔'' وہ شوخی سے ہنسی۔

وہ سچ کہہ رہی تھی، پھوپھی مرجانہ ہماری ان عورتوں میں سے تھی جو پیدائشی داستان گو ہوتی ہیں۔ سینکڑوں، ہزاروں کہانیاں، داستانیں، سینہ بہ سینہ پہنچنے والی تاریخ اسے از بر تھی۔ اس نے شاید پروین کو دودھ کے قطروں کے ساتھ کہانیوں کا شہد بھی پلایا تھا تب ہی وہ بات بے بات کہانیاں سنانے بیٹھ جاتی۔

''باجی یہ جو تمہارا علاقہ باجوڑ ہے اس کی اصل باج آوردن ہے۔ یہ علاقہ طاقت ور خانوں اور حکومت کو خراج ادا کرتا تھا اس لیے اس کا نام باجوڑ پڑ گیا۔'' اس نے ایک روز اپنے دیدے گھماتے ہوئے بتایا اور میں حیران رہ گئی۔

''تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟'' میں نے ذرا تیکھے لہجے میں پوچھا تھا۔

''بھائی خلیل خان پشاور یونیورسٹی میں پڑھاتا ہے۔ چھٹیوں میں کابل آیا تھا تب اس نے بتایا تھا' کہ ''روڈ'' جسے باہر والے دریائے باجوڑ کے نام سے پکارتے ہیں وہاں دیر کے علاقے' دریہہ میاں کلی میں بودھوں کی تباہ شدہ خانقاہ نکلی ہے۔ یہ علاقہ اب ''محل'' کہلاتا ہے۔ بھائی خلیل خان نے ہی باجوڑ کا مطلب بتایا تھا۔'' وہ صدیوں پرانی کسی روح کی طرح داستان سرائی کرتی تھی۔ کبھی وہ چنار کے جنگلوں کی سیر کا قصہ سناتی اور کبھی اس کی کہانیوں میں چکور اڑتے' نہروں کے کنارے مرغابیاں اور بطخیں آرام کرتیں' کبھی وہ کوہ مڑ کی تین چوٹیوں کے دامن میں اس بستی کا ذکر کرتی جسے سکندر اعظم نے آباد کیا تھا۔ اور یہ باتیں کرتے ہوئے اس کی کالے ہرن جیسی معصوم آنکھیں چمک اٹھتیں۔

وہ جب سے آئی تھی میرے مکتب میں آنے والی لڑکیوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ اب اس میں پڑھنے لکھنے سے زیادہ داستان سرائی ہوتی اور وہ سب کے درمیان بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتی رہتی۔ وہ میرے پھوپھا کی چہیتی تھی' تب ہی وہ اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر میلوں ٹھیلوں میں لے جاتا۔ وہ اسے کئی بار پشاور بھی لے گیا تھا جہاں اس نے لکی ایرانی سرکس میں ''موت کا کنواں'' دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ انڈے کیسے لڑائے جاتے ہیں اور بٹیروں پر بازی کیسی لگتی ہے۔ کتے اور ریچھ کی لڑائی اور بزکشی اس کی دیکھی ہوئی تھی۔ وہ جب اپنی آنکھوں دیکھی سناتی تو تمام لڑکیاں منہ کھولے اس کی باتیں سنتی رہتیں۔ یہ نرالی باتیں انہوں نے کب سنی تھیں۔ وہ میرے مکتب میں آنے والی تمام لڑکیوں کو مرگاٹی کے مقابلے میں ہرا دیتی۔ اپنے بائیں ہاتھ سے کئی گٹیاں ہوا میں اچھال کر وہ کسی کو بھی زمین پر نہ گرنے دیتی اور سب کو ایک ساتھ پکڑ لیتی۔

اس کی سگی دادی جو میرے رشتے کی نانی تھی' اسے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھتی اور اپنے پوپلے منہ سے تھوک کے چھینٹے اڑاتے ہوئے کہتی کہ اس کی پوتی کے دماغ میں جن رہتے ہیں۔ تب ہی بموں کی برسات میں اس کا چہیتا پوتا جلال شہید ہو گیا تھا اور یہ خدائی خوار بچ گئی تھی۔

''دادی باجی پروانہ کا نام نہیں لیتی' وہ بھی تو ٹکڑے ہوگئی تھی۔ یہ خود عورت ہے' لیکن عورتوں سے' لڑکیوں سے نفرت کرتی ہے۔'' پروین نے کہا تھا اور اس کی آواز میں زہر تھا۔ چند لمحوں بعد وہ چپکے چپکے ہنسنے لگی تھی۔ ''میرے خیال میں دادی عورت کے روپ میں کوئی دیو ہے۔ خونخوار دیو۔''

''آہستہ بولو۔ اس نے سن لیا تو قیامت آجائے گی۔'' میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

''اس قیامت کو ٹھیک کرنے کے لیے میں غازی بابا' سخی بابا اور میر علی بابا کے مزار پر حاضری دوں گی۔'' اس نے اپنا حتمی فیصلہ مجھے سنایا تھا اور میں اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس بالشت بھر کی لڑکی کے اندر سو گز اونچی باغی عورت رہتی تھی۔ ایسے لمحوں میں مجھے اس کی شوریدہ سری سے ڈر لگتا۔

ان دنوں موسم ابھی گرم تھا۔ تنور میں اماں' پھوپھی مرجانہ گیہوں کی خمیری روٹیاں لگا رہی تھیں جن کی خوشبو معدے میں بھوک کی فصل اُگا رہی تھی۔ اور حجرے میں رباب اور مٹکے کے ساتھ کوئی گا رہا تھا۔'' چاند سر اٹھا کر جلدی سے نکل آ۔ محبوب میرا پھولوں کی کٹائی کر رہا ہے اور اندھیرے میں اپنی انگلیاں کاٹے لے رہا ہے۔''

میں اس گیت گانے والے کی پُر درد آواز میں کھوئی ہوئی تھی کہ پروین نے میرا شانہ ہلا کر کہا تھا۔ ''باجی اگر ہم ہری سنگھ نلوا کو ہلاک کر سکتے ہیں تو کسی امریکی جرنیل کو کیوں نہیں مار سکتے؟''

میں خوابوں کی دنیا میں تھی کہ پروین مجھے وہاں سے امریکی جنگ کے میدان میں گھسیٹ لائی' میرا جی اسے ڈانٹنے کو چاہا لیکن میں نے صبر کیا۔

میں اس وقت بھی صبر کر رہی ہوں!

کل رات کی بات ہے جب اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا تھا'' وہ خط میں نے لکھ لیا ہے لیکن ابھی تک میں نے اسے تمہیں نہیں دکھایا۔'' اس کے لہجے میں تاسف تھا ''اور اب جانے کا وقت آ گیا۔''

میں سمجھ گئی کہ وہ کس خط کا ذکر کر رہی ہے۔ اسے لکھنے کے لیے وہ بے تاب تھی۔

کتنی محنت سے اس نے نئے لفظ سیکھے تھے‘ خوش خط لکھنے کی مشق کی تھی‘ دن کے اجالے اور چراغ کی روشنی میں لکھنے بیٹھ جاتی۔ لکھتی‘ پھاڑ دیتی اور پھر سے لکھنے لگتی۔ میری نانی اور اس کی دادی ان دنوں اس کی طرف سے شک میں مبتلا تھی۔ ایک شام اس نے پھوپھی مرجانہ سے چیخ کر کہا تھا ”یہ خدائی خوار لڑکیاں لکھنا سیکھ لیں تو خاندان پر تباہی آتی ہے۔“ پھوپھی مرجانہ نے پیٹھ یوں پھیر لی تھی جیسے یہ جملہ کسی اور سے کہا گیا ہو۔ ”لڑکیوں کے خط مشک کی طرح ہوتے ہیں۔“ میری نانی اور اس کی دادی بڑبڑاتی ہوئی مصلے پر بیٹھ گئی تھی۔

جس خط کو ان دنوں وہ مجھ سے کسی راز کی طرح چھپاتی رہی تھی‘ کل رات اسے پڑھوانے کے لیے بے تاب تھی لیکن میری ہمت نہیں ہوئی کہ میں پروین سے خط لے کر طاق میں جلتے ہوئے چراغ کی روشنی میں جا کر پڑھوں۔ میرا جی چاہا کہ اس سے کہوں خط مجھے دے دے۔ میں اسے ڈاک سے بھجوادوں گی اور اس سے پہلے پڑھ بھی لوں گی لیکن میں چپ رہی۔ اچانک وہ اٹھی اور دالان میں رکھے ہوئے اس بقچے کو ٹٹولنے لگی جس میں اس کا بستہ اور کتابیں تھیں۔

چند لمحوں بعد وہ میرے برابر آ کر اوندھی لیٹ گئی اور ورق کھولنے لگی۔

”اس اندھیرے میں تم اسے کیسے پڑھو گی؟“ میں نے کہا۔

”تم اسے اندھیرا کہتی ہو باجی؟ کراچی کی روشنیوں نے تمہاری آنکھوں کی بینائی کم کر دی ہے۔ میرے لیے تاروں کے چراغ بہت ہیں۔“

میں لرز گئی۔ ایسے جملے تو دانش مندوں اور صوفیوں کے منہ سے نکلتے ہیں۔ پروین تو صرف تیرہ برس کی تھی۔ میرے دل سے اس کی درازئ عمر کے لیے دعا نکلی۔

اس نے کاغذ کی سلوٹیں نکالیں اور پھر رازداری سے سرگوشی کے لہجے میں مجھے اپنا لکھا سنانے لگی۔ وہ خاموش ہوئی تو مجھے یقین نہ آیا کہ یہ انشاء پردازی میری پروین کی ہے۔ میری آنکھوں سے گرنے والے آنسو تکیے کو نم کرتے رہے۔ میرے دل میں ایک خوفناک خیال آیا‘ میرا جی چاہا کہ اسے جانے نہ دوں‘ کہیں چھپا دوں۔ ایسے روشن چراغ

کو ہوا کی زد سے بچا کر رکھنا چاہیے لیکن میں جانتی تھی کہ ایسا خیال کرنا بھی بے کار ہے۔ ہم لڑکیوں کی بھلا کیا اوقات۔ ہم خاندانی نظام کی بنیادوں میں کھاد کی طرح ہیں۔ ہمارا کام دل ربا اور مشک بار گل بوٹے اُگانا ہے اور بس۔

میں نے اس کی پیشانی اور رخسار چومے' ہم دونوں کے چہرے آنسوؤں سے تر تھے۔ ہم نے اپنی بے بسی پر' درماندگی پر آنسو بہائے اور جاگتے رہے تھے۔ فجر کی اذان سے پہلے اماں نے تنور دہکایا تھا اور لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز ہم تک آنے لگی تھی۔ گڑ کے شیرے میں گندھے ہوئے مکئی کے آٹے کی روٹیاں اماں نے تندور میں لگانی شروع کیں تو سارا گھر ان کی سوندھی خوشبو سے بھر گیا۔ میں نے ان گرم روٹیوں کا چورا بنا کر اس میں بادام' اخروٹ' کشمش اور سونف ملائی اور چوری تیار کی تھی۔ پھوپھی مرجانہ اپنے بھائی کے گھر سے رخصت ہو رہی تھی' اس کے ساتھ ''خوانے'' جانا تو لازم تھا۔ مہمانوں کے لیے دستر خوان بچھا' پراٹھے اور انڈے رکھے گئے۔ کڑھائی میں سوجی بھون کر حلوہ بنا جس میں کشمش' بادام اور پستے کے ٹکڑے تھے۔ کشمیری چائے کے پیالے مہمانوں کے سامنے رکھے گئے۔ اماں نے بہت سے پراٹھے پھوپھی مرجانہ کے ساتھ زادِ سفر کے طور پر دینے کے لیے دستر خوان میں لپیٹے۔ ایک بڑی ہانڈی میں حلوہ' دوسری میں ابلے ہوئے انڈے۔ پھوپھی مرجانہ نے کچھ کہنا چاہا تو اماں نے چپ کرا دیا ''سفر کے لیے کچھ توشہ بھی تو ہونا چاہیے۔''

کسی سے کچھ بھی کھایا نہیں گیا۔ سامان ٹرک میں لادا جانے لگا تو اس نے چھوٹے بھائی سے اپنا بستہ مانگا اور اس میں سے وہ خط نکال کر اپنی مٹھی میں دبا لیا جو اس نے رات مجھے سنایا تھا۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا ''راستے میں اسے پڑھوں گی'' اس نے آہستہ سے کہا۔ میرا جی چاہا اس سے کہوں کہ اس خط کو پھاڑ دے' لیکن مجھ میں کچھ کہنے سننے کی ہمت نہ تھی۔ رخصت کا وقت آیا تو مجھے اور پروین کو مشکل سے الگ کیا گیا۔ ہماری قمیصوں کے شانے آنسوؤں سے تر تھے۔ پھر قافلہ روانہ ہوا۔ سینکڑوں لوگ اور ان کے جانور ساتھ چلے' جنہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ اگلا پڑاؤ کہاں

ہوگا۔ زمین سخت آسمان دور۔

پروین چلی گئی' سب لوگ چلے گئے۔ میدان میں لگے ہوئے خیمے چلے گئے۔ ہنستے ہوئے' دوڑتے ہوئے' لڑتے ہوئے بچوں کی آوازیں چلی گئیں۔ سامنے دور تک پھیلی ہوئی زمین کا سینہ نکالی جانے والی میخوں سے چھلنی تھا۔ مٹکوں کی ٹھیکریوں پر مجھے پروین کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ ٹوٹے ہوئے ٹھنڈے چولہوں سے اس کے دہکتے ہوئے دل کی آنچ آ رہی تھی۔ اس روز مکتب آنے والیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ جو آئی تھیں وہ اداس تھیں۔ چند مہینوں کے لیے آ کر ٹھہرنے والیوں سے ان کی دوستیاں ہوگئی تھیں۔ گڈے گڑیا کا بیاہ ہوگیا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے سے دوپٹے بدل لیے تھے۔ میں نے ان لڑکیوں کو واپس پھیر دیا اور تیرہ برس کی اس لڑکی کے بارے میں سوچتی رہی جو ذہین تھی' اسے موقع ملتا تو وہ کیا نہیں کر سکتی تھی لیکن وہ سر پر نیلا برقع رکھے دشتِ بے اماں کی طرف چلی گئی تھی۔ میں نے اس عمر کی لڑکیاں کراچی میں دیکھی تھیں۔ چاق چوبند' ہنستی کھیلتی ہوئی' پڑھتی ہوئی' آنے والے دنوں کے خواب بُنتی ہوئی۔ لیکن پروین کے بہت سے خواب تو اس کے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کے ساتھ چلے گئے تھے۔

نیلے آسمان پر چوتھی ذیقعد کا چاند ابھی طلوع ہوا تھا کہ دور گھاٹیوں سے آوازیں آئیں۔ کاررواں تو ابھی کچھ دور ہی گیا ہوگا۔ بمبار طیاروں کی گڑگڑاہٹ' میزائلوں کی سنسناہٹ۔ ابابیلیں پھر آ پہنچی تھیں لیکن وہ ہمارے یہاں کسی ابرہہ کے لشکر کے لیے نہیں آئی تھیں۔ وہ تو لشکرِ ابرہہ کا حصہ تھیں۔ ہم سب کے دل بیٹھ گئے۔ مرد اور لڑکے خچروں' گدھوں اور گھوڑوں پر اس طرف دوڑ پڑے جدھر سے انہیں اپنے خون کی خوشبو آ رہی تھی۔ چھوٹے ٹرک اور سوزوکیاں تو کارواں کو رخصت کرنے کے لیے ساتھ ہی گئے تھے۔

☆☆☆

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی وہ گئی جانے والوں کو لے آئے ہیں۔ پروین بھی ان کے ساتھ آئی ہے اور چارپائی پر آج تنہا سو رہی ہے۔ چہرے پر ہلکا سا تبسم ہے

جیسے گنبدِ افلاک پر ہنستی ہو۔ کوئی عورت آگے بڑھ کر اس کا چہرہ سفید چادر سے ڈھانپ دیتی ہے۔ میں جو اس کے سرہانے بیٹھی ہوں۔ ہاتھ بڑھا کر اس کا چہرہ کھول دیتی ہوں۔ ابھی اس نے دیکھا ہی کیا تھا۔ ان نیم وا آنکھوں سے کچھ دیر اور دیکھ لے چرخِ نیلی فام کا تماشہ۔

گھر سے باہر سبزہ زرد پڑ گیا ہے اور گھر کے اندر وہ نیند کے زرد لباس میں اس چارپائی پر لیٹی ہے جس پر ہم دونوں مہینوں اکٹھے سوئے تھے۔ اس کی بنت ڈھیلی پڑ جاتی تو دونوں مل کر اسے کستے اور جب انگلیوں میں بان کی پھانس چبھ جاتی تو سوئی سے اسے نکالنے کی کوشش میں اپنی انگلیاں زخمی کر لیتے۔

میں اس کی چارپائی سے لگی بیٹھی ہوں اور اسے تک رہی ہوں۔ عورتیں' بہت سی عورتیں چارپائی کے گرد کھڑی ہیں۔ وہ اونچی آواز سے رو رہی ہیں۔ میں کھڑی نہیں ہوتی' میں بین بھی نہیں کرتی' اپنی موت پر خود کون روتا ہے؟

میں چادر اور نیچے سرکاتی ہوں' ایک کاغذ اس کی مٹھی میں دبا ہوا ہے۔ وہ خط جو اس نے دو دن پہلے لکھا تھا۔ اس کے بعد بھی موجود ہے۔ اس کے بائیں ہاتھ میں دوسروں کا نامۂ اعمال ہے۔ وہ فردِ جرم ہے جسے آخر وقت تک اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا۔

میدان سے کدالوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ پروین کے لیے اور دوسرے جانے والوں کے لیے خاک میں بستر لگ رہا ہے۔ تیرہ برس کی عمر کیا خاک میں بستر لگانے کی ہوتی ہے؟ میں اسے دیکھتی ہوں' پھر اس کی مٹھی میں دبا ہوا کاغذ نکال لیتی ہوں۔ جن پر خون کے دھبوں نے روشنائی کو پھیلا دیا ہے۔ اس نے یہ خط مجھے رات کے اندھیرے میں سنایا تھا۔ اب اس کی آواز کھو گئی ہے۔ دن کے اجالے میں اس کے لکھے ہوئے لفظ بول رہے ہیں:

عالی جناب

آج ہماری عید کا دوسرا دن ہے جب میں آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔ ہر سال آپ دنیا کے تمام مسلمانوں کو عید کی مبارکباد دیتے ہیں۔ ان کی خوشیوں کے لیے دعائیں

کرتے ہیں لیکن پھر فوراً ہی اپنی دعاؤں کو قتل کرنے کے لیے بمبار بھیج دیتے ہیں۔

میرا نام پروین ہے جناب! میں 10 برس کی تھی جب آپ نے مجھے کابل سے نکال دیا۔ ہم وہاں سے نکلتے نہیں تو اور کیا کرتے؟ بم آپ کے بنائے ہوئے تھے' بمبار آپ کے بھیجے ہوئے تھے اور وہ ہمارے گھر اڑا رہے تھے۔ میری بہن پروانہ اور بھائی جلال اس بمباری میں مارے گئے۔ آپ نے میرے بھائی بہن چھینے' میرا شہر' میرا گھر' میری گلیاں' میرا بچپن' میرے خواب چھینے' آپ نے میری ہتھیلی بھی چھین لی۔ آپ کے بھیجے ہوئے جہاز جب ہمارے لیے بسکٹ کے پیکٹ' مکھن کی ٹکیاں اور رنگ برنگ کی تتلیاں گرا رہے تھے تو میں اور میری کئی سہیلیاں ان تتلیوں کو اٹھانے کے لیے بھاگیں' بسکٹ کے پیکٹ اور مکھن کی ٹکیاں اٹھانے والے بچ گئے۔ تتلیاں پکڑنے والی میری دو سہیلیوں کو تتلیاں اپنے ساتھ لے گئیں اور میری ایک ہتھیلی بھی ان کے ساتھ چلی گئی۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ امریکی بچے بارودی تتلیوں سے کھیلتے ہیں۔ یہ تو بعد میں بابا نے بتایا کہ یہ تتلیاں خاص طور سے ہمارے لیے بنی تھیں۔ سنا ہے آپ جب اپنے بچوں کے لیے کھلونے بناتے ہیں تو ان کے ڈبوں پر ان سے کھیلنے والے بچوں کی عمر بھی لکھ دیتے ہیں لیکن آپ نے ہمارے لیے ایسے کھلونے کیوں بھجوائے تھے جو ہماری جان لے لیں' جو ان کی ہتھیلیاں اور ان کے پیر ساتھ لے جائیں؟

میں کچھ دنوں ایک خیمہ اسپتال میں زمین پر پڑی رہی۔ درد کی شدت' دوسروں کی چیخیں' مجھے سب یاد ہے۔ اماں میری کلائی پر بندھی ہوئی خون آلود پٹی پر سے مکھیاں اڑاتی تھیں اور پروانہ اور جلال کو یاد کرکے روتی تھیں۔ بابا رزق تلاش کرنے چلے جاتے تھے اور وہ ان کی خیریت سے واپسی کی دعائیں کرتے ہوئے روتی تھیں۔ جب آپ رزق تلاش کرنے کے لیے جاتے ہیں تو کیا آپ کی بیگم بھی آپ کے لیے روتی ہیں؟ کیا آپ کی بیٹی بھی آپ کے لیے دعائیں کرتی ہے؟ لیکن آپ رزق تلاش کرنے نہیں جاتے' آپ تو دوسروں کو رزق دیتے ہیں۔ اور آپ کی بیٹی کو آپ کے لیے دعا نہیں کرنی پڑتی' آپ کی دعاؤں کے طلبگار تو دوسرے ہوتے ہیں۔

میرا زخم اچھا ہوا تو ہم کابل سے چل پڑے۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ گھر کے ملبے سے جو سامان اماں اور بابا نے نکالا تھا وہ ایک بورے میں آ گیا تھا۔ ہم خچر' گدھے اور ٹرک پر سواری کرتے ہوئے باجوڑ پہنچے۔ پہلے ہم خیمہ بستی میں رہے۔ پھر اماں کا رشتے کا بھائی ہمیں ڈھونڈتا ہوا آیا۔ میرا یہ ماموں باجوڑ میں رہتا تھا۔ وہ نیک دل ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ بابا اس کی دکان میں کام کرنے لگے اور اماں نے کرتوں پر افغانی کڑھائی شروع کر دی۔ سنا ہے یہ کُرتے امریکہ تک جاتے ہیں اور بہت مہنگے بکتے ہیں لیکن اماں اور دوسری افغان عورتوں کا مقدر چند سکّے ہیں اور مقدر سے کون لڑ سکتا ہے۔ آپ بھی تو ہمارے مقدر میں لکھے گئے تھے جس کی مجھے خدا سے بہت شکایت ہے اور فرشتوں سے بھی' خدا کو لکھنا نہیں آتا وہ صرف حکم دیتا ہے اور فرشتے لکھتے ہیں۔ وہ ہماری تقدیر اچھی بھی تو لکھ سکتے تھے۔ خدا اگر ہم سے ناراض تھا تو فرشتے ہماری سفارش کر سکتے تھے۔

میں نے جب آپ کو ٹیلی ویژن پر دیکھا اور باجی شمسہ نے بتایا کہ آپ نے ہم پر بم برسانے کا حکم دیا تھا تو مجھے حیرت ہوئی۔ آپ صورت سے چنگیز یا ہلاکو تو نہیں لگتے۔ بالکل مسخروں جیسی آپ کی شکل ہے۔ بات کرتے ہوئے کبھی آپ آنکھ مارتے ہیں' کبھی کندھے اُچکاتے ہیں۔ میں آپ کی باتیں نہیں سمجھ سکی لیکن آپ کو دیکھ کر ہنستی رہی۔ میں نے کئی ایرانی سرکس دیکھا ہے جناب۔ مجھے معلوم ہے سرکس والے آپ کو نکال دیں گے۔ مسخرے تو صرف ہنساتے ہیں' وہ اگر رلانے لگیں تو انہیں سرکس میں کون رکھے گا؟۔

عالی جناب! میرا رشتے کا ایک بھائی خوب گانے سنتا تھا' فلمیں دیکھتا تھا۔ اس کے حجرے میں سشمتا سین' ایشوریہ رائے اور کاجول کی تصویریں تھیں۔ کہتا تھا بالی ووڈ جا کر ہیرو بنوں گا۔ وہاں بہت سے خان ہیں' میں ''کابل کا خان'' کہلاؤں گا۔ پھر آپ کے فوجیوں نے اتنے بم برسائے' اتنے بچوں اور عورتوں کو ناحق مارا' مدرسے اور مسجدیں مسمار کیں کہ وہ خودکش بمبار بن گیا' اس کے سر کی تصویر اخبار میں چھپی۔ قسم ہے خدا کی' وہ تو بہت ہنستا' کھیلتا' فلمی اسٹائل نوجوان تھا۔ عالی جناب اس کو خودکش بمبار آپ نے بنایا۔ یہ آپ کرتے ہیں یا پھر آپ سے کوئی اور یہ سب کچھ کروا رہا ہے؟

شمسہ باجی نے اخبار پڑھ کر مجھے بتایا تھا کہ ایک امریکی لڑکی نے عراق پر آپ کے حکم سے ہونے والی بمباری کے خلاف تقریر کی تھی۔ اس نے آپ سے کہا تھا کہ آپ ذرا یوں سوچیں کہ یہ آپ کے بچے ہیں۔ بھتیجے' بھانجیاں یا پڑوسیوں کے بچے۔ آپ ذہن میں یہ منظر لائیں کہ آپ کا اپنا بیٹا زخمی ہے' اس کا ہاتھ یا پیر کاٹ دیا گیا ہے۔ وہ درد سے چیخ رہا ہے مگر آپ اس کے درد کو دور کرنے کے لیے یا اس کو آرام پہنچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ اس کا تصور کریں کہ آپ کی بیٹی کسی ایسی عمارت کے ملبے تلے دبی رو رہی ہے جو گر گئی ہے مگر آپ اس کو باہر نہیں نکال سکتے۔ ذرا تصور کیجئے کہ آپ کے بچوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے آپ کو ہلاک ہوتے ہوئے دیکھا ہے اور اب وہ سڑکوں پر بھوکے' پیاسے تنہا بھٹکتے پھر رہے ہیں۔

ہم افغان بچے بھی اجنبی بستیوں میں بھوکے' پیاسے پھر رہے ہیں۔ ہم دربدر ہیں۔ ہمیں باجوڑ میں پناہ ملی تھی لیکن اب عید کے دوسرے دن ہم سے کہا گیا ہے کہ ہم باجوڑ خالی کر دیں۔ ہم یہاں سے چلے جائیں۔ آپ ہی بتائیں کہ بموں اور گولوں کی برسات میں ہم کہاں جائیں؟ تقدیر کے تیر سے پناہ ہمیں کہیں نہیں ملتی۔

☆☆☆

لوگ اسے لے کر جا رہے ہیں۔ پھوپھی مرجانہ' میری اماں اور دوسری عورتوں کے بین کے ساتھ اس کے لکھے ہوئے لفظوں کا بین بھی شامل ہو گیا ہے۔ میرے کانوں کے پردے پھٹ رہے ہیں۔ شہیدوں کو نہلایا نہیں جاتا' کفن نہیں دیا جاتا' نیند کے زرد لباس میں وہ سرسوں کا پھول لگ رہی ہے۔ کچھ دیر میں وہ خاک کی چادر اوڑھ کر اپنی بند آنکھوں سے بادلوں میں چھپی ہوئی کوہ مڑ کی تین چوٹیوں کو دیکھے گی اور اسکندر اعظم کے گھوڑے پر سواری کرے گی یا شاید بودھ مندر کی سیر کو جائے اور کیوں نہ جائے کہ وہ آزاد ہو گئی ہے۔

تقدیر کے زندانی

خوشبو کے غبار نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ دادی صاحب کی گنگناہٹ اس غبار میں لپٹی ہوئی تھی۔ بیلا بھی بویا...... چنبیلی بھی بوئی...... میں نے بوئے ہزاروں پھول...... عرفان غنودگی کی ندی سے تیرتا ہوا نکلا اور سینکڑوں فٹ کی بلندی سے نیچے دیکھا۔ وہ تیزی سے رنگون ائیر پورٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ خلیج مرتبان کا پانی سورج کی کرنوں کے ساتھ بہتا ہوا سونا بن گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس سے کچھ ہی فاصلے پر نوسو میل دور سے آتا ہوا دریا ایراوتی سمندر سے گلے مل رہا ہوگا۔

ایراوتی کا نام عرفان نے پہلی مرتبہ جغرافیے کی کتاب میں پڑھا تو یہی سمجھا تھا کہ وہ بھی چمپاوتی اور بینامتی کی طرح محلے کی کوئی لڑکی ہوگی جس کی کلائیوں میں چوڑیاں کھنکتی ہوں گی لیکن مس ارونا ہر خواب کو خاک میں ملانے کا ہنر خوب جانتی تھیں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ایراوتی ایک دریا ہے جو برما کے گھنے جنگلوں کے درمیان سے گزرتا ہے۔ اس کے راستے میں اُگے ہوئے ٹیک اور پاڈوک کے پیڑ جب کٹتے ہیں تو ہاتھی ان سینکڑوں من بھاری لٹھوں کو کھینچ کر ایراوتی کے کنارے لاتے ہیں جہاں انہیں شہتیروں سے بنے ہوئے بجروں پر لاد دیا جاتا ہے۔ دریا کی لہروں پر ڈولتے ہوئے یہ بجرے منڈالے تک آتے ہیں اور جہازوں پر چڑھا دیے جاتے ہیں پھر سات سمندروں کا سفر کرتے ہیں۔ برما کے جنگل دور دراز شہروں میں صوفوں، الماریوں، مسہریوں، میزوں اور کرسیوں کا روپ دھار کر سانس لیتے ہیں۔ پہلی مرتبہ میں ہی وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ سب کرم

کا چکر ہے۔ اسے کسی دوست نے آواگون کے بارے میں بتایا تھا۔ ٹیک اور پاڈوک کے پیڑوں نے ضرور پچھلے جنم میں کوئی اچھا کرم کیا ہوگا تب ہی وہ زمانے بھر کی سیر کو نکلے۔

مس ارونا اور بھی بہت کچھ بتاتی رہتیں لیکن ان کی وہ سنتا کب تھا۔ وہ ٹیک کا کٹا ہوا پیڑ بن جاتا تھا' ہاتھی اسے گھسیٹ کر دریا تک لاتے اور جب اسے بجرے پر چڑھانے کا وقت آتا تو وہ سب کی آنکھ بچا کر موٹے موٹے رسّوں کی گرفت سے نکل کر تنہا دریا میں اتر جاتا۔ لہریں اسے سینے سے لگا لیتیں' مچھلیاں اس سے گلے ملتیں' پانی پر بہتی ہوئی بیلیں اور جھاڑیاں اس سے لپٹتیں' پھول اسے چومتے اور وہ گاتا گنگناتا چلا جاتا...... تُو گنگا کی موج' میں جمنا کا دھارا...... یہی تو ایک سفر تھا جس میں کنڈکٹر پیسے نہیں مانگتا تھا۔ سوتے جاگتے کا عالم ہوتا جب مس ارونا کی انگلیاں اس کے کان سے لپٹتیں اور وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو جاتا۔ ساری کلاس اس پر چپکے چپکے ہنستی اور مس ارونا کا غصہ اس کے چہرے کو جلانے لگتا۔

اس نے ہوش سنبھال کر برما اور رنگون کا نام سنا تھا۔ پہلے پہل تو وہ انہیں بھی پرانی دلی کے محلے سمجھتا تھا۔ تفصیل تو اسے بہت دنوں بعد معلوم ہوئی۔ اُدھڑے ہوئے پلستر اور اُڑے ہوئے چونے والی دیوار پر دادا صاحب کی جو تصویر لگی ہوئی تھی اس نے ان لوگوں کا رشتہ رنگون سے جوڑ دیا تھا۔ اس تصویر پر دادی صاحب کبھی بیلے کی کلیوں کا ہار چڑھاتیں' کبھی اگر بتیاں جلا کر فاتحہ دیتیں اور اس کے حصے میں کھیر یا جلیبیاں آتیں۔ دادا صاحب رنگون گئے تھے پھر واپس نہیں آئے تھے۔ دادی صاحب اکثر اپنی بے سُری آواز میں گنگناتیں۔ مرے پیا گئے رنگون...... کیا ہے وہاں سے ٹیلی فون...... دادی صاحب گنگناتیں' ململ کے سفید دوپٹے سے اپنی آنکھیں خشک کرتیں اور وہ گھٹنوں میں منہ چھپا کر ہنستا۔ کچھ دنوں بعد اس نے اس بے تکے گانے اور دادی صاحب کی بے سُری آواز پر ہنسنا بند کر دیا۔ وہ بیوہ دادی کا اکلوتا پوتا اور بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بیوہ عورتوں کے پوتے اور بیٹے اپنی بدنصیبیوں پر ہنسنے کا حق نہیں رکھتے۔ اسے تو بس جلدی

سے بڑا ہو جاتا تھا۔ اماں ایک سرکاری اسکول میں پڑھاتی تھیں اور دادی صاحب کو اس نے ہوش سنبھالتے ہی لحافوں میں ڈورے ڈالتے اور دوپٹوں پر کامدانی کاڑھتے دیکھا تھا۔ ہر ساتویں دن لالہ کشن چند کی دکان سے ملازم آتا جو "ماتا جی" سے کڑھے ہوئے دوپٹے لے جاتا اور سنہرے اور روپہلے تاروں کے لچھے اور بن کڑھے دوپٹوں کی گٹھری اوراس کے ساتھ ہی کچھ نوٹ بھی پہنچاتا۔

"نمسکار ماتا جی! لالہ جی نے بھجوائے ہیں۔"

دادی صاحب رنگ اڑے کواڑ کی آڑ سے اسے دعائیں دیتیں۔

"لالہ جی اچھے تو ہیں؟" دادی صاحب پوچھتیں۔

"جی ماتا جی۔ بھگوان کی کرپا سے راجی کشل ہیں۔"

"میری دعا کہیو۔"

"اچھا ماتا جی۔ اب جاتا ہوں۔"

"جاؤ بھیئے جاؤ۔ اللہ بیلی۔" دادی صاحب کہتیں اور اسے دروازہ بند کرنے کا اشارہ کرتیں۔ نوٹ ان کی مٹھی میں مضبوطی سے دبے ہوتے۔ پہلے وہ سمجھتا تھا کہ نوٹ بھی کبوتر کی طرح اڑ جاتے ہوں گے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں کچھ دنوں بعد آئی کہ کبوتر اڑائے جائیں تو لوٹ کر چھتری پر آ جاتے ہیں لیکن نوٹ مٹھی سے نکل جائیں تو کبھی نہیں آتے۔ انہیں اپنی تلے دانی میں رکھتے ہوئے وہ اسے تل کے لڈو یا گزک کے لیے پیسے دیتیں۔ بیلا بھی بویا...... چنبیلی بھی بوئی...... میں نے بوئے ہزاروں پھول...... اللہ میرے ہمیں نہ دل سے بھول...... ان کی بے سُری آواز کمرے میں گونجتی اور وہ ان کی آواز پر دھیان دیے بغیر تیر کی طرح باہر لپکتا۔

برسوں بعد بھی گزک کا میٹھا اور سوندھا ذائقہ اس کی زبان پر لکیریں کھینچنے لگا۔

"سر پلیز فاسن یور سیٹ بیلٹ" ائیر ہوسٹس نے جھک کر کہا۔ وہ گڑبڑا گیا' گزک اور تل کے لڈو کا ذائقہ اس کی زبان سے جدا ہو گیا۔

یانگون ائیر پورٹ پر اترنے کا اعلان ہو رہا تھا۔

لوگ شہروں کے نام کیوں بدل دیتے ہیں؟ ڈاگون' یانگون' رنگون' ایک بار پھر یانگون۔ یانگون میں وہ مزہ کہاں جو رنگون میں ہے۔ دادی صاحب کی بے سُری آواز آسمانوں سے آئی...... مرے پیا گئے رنگون..........

اس نے سیٹ بیلٹ باندھی' اس کے برابر بیٹھا ہوا کیمرہ مین انتھونی اپنی بیلٹ باندھ چکا تھا۔ سفر کے دوران اسے کئی لوگوں نے پہچانا تھا۔ ٹیلی ویژن کے لیے کام کرنے کے یہی مزے ہیں۔ آج اگر وہ ہندوستان کا جانا پہچانا جرنلسٹ اور ٹیلی ویژن رپورٹر تھا تو یہ اس کا نہیں مس ہما زُتشی کا کمال تھا۔

کالج کا پہلا سال تھا اور انگریزی کی پہلی کلاس جب اس نے مس زُتشی کو دیکھا اور دل بیٹھ گیا۔ سانولا رنگ' کھچڑی بال' یا اللہ چار برس ان کی صورت دیکھنی ہوگی۔ اس نے دوسرے لڑکوں لڑکیوں پر نظر ڈالی۔ سب ہی کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔ مس زُتشی نے کتاب کھولی اور پڑھانا شروع کیا۔ چہروں کے تاثرات بدلنا شروع ہوئے۔ آواز تھی کہ مصری کی ڈلی جو کانوں میں رس گھول رہی تھی اور پڑھانے کا انداز ایسا کہ ہر لفظ زندہ ہو رہا تھا۔

اسے انگریزی کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا جسے مس زُتشی نے انگلش لٹریچر سے عشق میں بدل دیا۔ ہیملٹ ڈنمارک کے قلعے سے نکل کر اس کشادہ کمرے میں آ جاتا اور To be or not to be کے عذاب میں گرفتار ٹہلتا رہتا۔ پورشیا' شائی لاک سے جیتے جاگتے آدمی کے بدن کا ایک پونڈ گوشت تراشنے کو کہتے ہوئے یہ بھی یاد دلاتی کہ معاہدے میں یہ کہیں نہیں لکھا تھا کہ خون کی بوند بھی گرے گی اور بدن سے تراشے گئے گوشت کا لوتھڑا ایک پونڈ سے زیادہ یا کم بھی ہو سکتا ہے۔ کہ خون کی ایک بوند نہ گرے۔ مس زُتشی صرف پڑھاتی نہیں تھیں۔ ان کا اصرار تھا کہ لکھو اور ایسا لکھو کہ انگریز جو اپنے ادب پر اتراتے ہیں وہ تمہیں پڑھنے پر مجبور ہو جائیں' وہ رابندر ناتھ ٹیگور' سروجنی نائیڈو اور تورودت کی مثالیں دیتیں۔ سلمان رشدی اور ارون دھتی رائے اس وقت تک طلوع نہیں ہوئے تھے۔

گھر میں تو رنگون کا ذکر ہوتا ہی تھا پھر کالج میں بھی منڈالے اس کے راستے میں آ بیٹھا جہاں کپلنگ نے اپنی مشہور نظم ''روڈ ٹو منڈالے'' لکھی تھی۔

پرانے مولمین پگوڈا کے پاس بیٹھی ہوئی ایک برمی لڑکی
کاہلی سے سمندر کی طرف دیکھتی ہے
میں جانتا ہوں وہ میرے بارے میں سوچتی ہے
تاڑ کے پتوں میں ہوا بجتی ہے اور مندر کی گھنٹیاں کہتی ہیں
اے برطانوی سپاہی! میرے پاس منڈالے لوٹ آؤ

مس زتشی کپلنگ کی نظم پڑھاتیں جس میں وہ اپنی محبوبہ کو یاد کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس بات پر نظر رکھتیں کہ کسی لڑکی کی طرف کوئی لڑکا دیکھ تو نہیں رہا۔

''یار کیا ظلم ہے' کپلنگ اپنی نظم میں محبوبہ کو یاد کرے تو لٹریچر ہے اور ہم کلاس میں کسی لڑکی کو دیکھ بھی لیں تو آوارگی ہے'' لڑکے جھنجھلا کر آپس میں باتیں کرتے۔

زندگی زن زن کرتی گزر گئی۔ کسی کو وقت کے دھارے نے بہت دور جا پھینکا اور کوئی دلی میں ہی رہا۔ وہ بھی ان خوش نصیبوں میں سے تھا جنہیں وقت نے دلی میں ہی رہنے دیا۔

وہ اپنی زندگی کی تمام کامیابیاں مس ہما زتشی کے نام کرتا تھا۔ انگلش لٹریچر انہوں نے یوں پڑھایا تھا جیسے صندل کا ٹھنڈا شربت حلق سے گھونٹ گھونٹ اترتا جائے۔ جون ڈن کی مشہور نظم کی سطریں پڑھاتیں تو محسوس ہوتا جیسے ہوا سے لہراتی ہوئی گھاس میں چھپی ہوئی کوئی پرانی قبر کھل گئی ہو اور اس میں سونے کے لیے ایک نیا مہمان آ رہا ہو۔

مس زتشی کی نظر میں نمایاں ہونے کے لیے وہ انگریزی زبان کے سمندر میں اس طرح اترا تھا کہ سکینڈ ایریا میں ہی اس کے مضمون کم اشاعت والے اخباروں میں چھپنے لگے تھے۔ اس نے ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کیا' ''ٹائمز آف انڈیا'' میں سب ایڈیٹر ہوا اور اب وہ بی بی سی ٹیلی وژن کا جانا پہچانا رپورٹر تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ ہندوستان میں مسلمان ہونا گھاٹے کا سودا ہے۔ وہ ہنستے ہوئے کہتا ''میرے لیے تو یہ فائدے کی بات

ہے۔ میرا پروڈیوسر مجھے آنکھ بند کر کے بغداد' کابل' رام اللہ' کراچی اور تہران بھیج دیتا ہے۔ ان جگہوں پر میرا انڈین مسلم ہونا کام آتا ہے۔ چٹکی بجاتے اجنبیت کی دیواریں گر جاتی ہیں اور کھل جا سم سم کی طرح اندر کی خبروں کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔''

امیگریشن کے لیے قطار میں لگے ہوئے عرفان کو مس زتشی بے طرح یاد آئیں' وہ نہ ہوتیں تو آج وہ یہاں کیوں ہوتا؟ اس کی زندگی وہ کیوں ہو جاتی جو ہوگئی تھی اور جس پر اس کے دوست رشک اور دشمن حسد کرتے تھے۔

برسوں پہلے جب وہ ہفتے بھر کی چھٹی اور بہت تھوڑے سے روپے لے کر رنگون پہنچا تو ایک دن کے لیے منڈالے ہو آیا تھا' منڈالے جس کے محل کے نقشیں دروازوں کا کوئی ثانی نہ تھا۔ اسے کاڑھنے والوں نے اپنی آنکھوں کی روشنی اور اپنی انگلیوں کی ہنرمندی لکڑی کے ان بیل بوٹوں میں اتار دی تھی۔ دوسری جنگ عظیم میں اس محل کا صرف وہی دروازہ خاکستر ہونے سے بچا تھا۔ اس نے منڈالے کو پہلی مرتبہ رڈیارڈ کپلنگ کی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ مولمین پگوڈا کے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی' تاڑ کے پتوں میں بہتی ہوئی ہوائیں اور پگوڈا سے آتی ہوئی گھنٹوں کی صدائیں' دھان کے پودوں میں ہوا کی سرسراہٹ اور سمندر کی سطح سے اچھلتی ہوئی اور آپس میں چھپم چھپائی کھیلتی ہوئی مچھلیاں' ابھی لہروں میں چھپ گئیں ابھی اٹھ کر دنیا دیکھنے لگیں اور وہ لڑکی جس کا نام سوپی یا ولت تھا۔ وہ کپلنگ کی نظم میں انگریز سپاہی کا انتظار کرتی تھی۔ لیکن عرفان کی ملاقات سوپی سے نہیں ہوئی تھی اور وہ اداس لوٹ آیا تھا اور مولمین پگوڈا کے سامنے بھی اس کے کانوں میں دادی صاحب کے سب سے چہیتے ریکارڈ کی آواز گونجتی رہی تھی۔

مرے پیا گئے رنگون...... کیا ہے وہاں سے ٹیلی فون...... تمہاری یاد ستاتی ہے...... جیا میں آگ لگاتی ہے...... کیسی عجیب بات تھی کہ لوگ جس گانے کو سن کر مسکراتے تھے' اسے سنتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔

وہ ریکارڈ جسے دادی صاحب نے سن سن کر گھس دیا تھا۔ ایک دن وہ اس ریکارڈ کو

اپنی انگلی پر نچا کر زور زور سے اس گانے کے بول دہرا رہا تھا کہ ریکارڈ اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا تھا' دادی صاحب کتنا روئی تھیں' جیسے دادا صاحب نے اسی وقت دم توڑا ہو۔ اماں نے اس کی ٹھکائی کی تو دادی صاحب اپنا رونا بھول کر اسے اپنے کلیجے سے لگا کر بیٹھ گئی تھیں اور بن باپ کے بچے کو مارنے پر بہو کو برا بھلا کہتی رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد جب گھر میں تنا تنی کچھ کم ہوئی تو اس نے صندوقچی سے اپنی جمع پونجی نکالی اور سائیکل پر اس ریکارڈ کو دیوانوں کی طرح ڈھونڈتا پھرا تھا۔ اب کیسٹ کا زمانہ تھا۔ گراموفون ریکارڈ کا نام سن کر ہی دکاندار انکار کر دیتے لیکن چاندنی چوک کی ایک دکان سے اسے ''شریمتی چار سو بیس'' کا یہ ریکارڈ مل ہی گیا تھا اور وہ اسے خرید لایا تھا۔ دادی صاحب پہلے تو اسے دیکھ کر خوش ہوئیں۔ لیکن اسے سننے کے بعد یہ کہہ کر انہوں نے عرفان کا دل توڑ دیا تھا کہ ہے تو وہی گانا لیکن اس کی آواز ویسی سہانی نہیں ''ارے بیٹا قیامت ہے' ہر چیز میں ملاوٹ ہے۔'' انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا تھا اور اس نے سر پیٹ لیا تھا۔ نئے ریکارڈ کی آواز گھسے ہوئے ریکارڈ جیسی سہانی کیسے ہوتی؟ لیکن اس نے یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ پرانی یادیں شاید گھس کر ہی ''سہانی'' ہوتی ہیں۔

☆☆☆

یانگون ائیرپورٹ پر قدم رکھتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ فضا میں خون کی اور خوف کی بو ہے۔ کئی برس پہلے جب وہ چھٹیاں گزارنے یہاں آیا تھا تو یہ عالم نہ تھا لیکن اس مرتبہ ائیرپورٹ فوجی چھاؤنی لگ رہا تھا۔ امیگریشن کاؤنٹر پر بھی اس کے اور انتھونی کے پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات کئی بار الٹ پلٹ کر دیکھے گئے۔ رنگون میں پھوٹ پڑنے والے ہنگاموں کے بعد رپورٹروں اور کیمرہ مینوں کی آمد پہلے سے کہیں زیادہ ناپسندیدہ ہو گئی تھی۔ وہ اور انتھونی سانس روکے انتظار کرتے رہے کہ ابھی ان سے واپس جانے کے لیے کہا جائے گا لیکن بی بی سی ٹیلیویژن کی بات ہی کیا تھی' وہ کئی جرنیلوں سے انٹرویو کا وقت دلی سے ہی لے کر چلا تھا۔ چند لمحوں بعد ان کے پاسپورٹ پر ''انٹری'' کی مہر لگ گئی۔

ائیر پورٹ سے ہوٹل کا راستہ خاموشی سے طے ہوا تھا۔ سڑکوں پر فوجی ٹرک تھے' بکتر بند گاڑیاں تھیں' سہمے ہوئے لوگ تھے۔ عرفان نے ٹیکسی ڈرائیور سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے انگریزی نہ جاننے کا بہانہ کیا۔ انتھونی سڑکوں' بند دکانوں کو لاتعلقی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بولتا بہت کم اور پیتا بہت زیادہ تھا لیکن کیمرہ کندھے پر رکھتا اور آنکھ View Finder پر تو اس کا پورا وجود کیمرے کی آنکھ بن جاتا۔ اُس وقت بھی وہ اپنے شانے سے لٹکے ہوئے فلاسک کو کھول کر چسکی لگاتا رہتا لیکن مجال ہے کہ کوئی فریم غلط ہو جائے یا کوئی منظر اس کی نظر سے چوک جائے۔

جدی پشتی کرسچن۔ گوا جب پرتگیزیوں کے قبضے میں گیا تو اس کا سارا خاندان کرسچن ہو گیا۔ انتھونی کو اپنے کرسچن ہونے پر غرور تھا لیکن سفید فام حکمران اسے اور اس جیسے دوسروں کو پوچھتے کب تھے۔ باپ' بیٹا اور روح القدس آسمان پر آرام کرتے تھے اور زمینی حقیقت یہ تھی کہ انگریز اگر ہاتھی دانت کے بنے ہوئے تھے تو انتھونی کے قبیلے کا بدن آبنوس سے تراشا گیا تھا۔ انگریز چلے گئے تھے اور انہوں نے پلٹ کر بھی عیسیٰ مسیح کے سائے میں آ جانے والوں کو نہیں دیکھا تھا' اسی طرح جیسے نچلی ذات کے ہندو' مسلمان ہو کر بھی دھنیے جُلاہے تھے۔ ذات' پات کے خلاف بات کرنے والے سید' مغل اور پٹھان عید گاہ میں ان سے گلے ملتے لیکن راہ و رسم رکھنے یا اپنی بیٹیاں اور بیٹے بیاہنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ہاں اگر وہ ''انصاری'' ہو کر لوک سبھا یا ودھان سبھا کے ممبر بن جائیں' راسلک کا کارخانہ لگا کر کروڑ پتی ہو جائیں تو ذات پات کی دیواریں آن کی آن میں ڈھے جاتیں۔

☆☆☆☆
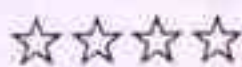
وہ ''ٹائمز آف انڈیا'' میں تھا جب اس نے چھٹی لے کر رنگون جانے کا فیصلہ کیا تو دفتر میں ساتھ کام کرنے والے حیران ہوئے۔ ''ابے سالے بنکاک جا۔ اپنی گرہ سے دام خرچ کر کے بھلا رنگون ٹنگون جانے کو کس حکیم نے نسخے میں لکھا ہے؟'' اشونی نے اسے پھٹکارا۔ دونوں ساتھ ہی کام کرتے تھے اور اکثر شراب بھی ساتھ پیتے تھے۔

عرفان مسکرا کر اس کی بات ٹال گیا لیکن رات جب بھیگی اور وہ دونوں کناٹ سرکس کے رنز بار میں بیٹھے تو پیاس بجھاتے ہوئے اشونی نے اپنا سوال دہرایا اور شراب سچ کا بند قبا کھولنے لگی۔

''یار میں باڑہ ہندو راؤ کے چھوٹے سے گھر میں دو بیوہ عورتوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ ایک میری ماں جو شادی کے دس برس بعد بیوہ ہوئیں' سرکاری اسکول میں پڑھا کر انہوں نے مجھے پالا اور مجھے یہاں تک پہنچا دیا۔'' وہ چپ ہو کر گھونٹ بھرنے لگا۔

''اور دوسری؟'' اشونی نے اسے غور سے دیکھا۔

''دوسری میری دادی صاحب۔ وہ شادی کے سال بھر بعد بیوہ ہوگئی تھیں۔ میرے دادا نے اپنے بیٹے کو نہیں دیکھا۔ وہ لام پر برما گئے تھے اور وہیں ختم ہوگئے۔ دادی صاحب نے لحافوں میں ڈورے اور مٹکیوں میں اچار ڈال کر' بیڑیاں بنا کر میرے باپ کو پالا' پڑھایا' ان کی شادی کی اور جب میں نو برس کا ہوا تو میرے ابا مراد آباد گئے اور وہاں بلوے میں مارے گئے۔''

''ہے رام''۔ اشونی کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور اس کا سر جھک گیا۔

دونوں پیتے رہے اور برما جانے کا سبب بیان ہونے سے رہ گیا۔

دوسرے روز اشونی نے کام کرتے ہوئے سر اٹھا کر اچانک عرفان سے پوچھا۔

''تم ہندوؤں سے نفرت کیوں نہیں کرتے؟''

عرفان نے حیران ہو کر اسے دیکھا پھر پوچھا'' کیوں میں ہندوؤں سے یا کسی اور سے نفرت کیوں کروں؟''

''انہوں نے تمہیں اناتھ جو کر دیا۔'' اشونی کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔

''سنو اشونی۔ میری دادی صاحب نے مجھے بچپن میں ہی بتا دیا تھا کہ موت اسی لمحے آتی ہے جو آسمان پر لکھا ہے۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ خدا کے حکم کے بغیر پتا نہیں ہلتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرے ابا کو موت مراد آباد میں اسی لمحے آنی تھی اور خدا کے حکم کے بغیر کوئی بلوائی انہیں بھلا کیسے مار سکتا تھا۔''

اشونی ایک ٹک عرفان کو دیکھتا رہا پھر اس نے جلدی سے اپنا سر جھکا لیا' وہ نہیں چاہتا تھا کہ عرفان اس کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ لے۔ اس روز وہ عرفان کے ساتھ کسی ایسی ڈور سے بندھ گیا جو دوستی اور درد کے رنگوں سے رنگی ہوئی تھی۔

☆☆☆

عرفان کی چھٹی منظور ہوئی تو اس شام وہ اور اشونی دونوں ایک بار پھر رٹز بار میں اکٹھے ہوئے۔

''میرے بھائی۔ اب تو بتادے رنگون ٹنگون جانے کا کارن؟'' پہلا گھونٹ لیتے ہی اشونی کو پرانی بات یاد آ گئی۔

''میں دادی صاحب کی وجہ سے جا رہا ہوں۔''

''یار تُو جب بات کرتا ہے وہ غریب کی پتلون کی طرح اٹنگی ہوتی ہے۔ اب بھلا اس بات کا کیا مطلب ہوا۔؟'' اشونی نے جھنجھلا کر کہا۔

''بات اتنی سی ہے کہ سیکنڈ ورلڈ وار میں جب بھرتی شروع ہوئی تو میرے دادا بھی سپاہی بھرتی ہوگئے۔ شادی کو ابھی چند ہی مہینے ہوئے تھے کہ انہیں برما فرنٹ پر بھیج دیا گیا۔ میرے ابا کی پیدائش اس وقت ہوئی جب میرے دادا فرنٹ پر تھے۔ وہ گھر آنے اور بیٹے سے ملنے کے لیے چھٹپٹا رہے تھے لیکن اس سے پہلے ہی موت ان سے ملنے آ گئی۔ پہلے خبر آئی کہ وہ ''گمشدہ'' ہیں۔ دادی صاحب انتظار کرتی رہیں اور جب ان کے مارے جانے کی خبر آئی تو انہوں نے اس بات کو مان کر نہیں دیا۔ انہیں معمولی سی پنشن ملتی تھی لیکن اس میں بھلا کہاں گزر بسر ہوتی۔ انہوں نے محنت مشقت کا ہر کام کیا لیکن کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ دادا صاحب نے لام پر جانے سے پہلے ایک گراموفون خریدا تھا جس پر وہ گانے سنتی تھیں۔ پھر بعد میں کہیں یہ بے وقوفی کا گانا آ گیا ''مرے پیا گئے رنگون'' جسے وہ ایسے سنتی تھیں جیسے کوئی نعت یا بھجن سنے۔ پچھلے دنوں میں دفتر سے چھٹی لے کر کہیں باہر جانے کی بات کر رہا تھا تو انہوں نے چھینٹ کی ایک تھیلی

میرے سامنے رکھ دی' اس میں مڑے تڑے نوٹ تھے۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے تو کہنے لگیں جب سے تُو کمانے لگا ہے میں یہ روپے جوڑ رہی ہوں۔ چندا تو اس سے رنگون چلا جا' وہاں اپنے دادا صاحب کی قبر پر فاتحہ پڑھ لیجیو۔ اب سمجھ میں آیا مائی ڈیر اشونی کہ میں بنکاک کیوں نہیں جا رہا' رنگون کیوں جا رہا ہوں؟''

اشونی کو غصہ آیا۔ یہ عرفان ایسی باتیں کیوں کرتا ہے جنہیں سن کر آنکھوں میں آنسو آ جائیں۔ اس نے گردن گھما کر بارٹنڈر کی طرف دیکھا۔

چند لمحوں میز پر خاموشی رہی ''لیکن یار ان کی قبر.....'' اشونی جملہ پورا کرتے ہوئے ہچکچایا۔

''مجھے بھی معلوم ہے کہ ان کی قبر کہیں نہیں ہے۔ جانے وہ کس کھیت یا گڑھے میں ختم ہوئے' ہڈیاں ان کی کہاں گئیں' لیکن جب ان کی موت کی خبر آئی تو خاندان کے کچھ بڑے بوڑھوں نے دادی صاحب کو تسلی دی تھی کہ وہ دفن کیے گئے تھے اور ان کی قبر بھی بنی تھی۔ میں ان سے ان کا یہ سکون کیوں چھینوں؟ سچ کیوں بتاؤں؟۔''

''سمجھ گیا۔ بالکل سمجھ گیا۔ سچ کے زہر سے جھوٹ کا امرت اچھا۔ ان کے دل کی تسلی کے لیے تم ضرور جاؤ۔'' اشونی نے گہرا سانس لیا۔

''ہاں میں ان ہی کے دل کی تسلی کے لیے جا رہا ہوں اور وہاں ایک دوسری قبر بھی ہے وہاں فاتحہ پڑھنے کا بھی انہوں نے حکم دیا ہے۔''

''یہ دوسری قبر کس کی ہے؟'' اشونی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''دوسری بہادر شاہ ظفر کی ہے۔''

''مائی گاڈ۔ یار تمہاری دادی صاحب تو بہت توپ مہیلا ہیں۔''

''پکی نیشنلسٹ ہیں۔ پڑھی لکھی ہوتیں اور نیتا جی تک پہنچ جاتیں تو جھانسی کی رانی رجمنٹ میں ہوتیں۔'' عرفان ہنس دیا۔ ''ویسے ان کا حکم نہ ہوتا تب بھی میں بہادر شاہ ظفر کی قبر پر حاضری دیتا۔''

''ہاں ڈئیر۔ حاضری تو اپنے نیتا جی نے بھی دی تھی۔ وچن دیا تھا کہ انگریزوں کو

دلی سے نکال کر لاسٹ مغل کی ہڈیوں کو دلی لے جائیں گے۔ اپنے اتہاس سے یہ کیسے جڑے ہوئے لوگ تھے۔''

عرفان نے ایک ٹھنڈی سانس لی ''نیتا جی آدرش وادی تھے اس لیے مارے گئے۔ بہادر شاہ کی ہڈیاں واپس لانے کا خواب دیکھتے تھے اور خود ان کی اپنی ہڈیاں نہیں ملیں۔ ادھر پٹیل کو دیکھو' کس قدر پریکٹیکل۔ چٹکی بجاتے سارے راجوں' مہاراجوں اور نوابوں کا جھٹکا کر دیا پر کسی نے چوں نہیں کی۔''

وہ دونوں منہ لٹکائے بیٹھے رہے اور باہر دلی کی رات جھوم کر چلتی رہی۔ دلی جو کتنی ہی بار لٹی تھی' ایک بار پھر سہاگن تھی۔

اس رات عرفان جب منہ میں خوشبو والا پان دبا کر اشوفی سے رخصت ہوا تو اپنا بجاج دوڑاتے ہوئے وہ زور زور سے دادی صاحب کا محبوب گیت گا رہا تھا۔ ''تمہاری یاد ستاتی ہے۔ جیا میں آگ لگاتی ہے۔ میرے پیا گئے رنگون'' اور اب وہ چھٹیاں گزارنے رنگون جا رہا تھا۔

☆☆☆

ایئرپورٹ سے وہ اور انتھونی دونوں سیدھے ''سوائے'' پہنچے تھے۔ رنگون میں اب بہت سے نئے ہوٹل کھل گئے تھے لیکن ''سوائے'' کی بات الگ تھی۔ کھپریل کی چھتیں' بڑے علاقے پر پھیلا ہوا اور کولونیل طرز تعمیر۔ اسے اونچی اونچی عمارتوں سے وحشت ہوتی تھی۔ عرفان ہوٹل واپس آتے ہوئے دیکھتا تھا کہ دن میں ہونے والے خون خرابے کی نشانیاں مٹا دی گئی ہیں۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اور انتھونی کے کیمرے نے مارے جانے والے بھکشوؤں' لڑکوں اور لڑکیوں کی لاشیں دیکھی تھیں جنھیں فوجی ٹرکوں میں ڈال کر لے جایا گیا تھا اور پھر وہ سب بڑے بڑے گڑھوں میں دبا دیے گئے۔ ان کے گھر والے اسی طرح ان کا انتظار کریں گے جس طرح دادی صاحب برسوں اپنے سہاگ کا انتظار کرتی رہی تھیں۔ کسی پیارے کا ''لاپتا'' ہو جانا گھر والوں کے لیے عمر بھر کا عذاب۔

اسے رنگون کا اپنا پہلا سفر یاد آیا جب وہ اپنی دادی صاحب کے بادشاہ کی قبر پر گیا تھا اور اس دو گز زمین کے سامنے کھڑا رہا تھا جو اس بد بخت بادشاہ اور شاعر کو اپنی دلی میں نہ مل سکی تھی۔ کیسی ویرانی اور غریب الوطنی برستی تھی ان قبروں پر۔ اسی وقت اسے برما کا ہندوستان جلاوطن کیا جانے والا بادشاہ اور اس کی ملکہ یاد آئے تھے' وہ دونوں رتنا گری میں ختم ہوئے تھے۔ ظفر اور زینت محل کا آخری ٹھکانہ رنگون کی سرزمین ہوئی تھی۔ پھول چڑھاتے اور اگر بتی جلاتے ہوئے اس نے انگریزوں کو دل ہی دل میں وہ تمام گالیاں دے دی تھیں جو اسے آتی تھیں۔ جب وہ واپس گیا تو بہادر شاہ اور زینت محل کی شاندار قبروں کا نقشہ اماں اور دادی صاحب کے سامنے کھینچتا رہا تھا۔

''ارے تو فوٹو اتار کر کیوں نہیں لایا؟'' دادی صاحب نے اسے آنکھیں دکھائی تھیں۔

''اتاری تو تھیں دادی صاحب ریل خراب ہوگئی۔'' اس نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھوٹ بولا۔ ''دادا صاحب کی قبر کی بھی اتاری تھی۔'' سچ کے زہر سے جھوٹ کا امرت اچھا تھا۔

یہ سن کر دادی صاحب اپنی ناس پیٹی تقدیر کو برا بھلا کہتی رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ رنگون کی اس ویران سڑک کو دیکھتا رہا۔ جس پر دن میں اور اس سے پہلے کے دنوں میں مارے جانے والوں کی روحیں بین کر رہی تھیں اور بدھ بھکشوؤں کے جاپ کی آوازیں روحوں کے بین میں رل مل گئی تھیں۔ ''بدھم سرنم گچھامی...... دھمم سرنم گچھامی...... سنگھم سرنم گچھامی۔'' لیکن عظیم قانون کی' سنگھ کی اور بدھ کی امان کہیں نہیں تھی۔

یہ شہر' یہ ملک ایک صدی سے بے امان تھا' پہلے انگریزوں اور اب اپنے فوجیوں کے ہاتھوں۔ وہ دلی سے اسی لیے بھیجا گیا تھا کہ 1988ء میں ہونے والی خونیں بغاوت کی انیسویں سالگرہ کے موقع پر رنگون کی سڑکیں ایک بار پھر خون سے دھوئی

جا رہی تھیں۔

دو فوجی ٹرک غراتے ہوئے گزرے جس کے بعد خوف سے بوجھل خاموشی ایک بار پھر چھا گئی۔

ابتدائی خبریں اسے دلی میں ہی مل گئی تھیں۔ اس مرتبہ بغاوت کی سالگرہ منانے کے لیے بھکشو نکلے تھے۔

پہلے دن وہ نکلے تو چند درجن تھے پھر ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ 45 برس سے فوج کے چنگل میں پھڑ پھڑاتی ہوئی برمی قوم ہراساں نگاہوں سے اپنے ان بھکشوؤں کو دیکھتی رہی پھر ڈرتے جھجکتے ہوئے کچھ عام لوگ بھی ان پُرامن مظاہروں کا حصہ بنتے گئے' ان مظاہروں میں شریک ہونے والے بھکشوؤں اور ان کے ماننے والوں کی تعداد بڑھتی گئی تو جرنیلوں کے ضبط کا پیمانہ چھلک گیا۔ 5 ستمبر کو شہر میں سینکڑوں بھکشو برما کی فوجی حکومت کے خلاف پُرامن مظاہرہ کرنے نکلے تو ان کے سروں سے چند انچ اوپر گولیاں چلائی گئیں' بہت بری طرح لاٹھی چارج ہوا اور آنسو گیس چھوڑی گئی۔ جس کے نتیجے میں بہت سے بھکشو اور ان کے احتجاج میں شامل شہری زخمی ہو گئے۔ اس تشدد نے مظاہرین کو مشتعل کر دیا۔ بھکشوؤں نے کئی فوجیوں کو کچھ دیر کے لیے یرغمال بنالیا۔ ایک سرکاری اہلکار کے گھر پر حملہ ہوا اور کئی فوجی اور سرکاری گاڑیوں کو توڑ پھوڑ کا نشانہ بنایا گیا۔

اندازہ یہی تھا کہ تشدد تیزی سے پھیلے گا' اسی لیے دلی کے بی بی سی آفس نے اسے اور انتھونی کو فوراً روانہ کر دیا تھا۔

اس نے کھڑکی کا پردہ برابر کیا اور اپنے بستر پر آلیٹا۔

کیسا ظلم تھا کہ اس شہر میں وہ عورت رہتی تھی جو پچھلے بارہ برس سے قید تنہائی کاٹ رہی تھی۔ سوچی جس نے 88ء میں لندن کی اپنی خوش و خرم اور پُرسکون زندگی تیاگ کر اپنے لوگوں کو بغاوت اور جدوجہد کا حوصلہ دیا۔ جس نے بار بار کہا تھا کہ خوف ایک مہذب انسان کی فطرت نہیں اور یہ بات صرف کہی نہیں تھی کر دکھائی تھی۔

وہ سالہا سال سے دنیا میں برما کی جمہوری جدوجہد کی ہیروئن کے طور پر پہچانی

جاتی تھی۔ اس کے بے مثال عزم اور ارادے کے اعتراف میں اسے نوبیل اور سخاروف امن انعام دیا گیا تھا۔ اس نے اپنے لوگوں سے عہد وفا یوں نبھایا کہ لندن میں اس کا محبوب شوہر بستر مرگ پر تھا لیکن اس نے برما چھوڑنے سے اس لیے انکار کر دیا کہ فوجی حکومت اسے دوبارہ کسی قیمت پر برما میں داخل نہیں ہونے دے گی۔ وہ مائیکل کے آخری دیدار سے محروم رہی۔ بارہ برس سے اس نے اپنے بیٹوں کو گلے نہیں لگایا تھا۔ وہ ایک ایسے باپ کی بیٹی تھی جس نے برما کو برٹش راج سے نجات دلائی تھی لیکن اسے قتل کر دیا گیا اس وقت سوچی دو برس کی تھی۔

عرفان کو نئی دہلی کے قلب میں ایکڑوں پر پھیلی ہوئی کولونیل وضع کی وہ کوٹھی یاد آئی جو 24۔ اکبر روڈ کہلاتی تھی۔ اقتدار پر قبضہ کرنے والے جرنیلوں نے جب سوچی کی ماں کو ہندوستان کا سفیر بنا کر بھیجا تو پنڈت نہرو نے یہ کوٹھی برمی سفیر کی رہائش کے لیے منتخب کی تھی۔ 24 اکبر روڈ پر ہونیوالی کئی دعوتوں میں پنڈت جی شریک ہوئے تھے۔ ان کے چہیتے نواسے راجیو اور سنجے اس کوٹھی میں سوچی کے ساتھ سائیکل چلاتے' شرارتیں کرتے' مہاتما گاندھی' ہندوستانی تحریک آزادی اور برما کے ادب جیسے موضوعات پر ان تینوں نے کتنی باتیں کی تھیں۔ سوچی اپنی ہندوستانی سہیلیوں کے ساتھ راجیو اور سنجے کو بھی پارٹی میں بلاتی اور ان سب کے لیے پیانو بجاتی' اس وقت کون جانتا تھا کہ تقدیر کے ان تین زندانیوں کے لیے کتنے کٹھن اور خوں رنگ دن آنے والے ہیں۔

عرفان کا دم گھٹنے لگا۔ اسے دادی صاحب یاد آئیں انہوں نے اپنے رنگون کے بارے میں بھلا کب سوچا ہوگا کہ اس پر کیسی کیسی آفتیں گزریں گی۔ اسے وہ رپورٹیں یاد آئیں جو وہ دلی سے پڑھ کر چلا تھا اور جن میں بتایا گیا تھا کہ سوچی اپنے جس آبائی گھر میں نظر بندی کے دن گزار رہی ہے وہاں اس سے ملنے ہوائیں آتی ہیں یا پیڑوں پر بسیرا کرنے والے پرندے۔ اسے کسی سے ملنے بات کرنے اور بیرونی دنیا سے رابطہ رکھنے کی اجازت نہیں۔ ایک ملازمہ ہے جو چوبیس گھنٹے ساتھ رہتی ہے۔ ایک ڈاکٹر ہے جو اس

کے طبی معائنہ کے لیے آتا ہے۔ اس کے گھر کو جانے والے راستے پر رکاوٹیں ہیں۔ لیکن دو دن پہلے احتجاجی مظاہرہ کرنے والے بھکشوؤں نے اور ان کے پیچھے چلنے والوں نے سوچی کے گھر کا رخ کیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سپاہیوں نے رکاوٹیں ہٹا دی ہیں۔ وہ جاپ کرتے ہوئے دروازے تک پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ دبلی پتلی آہنی ارادے والی آنگ سان سوچی دروازے تک آ گئی ہے' اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ برسوں بعد اتنے لوگوں کو اکٹھا دیکھ رہی تھی۔ وہ تنہا عورت اور جذبات سے مغلوب سینکڑوں بھکشو اور عام شہری ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور لوگوں کی آنکھوں سے آنسو گرتے رہے۔ پندرہ منٹ بعد آنے والے واپس چلے گئے اور سوچی بھی اپنے زنداں میں لوٹ گئی۔ یہ اتنا بڑا واقعہ تھا کہ سارے برما میں جیسے زندگی کی لہر دوڑ گئی۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ اتوار کے دن رنگون کی سڑکوں پر بیس ہزار سے زیادہ بھکشو چل رہے تھے اور پہلی مرتبہ بودھ بھکشنیں بھی اس احتجاجی جلوس میں شامل تھیں۔ یہ سب لوگ با آواز بلند جاپ رہے تھے ہزاروں لوگ ان کے ساتھ تھے۔ انہیں شربت پلا رہے تھے، ان کے قدموں میں جھک رہے تھے۔ اس روز جلوس کو سوچی کے گھر کا رخ کرنے کی اجازت نہیں ملی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جرنیل شاہی کی قوت برداشت ختم ہونے والی ہے۔

☆☆☆
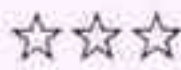
عرفان نے سرہانے رکھی ہوئی نوٹ بک اٹھا کر برما کے بارے میں اپنے نوٹس کو ایک بار پھر پڑھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان میں سے سوال نکلیں گے اور ان ہی کے جواب کے لیے جرنیلوں اور ان کے وزیروں کو کریدنا ہوگا' جنرل تھان سے انٹرویو کا وقت طے ہو چکا تھا۔ اس نے چند سوالات لکھے تھے جو تیکھے تھے لیکن اتنے بھی نہیں کہ اسے اگلے جہاز سے دلی واپس بھیج دیا جائے۔ سوچی نے دلی میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں پڑھا تھا۔ عرفان سوچی کے ساتھ پڑھنے والیوں اور پڑھنے والوں سے مل کر آیا تھا۔ عرفان نے اس کے بارے میں کیسی کیسی باتیں سنی تھیں۔ ایک ایسی ہی آہنی عزم والی عورت یوں اتنی

طویل قید تنہائی کاٹ سکتی ہے۔ اس کا دل تڑپا ''کاش میں اس کا انٹرویو کرسکتا''، لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ ناممکن ہے۔ اس نے کروٹ لی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ چند گھنٹوں بعد ایک صبر آزما صبح طلوع ہونے والی تھی۔

☆☆☆

وہ گیروے لبادوں والے بھکشوؤں کے دریا میں کسی مچھلی کی طرح تیرتا رہا' وہ ''دھم سرنم گچھامی'' کا جاپ کرتے ہوئے چل رہے تھے۔ انتھونی اس سے ذرا آگے تھا۔ کیمرہ کندھے پر رکھے ہوئے الٹے قدموں چلتا ہوا۔ پھر اس نے انتھونی کو دیکھا جو لپک کر ایک پیڈسٹرین برج کی سڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ جلوس میں اٹھتی ہوئی انسانی لہروں کو فلم کے فیتے پر محفوظ کرنے کے لیے۔ وہ بھی تیزی سے انتھونی کے پیچھے ہولیا۔ آن کی آن میں وہ سڑک سے بلندی پر تھا اور سامنے سے انسانوں کا سیلاب چلا آ رہا تھا۔

سر گھٹے ہوئے' تن پر گیروے رنگ کا لبادہ' کچھ کے پیروں میں کھڑاویں' کچھ مونجھ کی چپلیں پہنے ہوئے اور بیشتر ننگے پیر۔ ریاضت اور فاقہ کشی سے گھلے ہوئے بدن' چہرے زرد' اور کھال جبڑے کی ہڈیوں پر منڈھی ہوئی' عرفان کو ''فاسٹنگ بدھا'' کا مجسمہ یاد آیا۔ وہ قطار در قطار چل رہے تھے' ہاتھوں میں سیاہ رنگ کے کشکول' لیکن ہر کشکول کا رخ زمین کی طرف تھا۔ اس بات کا اشارہ کہ وہ کسی فوجی' کسی سرکاری افسر سے خیرات نہیں لیں گے۔

وہ انہیں دیکھتا رہا اور اس کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ وہ پالی زبان کے تین مقدس جملوں کا جاپ کرتے ہوئے چلتے چلے جا رہے تھے۔ ''بدھم سرنم گچھامی' دھم سرنم گچھامی' سنگھم سرنم گچھامی'' میں بدھ کی امان چاہتا ہوں' میں عظیم قانون کی امان چاہتا ہو' میں سنگھ کی امان چاہتا ہوں۔

ان کے جاپ کی آواز رنگون شہر کی اداس اور حبس زدہ فضا میں پانی سے بھرے ہوئے بادل کی طرح تیر رہی تھی۔ یہ دھان بونے کے دن تھے' پھر اس موسم میں غصہ کیوں بویا جا رہا تھا؟ وہ جن کی زندگی کا انحصار دھان پر تھا وہ اس کی بوائی کے بجائے

غصہ کاشت کر رہے تھے۔

☆☆☆

بانس اور ناریل سے بنا ہوا چھپر تھا۔ جس کے نیچے لکڑی کی لمبی لمبی بنچیں رکھی تھیں اور ویسی ہی لمبی میزیں۔ مٹی کے بڑے سے چولہے پر جہازی سائز کی کیتلی رکھی تھی جس کا رنگ دھوئیں کی وجہ سے اتنا سیاہ ہو چکا تھا کہ کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ کبھی روپہلے رنگ کی رہی ہوگی۔ چھپر کے نیچے کئی لوگ بیٹھے تھے۔ سب کے سامنے چائے رکھی تھی۔ کوئی چائے میں بسکٹ ڈبو کر کھا رہا تھا لیکن سب کے چہروں پر تناؤ تھا اور خاموشی تھی۔ انتھونی کو چائے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کے خیال میں خدا باپ نے پینے کے لیے صرف ایک ہی چیز بنائی تھی۔ خواہ وہ ٹھرا ہو یا ولایتی' پانی وہ شاید کم ہی پیتا تھا۔ عرفان اس کی برداشت پر رشک کرتا۔ عرفان نے اسے کہنی سے ٹہوکا دیا اور وہ اٹھ کر دوسری بنچ پر جا بیٹھا اور پھر نیم دراز ہو کر اپنے کیمرے کے ساتھ لاڈ کرنے لگا۔ عرفان نے وہ بینچ منتخب کی جس پر ایک برمی نوجوان تنہا بیٹھا تھا۔ بش شرٹ اور پینٹ خستہ حال ضرور تھیں لیکن صاف ستھری۔ عرفان جانتا تھا کہ وڈیو فوٹیج میں سچ کا رنگ اسی وقت چھلکتا ہے جب مقامی لوگوں سے کسی سڑک' پارک' ڈھابے پر بیٹھ کر باتیں کی جائیں' کوئی رکشے والا' کوئی پھول بیچنے والی۔ عرفان نے اپنی جیب سے ڈن ہل کا چمکتا ہوا سرخ رنگ کا ڈبا نکالا اور مسکراتے ہوئے اس لڑکے کی طرف بڑھایا' اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی لیکن پھر بجھ گئی۔ وہ ڈن ہل کے ڈبے کو دیکھتا رہا لیکن اس نے سگریٹ لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ تب عرفان نے پیکٹ کھول کر ایک سگریٹ اپنے لیے نکالی اور دوسری اس کی طرف بڑھائی۔ وہ چند لمحوں کے لیے جھجکا' ادھر ادھر نظر ڈالے جیسے دیکھنے والی آنکھوں سے خوفزدہ ہو' پھر اس نے سگریٹ نکال کر ہونٹوں سے لگالی۔ عرفان نے اس کی اور اپنی سگریٹ سلگائی اور ایک گہرا کش لیا۔ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا آدمی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عرفان نے اسے اشارے سے دو چائے کے لیے کہا پھر بسکٹ کے لیے بھی ہانک لگائی۔

وہ نوجوان سے باتیں کرنے لگا جس کا نام شیولی تھا۔ کسی دکان پر سیلز مین تھا اور ادیب بننے کے خواب دیکھتا تھا۔ غصہ اس کے اندر ابلتا تھا' بل کھاتا تھا لیکن وہ اپنے غصے کا اظہار نہیں کرسکتا تھا۔ دنیا عجیب جگہ ہوگئی تھی۔ آپ اپنے بھائی پر بھی اعتبار نہیں کرسکتے۔ حکومت نے ہر جگہ اپنے جاسوس چھوڑ رکھے تھے۔

وہ بسکٹ چائے میں ڈبو کر کھاتا رہا اور اتنی آہستگی سے بولتا رہا کہ عرفان کو اس کے بعض جملے سمجھنے میں مشکل ہورہی تھی۔ دو دن سے ایک سوال عرفان کو پریشان کررہا تھا' اس سے رہا نہ گیا اور وہ شیولی سے پوچھ بیٹھا ''یہ بتاؤ تمہارے یہاں ٹریفک بہت کم ہے' کبھی کبھی تو صرف کوئی کتا دم ہلاتا ہوا سڑک پار کرتا نظر آتا ہے پھر یہ شہر میں پیدل چلنے والوں کے لیے اتنے اوور ہیڈ برج کیوں بنے ہوئے ہیں۔؟''

شیولی تلخی سے مسکرایا ''تم نے یہ سوال ان سرکاری افسروں سے نہیں کیا جو کل تمہارے آگے پیچھے پھر رہے تھے۔''

عرفان اس جملے پر حیران رہ گیا۔ ''تم میرے بارے میں کیا اور کیسے جانتے ہو؟''

''جہاں فوج لوگوں کی گردنوں پر اپنے کیلوں والے بوٹ رکھے ہوئے ہو وہاں لوگ باہر سے آنے والے جرنلسٹوں کے بارے میں فوراً ہی سب کچھ جان لیتے ہیں'' شیولی کا لہجہ ٹھنڈا تھا۔ سان رکھے ہوئے چاقو کی دھار کی طرح ٹھنڈا۔

''ان سے بھی پوچھ لوں گا۔ پہلے تم بتادو۔''

''تم کبھی جنگل میں شکار کھیلنے گئے ہو؟''

''ہاں گیا ہوں۔''

''کبھی شیر کا شکار کرنے کے لیے مچان پر بیٹھے ہو۔''

''شیر کا شکار نہیں کیا لیکن مچان پر بیٹھا ہوں۔''

''یہ پیڈسٹرین برج نہیں مچانیں ہیں۔ ان پر سے فوجی شیروں کا شکار کرتے ہیں۔ بھکشوؤں کا' نوجوانوں کا' ان پر سے نشانہ لینا آسان ہوتا ہے۔'' شیولی کے لہجے سے نفرت ٹپک رہی تھی۔ ''میں تمہیں بتاؤں ہمارے لیڈروں نے ڈکٹیٹروں کے نام خط

لکھنے کی مہم چلائی۔ اپنی مشکلوں اور شکایتوں کے بارے میں جنرل تھان کو پچھلے اکتوبر میں پانچ لاکھ لوگوں نے خط لکھے۔ پانچ لاکھ کا مطلب سمجھتے ہو۔؟ ہاں ہم پانچ لاکھ لوگوں نے ایک اپیل پر دستخط کیے کہ ملک میں ہزار سے زیادہ جو سیاسی قیدی ہیں اور ہماری لیڈر سوچی ہیں انہیں رہا کر دیا جائے۔ ہمیں یقین تھا کہ ہماری اپیل سن لی جائے گی لیکن ان اندھوں کو کچھ دکھائی نہیں دیتا' ان بہروں کو کچھ سنائی نہیں دیتا۔'' شیولی کی آواز اب قدرے بلند ہو گئی تھی۔

کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص نے جو شاید چھپر ہوٹل کا مالک تھا' غرا کر برمی میں شیولی سے کچھ کہا اور اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔

''میرے گھر والے مجھے بھی ڈھونڈتے پھریں گے۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا اور اٹھ کر تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ کئی لوگوں کی آنکھیں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

عرفان کو جھرجھری سی آئی۔ انتھونی نے اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ کاؤنٹر پر گیا اور پانچ ڈالر کا نوٹ رکھ کر کچھ کہے بغیر اس چھپر ہوٹل سے نکل گیا۔

☆☆☆

ان دو دنوں میں وہ کئی فوجی افسروں اور سول بیوروکریسی کے لوگوں سے ملا تھا لیکن اُن کی سنائی ہوئی کہانی کتنی مختلف تھی اور یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ہر اس جگہ جہاں ڈکٹیٹر شپ تھی وہاں کے لوگ دو زبانیں بولتے تھے۔ ایک حکومت کی زبان اور دوسری عوام کی بولی۔ یہ دونوں زبانیں حاکم اور محکوم طبقے کے لیے ناقابل فہم تھیں۔

جنرل تھان کا انٹرویو ہوتے ہی دلی سے انہیں واپس آنے کا پیغام ملا تھا' یوں بھی اب وہاں رکنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ فضا میں خون کی بساندھ تھی اور لاشوں پر مردار خور منڈلاتے تھے۔

ان کا طیارہ فضا میں بلند ہوا تو وہ جانتا تھا کہ دھان کے کھیت جن میں کھڑے ہوئے پانیوں کا رنگ بھی سبز ہو جاتا ہے اس مرتبہ ان پانیوں میں خون کی سرخی تھی۔

نوجوان خون کی سرخی۔

☆☆☆☆

دلی واپس آ کر اسے کئی دن تک سر اٹھانے کی فرصت نہ مل سکی۔ اشونی سے ملاقات اب کم ہوتی تھی، وہ ابھی تک پرنٹ میڈیا سے جڑا ہوا تھا۔ کام کرتے کرتے اسے دادی صاحب یاد آئیں اور وہ ہڑ بڑا کر کھڑا ہو گیا۔

وہ ہر دس پندرہ دن بعد قبرستان کا چکر ضرور لگاتا تھا، لیکن اس مرتبہ خاصا لمبا ناغہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے دوست راشد کے تجربے سے ڈرا ہوا تھا۔ سارا خاندان امریکا چلا گیا صرف راشد یہاں رہ گیا تھا۔ کئی برس بعد جب ماں دلی آئیں اور قبرستان گئیں تو ان کی ماں کی قبر کا نام ونشان تک نہ تھا۔ انہوں نے راشد کو سو طعنے دیے کہ تم نے نانی کی قبر پر جھانکی بھی نہ ماری۔ لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ خاندان امریکا میں آباد ہوا تھا ایسے میں گورکن نے اگر نانی کی قبر سے ان کی ہڈیاں نکال کر کسی اور کو آباد کر دیا تو کیا غلط کیا۔

عرفان نے جب سے راشد کی زبانی یہ کہانی سنی تھی، اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ ہر دس پندرہ دن پر قبرستان کا چکر لگاتا، پانی ڈالتا، پھول چڑھاتا، گورکن کو دھمکاتا۔ یہ نہ ہو کہ دادی صاحب کی ہڈیاں بھی اسی طرح کسی گڑھے میں گم ہو جائیں جس طرح دادا صاحب کی ہڈیوں کا نام ونشان نہیں رہا تھا۔ وہ بھلا ان کی ہڈیاں کہاں ڈھونڈتا پھرے گا۔

اس کا حلق خشک ہو رہا تھا اس نے راستے میں گاڑی روک کر سمرنوف کا ایک ادھا اور بیزلری کی بوتل خریدی اور دونوں کو ملا کر پیتا گیا۔

راستے میں ٹریفک کا ہجوم ایسا تھا کہ گاڑیاں رینگ رہی تھیں، اسے قبرستان پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی اور ادھا بھی ختم ہو گیا۔

گاڑی سے اترتے ہوئے اسے خیال آیا کہ شراب پی کر قبرستان میں جانا تو بری بات ہے۔ پھر اس نے خود ہی اپنے دل کو تسلی دی۔ میں دنیا میں کون سے نیک کام کر رہا ہوں اور دادی صاحب کی محبت میں تو سب جائز ہے۔

قبرستان کے ساتھ ہی پھول والوں کی دکانیں تھیں۔ ایک ٹھیلے پر گنے کا رس نکالا جارہا تھا جس پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ فقیر' فقیرنیاں' ان کے ننگ دھڑنگ بچے۔ کچھ کی گردنوں میں تعویذ اور کچھ کا لباس فاخرہ محض وہ کالا دھاگا تھا جو نظر نہ لگنے کے ڈر سے ان کی ماؤں نے کمر کے گرد باندھ دیا تھا۔ عرفان نے پھول' اگر بتیوں کا پیکٹ' شمعیں اور دیا سلائی خریدی۔ چلتے چلتے اسے چکر آیا اور وہ ایک تازہ کھدی ہوئی قبر میں گرتے گرتے بچا۔ کھلی ہوئی قبر اپنی پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے مردے کی منتظر تھی۔ سامنے سے دنیا ہنستی ہوئی گزر رہی تھی اور قبروں میں سونے والے ان پر ہنس رہے تھے۔ ''آج ہم کل تمہاری باری ہے۔''

ایک ڈھانچے نے اپنے پڑوسی ڈھانچے سے کہا۔ ''یار ذرا دو گھونٹ مجھے بھی دیجیو۔''

''کیوں دوں؟ کل تم سے کتنا کہا تھا کہ ذرا میرے ساتھ چلو' ایک دو ادھے اڑا لاتے ہیں لیکن تمہیں تو برابر کی قبر آباد کرنے والی فلم اسٹار کو تاکنے جھانکنے سے فرصت نہ تھی۔'' دو گھونٹ مانگنے والے کو ڈانٹ پڑی۔

عرفان نے اپنے سر کو جھٹکا' کیا مردے بھی شرابی ہونے لگے تھے؟ یا یہ سمرنوف کا کمال تھا جسے وہ راستے میں چڑھا گیا تھا۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے قبروں کو پھلانگتا ہوا دادی صاحب کی قبر تک جا پہنچا اور سکون کا سانس لیا۔ وہ وہیں تھیں کہیں نہیں گئی تھیں۔ پھولوں کا دونا ان کے سرہانے لوٹ کر اس نے شمعیں روشن کیں' اگر بتیاں جلائیں اور کچی مٹی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

ان کی قبر کو پختہ کرانے کے باوجود قبر کا سینہ اس نے ان کی وصیت کے مطابق کچا رہنے دیا تھا اور اس میں بیلے کا پودا لگایا تھا جس میں اب پھول آنے لگے تھے۔ ہر طرف بیلے کی خوشبو میں رلی ملی دادی صاحب کی خوشبو تھی۔ بیلے کی کلیاں گنگنانے لگیں۔ مرے پیا گئے رنگون...... تمہاری یاد ستاتی ہے...... جیا میں آگ لگاتی ہے۔ عرفان نے گھٹنے سمیٹ کر اپنا سر گھٹنوں پر رکھ دیا اور رونے لگا۔ دادی صاحب آپ کا رنگون لٹ گیا'

وہاں اب خون کی بساندھ ہے' بے نام ہڈیاں ہیں۔ کچھ گوشت مردار خوروں نے نوچا اور کچھ رنگون کی گلیوں میں پھرنے والے کتے' بلیوں نے کھایا۔ وہاں رہنے والوں کے پیٹ پیٹھ سے لگے ہوئے ہیں اور کتے بلیوں کے بدن تگڑے۔ دلی جب لٹی ہوگی تو یہاں بھی کتے بلیوں کی' مردار خور پرندوں کی بن آئی ہوگی۔ جانے کس محلے کا رہنے والا' کس جانور یا پرندے کی خوراک ہوا۔ دادی بیگم کی آواز پھر اس کے کانوں میں گونجی...... بیلا بھی بویا...... چنبیلی بھی بوئی...... میں نے بوئے ہزاروں پھول...... اللہ میرے ہمیں نہ دل سے بھول...... مولا میرے ہمیں نہ دل سے بھول...... عرفان کے اندر طیش ابلنے لگا۔ دادی صاحب آپ کے اللہ نے' آپ کے مولا نے کب یاد رکھا آپ کو؟ چند ٹکوں کی خاطر آپ کے سہاگ کو چیل کووؤں نے کھایا۔ آپ کا اکلوتا بیٹا بلوائیوں نے مار دیا۔ اس پر بھی آپ بنتی کرتی رہیں اللہ میرے ہمیں نہ دل سے بھول' مولا میرے ہمیں نہ دل سے بھول...... آپ جیسی' اماں جیسی عورتوں کو آسمان نے کس کس طرح بے وقوف نہیں بنایا۔؟

اگر بتیوں کی خوشبو فضا میں پھیل گئی تھی۔ شمعیں پگھل کر بہہ گئی تھیں اور ان کی لو اپنے ہی پگھلے ہوئے گرم موم میں بجھ رہی تھی۔ زمین و آسمان نے' قبروں اور قبرستان نے رات کا رنگ اوڑھ لیا تھا۔ رات کا رنگ یا موت کا رنگ؟ اس کا سینہ تڑخنے لگا۔ وہ ابھی تو دیکھ کر آیا تھا بہادر شاہ کی قبر' جس نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو اپنی دو آنکھیں کہا تھا۔ جس کے دستر خوان پر بیٹوں کے سر خوان میں سجا کر بھیجے گئے تھے' اس نے کیسے دو دھاری شعر کہے تھے۔ دادی صاحب اس کی قبر میں برسات کا پانی بھر گیا تھا۔ بیٹھ گئی تھی۔ انڈین ہائی کمیشن کے ایک افسر نے ٹھیک کرائی ہے۔ مقبرہ بھی نئے سرے سے بنوایا ہے۔ آپ کے خادمِ حرمین شریفین نہیں آئے اس کا مقبرہ بنوانے' میرا ابھی دماغ خراب ہے وہ تو جنت البقیع پر بلڈوزر چلواتے ہیں' وہ کیا خاک کسی کی قبر ٹھیک کراتے؟۔

پھر وہاں سے گیروے لبادوں میں قطار در قطار بھکشو اور بھکشنیں گزرنے لگیں۔ ان کے ہاتھوں میں لالٹینیں جھول رہی تھیں جن کی روشنی آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔

وہ انہیں سمجھانا چاہتا تھا۔ امان کہیں نہیں تھی۔ پناہ کہیں نہیں تھی۔ اس کا سر چکرایا تو اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ کسی نے اس کا شانہ ہلایا۔ ''بھائی شاب' اِتارات ہوگیا آپ گورستان میں کیا کورتا؟ آپ کو ڈور نہیں لگتا'' کوئی اس سے رسانیت سے کہہ رہا تھا۔ عرفان نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ بنگالی مولوی صاحب ہاتھ میں لالٹین تھامے اسے دیکھ رہے تھے۔ یہ مولوی صاحب قبرستان میں چھپر ڈال کر رہتے تھے۔ قبرستان آنے والے اپنے پیاروں کے لیے ایک آدھ سپارہ پڑھوا لیتے تھے اور کچھ قبروں پر ہر جمعرات کو تلاوت ان کی ذمہ داری تھی۔ کچھ نہ کچھ گزر گزران ہوجاتی ہوگی تب ہی چٹا گانگ' نواکھالی یا راج شاہی چھوڑ کر دلی میں بیٹھے تھے' کئی بار عرفان نے بھی انہیں کچھ روپے نذر کیے تھے کہ دادی صاحب کے سرہانے بیٹھ کر تلاوت کردیا کریں۔

عرفان کی ٹانگیں سن ہوگئی تھیں اس نے ان کی طرف ہاتھ بڑھایا جسے مولوی صاحب نے تھام لیا' نرم اور مہربان ہاتھ۔ وہ ان کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر جتنے بھی نوٹ مٹھی میں آئے وہ اس نے ان کی مٹھی میں رکھ دیے۔ مولوی صاحب اپنی لالٹین جھلاتے ہوئے اسے روشنی دکھاتے ہوئے چلے۔ جب ہر طرف گھور اندھیرا ہو روشنی کہیں نہ کہیں سے نمودار ہوجاتی ہے۔ کوئی مٹھی میں جگنو لے آتا ہے اور کوئی پیڑ کے کھوکھلے تنے میں چراغ رکھ دیتا ہے۔ اس نے سر کو جھٹکا۔ آنکھوں کے سامنے سے دھند چھٹ رہی تھی۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا قبرستان سے باہر نکل آیا۔

ساری دنیا تقدیر کی زندانی تھی اور کسی کو بھی امان نہیں ملتی تھی۔ پناہ کہیں نہیں تھی۔

اس کی نگاہوں میں بدھ بھکشوؤں کی' نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی لاشیں گھوم گئیں جنہیں ڈمپر اٹھا کر ٹرکوں میں بھر رہے تھے اور جن پر مردار خور جھپٹ رہے تھے۔

اس نے گاڑی آگے بڑھائی' کچھ آگے جا کر اس کی نظر اس کھوکھے پر پڑی جہاں سے اس نے کئی بار چائے پی تھی۔ مٹی کی انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے تھے جس پر ایک بڑی سی کیتلی چڑھی ہوئی تھی۔ اس کھوکے کی چائے پینے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ کوئلے کی دھیمی آنچ پر پکتی ہوئی چائے جس میں پتی کے ساتھ ساتھ پوست کے ڈوڈے

بھی ابلتے تھے۔ کھوکھے کی ایک دیوار پر مہاتما بدھ کا پوسٹر تھا۔ عرفان نے گاڑی فٹ پاتھ کے ساتھ لگا کر روک لی اور انہیں دیکھتا رہا۔ نارنجی رنگ میں رنگے ہوئے بدھ' نیم وا آنکھوں میں زمانے بھر کا سکون' چہرے پر مسکراہٹ' تالاب کے پانی میں کنول پر بیٹھے ہوئے' بھکشوؤں کا جاپ پانی پر لہریں لینے لگا۔ بدھم سرنم گچھامی' دھمم سرنم گچھامی' سنگھم سرنم گچھامی۔ نہیں' مائی ڈیئر لارڈ بدھا پناہ کہیں نہیں ہے۔ امان کہیں نہیں ہے۔ آپ اپنے جرنیلوں کے خواب میں کیوں نہیں آتے؟ انہیں حکم کیوں نہیں دیتے کہ وہ شیروں کا شکار نہ کریں۔ تاریک جنگلوں میں ہڈیاں چمکتی ہیں۔ شیروں اور شیرنیوں کی ہڈیاں۔ چھپ چھپ کر روتے ہوئے ماں باپ اپنے بچوں کی ہڈیاں کیسے پہچانیں۔

اس نے اپنا سر اسٹیئرنگ پر رکھ دیا اور آنسو تقدیر کے اس زندانی کا چہرہ دھوتے رہے انسانوں کے دکھ دیکھنا اور انہیں دوسروں کو دکھانا جس کا مقدر تھا۔ دکھانے والا اور دیکھنے والے سب تقدیر کے زندانی۔ ان کے راکھ اور خاک ہوجانے والے بدن' ان کی بکھری ہوئی ہڈیاں۔ بہادر شاہ ظفر' سبھاش چندر بوس' دادا صاحب اور ان کے ساتھ لام پر جانے والوں کی' رنگون اور رام اللہ میں مارے جانے والوں کی ہڈیاں اور سات کروڑ جو دوسری جنگ عظیم میں مارے گئے ساری دنیا میں ان کی بکھری ہوئی ہڈیاں' چنگیز اور ہلاکو کے اٹھائے ہوئے سروں کے مینار اور ان سے پہلے مارے جانے والے سب ہی تقدیر کے زندانی۔

دادی بیگم نے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیریں ...... بیلا بھی بویا ...... چنبیلی بھی بوئی۔ میں نے بوئے ہزاروں پھول ...... وہ سسکنے لگا' نہیں دادی بیگم ہم سب نے ہڈیاں بوئیں ...... ہم سب تقدیر کے زندانی ...... اللہ اور مولا' آہورمزدا اور لارڈ بدھا اور جیزز کرائسٹ سب نے انسانوں کو بھلا دیا' تقدیر کے تیر سے پناہ کہیں نہیں' تقدیر کا تیر ہر سینے کو چھلنی کرتا ہوا۔ سب تقدیر کے زندانی۔

❖❖❖

ہوا پھر سے حکم صادر

گرمی عروج پر تھی' درودیوار سے لو کے تھپیڑے ٹکراتے تھے اور جان دار سائے کی تلاش میں پھرتے تھے۔ اس دوپہر ''انڈیا ہاؤس'' پر ترنگے کی بجائے سوئٹزرلینڈ کا سرخ صلیب والا جھنڈا لہراتا تھا جس کا سایہ بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ قہروبلا کے مارے ہوئے بنگالیوں کے لیے تھا' یہ بنگلہ دیش میں سسکتے ہوئے بہاریوں کے لیے تھا۔ یہ سایہ ویت نام سے کمبوڈیا اور کانگو سے بیروت تک پھیلا ہوا تھا۔ کراچی میں یہ ''انڈیا ہاؤس'' پر لہراتا تھا' ہندوستان اور پاکستان کے سفارتی تعلقات منقطع تھے اور سرخ صلیب دونوں کے درمیان پل کا کام کرتی تھی۔

نادرہ نے اس قطار کو دیکھا جس میں دم توڑتے ہوئے باپ کو آخری نظر دیکھنے کی آرزو میں تڑپتی ہوئی بیٹیاں تھیں۔ اپنے قبرستانوں میں جانے اور اپنی مٹی سے دودھ بخشوانے کے طلبگار بوڑھے تھے۔ امریکا' دبئی یا انگلینڈ سے ہوکر آنے والے خط میں ماں کے ختم ہونے کی خبر کا تابوت اٹھائے ہوئے بیٹے تھے۔ وہ خود بھی اسی قطار میں تھی۔ اس کے ہاتھوں میں پاسپورٹ کے ساتھ ایک خط تھا۔ جو دلی سے لندن اور وہاں سے کراچی پہنچا تھا۔ کانوں میں گزشتہ رات واشنگٹن سے آنے والی آواز گونجتی تھی۔ ندرت نے کہا تھا۔ ''ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے بڑے بھیا بابا کو دلی سے گھر لے جارہے ہیں۔ میں کل صبح وہاں کے لیے روانہ ہورہی ہوں۔ تم بھی خدارا جلد پہنچو۔''

ندرت کا یہ جملہ سن کر نادرہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ وہ اس سے یہ کس طرح

کہتی کہ میری جان، تم میرا خون ہو اور تم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ میری اور تمہاری شہریتیں الگ ہیں۔ ہم دونوں کا خمیر ایک مٹی سے اٹھا ہے لیکن ہم دو علیحدہ کروں پر رہتے ہیں۔ تم بابا جان کے پاس چھ ہزار میل کا سفر کر کے دو دن میں پہنچ جاؤ گی اور میں چند سو میل کی دوری پر ہونے کے باوجود جانے کب پہنچوں۔ میرے راستے میں میرے اپنے فیصلے کی اور جنگ کی چھل پائی بیٹھی ہے۔ میرے لیے میرا آبائی شہر مریخ سے بھی پرے ہے، کہکشاؤں سے بھی دور ہے۔

قطار سست رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ بہت دیر بعد جب نادرہ کی باری آئی تو اسے انڈین ویزا فارم دیا گیا جسے پُر کر کے دوسرے دن جمع کرا دینا تھا۔ باہر ٹہلتے ہوئے ایجنٹوں میں سے ایک نے اس کے ویزا فارم پر چھپا ہوا نمبر دیکھ کر بتایا تھا کہ ابھی تو ان لوگوں کو بھی ویزا نہیں ملا جن کے فارم کا نمبر 26000 سے شروع ہوتا ہے جبکہ اس کے فارم پر 31713 تحریر تھا۔ اسی ایجنٹ نے نادرہ سے کہا کہ اس کا ویزا سات یا آٹھ مہینے بعد لگے گا۔ واپس لوٹتے ہوئے اس کا جی چاہا کہ ویزا فارم کے پرزے اڑا دے۔

وہ جس ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں ڈائریکٹر تھی وہاں واپس پہنچی تو علی حسن تالپور اپنے کسی کام سے آئے ہوئے تھے اور اس کے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ سندھ کے مشہور زمیندار تھے اور قالینوں کے بہت بڑے ایکسپورٹر، ہر وقت سفر میں رہتے تھے۔ دنیا ان کا رمنا تھی، دنیا تمام دولت مندوں کا رمنا تھی۔

نادرہ کا چہرہ دیکھ کر پہلے تو انہوں نے اس سے وحشت کا سبب پوچھا۔ باپ کی حالت جان کر افسوس کا اظہار کیا اور بتایا کہ اس جنگ زدہ صورتحال میں بھی پاکستان سے ہندوستان جانے کے کئی راستے ہیں۔ وہ اسی وقت نادرہ کو خمیسانی ٹریولز لے گئے اور دس منٹ میں اس کے ہاتھ میں دو دن بعد کا ایر یلون کا ٹکٹ تھا۔

تالپور صاحب نے اسے بتایا تھا کہ کولمبو میں انڈین ہائی کمیشن سے اسے تیسرے دن ویزا مل جائے گا۔ نادرہ کو ان کی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا لیکن وہ یہ ضرور جانتی تھی

کہ تالپور صاحب الہ دین کا چراغ رکھتے ہیں جس کے گھستے ہی ان کا اور ان کے دوستوں کا ہر کام ہو جاتا ہے۔ سنگاپور ٗ ہانگ کانگ ٗ کولمبو اور بمبئی میں سندھی بزنس کمیونٹی سے ان کی ہر وقت کی یاد اللہ تھی۔ بتانے لگے کہ پچھلے دنوں وہ خود بھی کولمبو سے انڈین ویزا لے کر بمبئی اور اجمیر ہو آئے ہیں۔

’’بہن تم غم مت کرو۔ میں تمہیں کل ہی کمانڈر کشن چند گائیر ولا کے نام انٹروڈکشن لیٹر بھیج دوں گا۔ وہ وہاں کے ہائی کمیشن میں ڈیفنس اتاشی ہے۔‘‘

نادرہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ان کا شکریہ کس طرح ادا کرے۔ اس نے انہیں یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ کولمبو سے بمبئی جانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ منجھلے ابا کے بیٹے کمانڈر آفتاب کے گھر ٹھہرے گی جو کولمبو کے پاکستانی سفارتخانے میں ڈیفنس اتاشی ہے۔

☆☆☆

اس رات وحشتِ دل عروج پر تھی۔

اسے گزرے ہوئے وہ دن یاد آ رہے تھے جب اس کے ایک فیصلے نے زندگی کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ وہ سال بھر کے لیے دلی سے آکسفورڈ گئی تھی جہاں اس کی ملاقات عمران سے ہوئی اور یہ ملاقات ستم ہوگئی۔ وہ عمران کے سحر میں یوں گرفتار ہوئی کہ جب اس نے شادی کی خواہش ظاہر کی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے آسمان کے تمام ستارے اس کے آنچل میں اتر آئے ہیں اور اس نے کچھ سوچے بغیر ہاں کر دی۔ ان دنوں وہ کہکشاؤں پر قدم رکھتی تھی اور ساری دنیا اس کی ٹھوکر میں تھی۔

وہ آکسفورڈ سے واپس گھر گئی تو اس نے ندرت کو ٗ بڑی بھابھی کو عمران کی تصویریں دکھائیں۔ یہ بتایا کہ دونوں نے زندگی بھر ساتھ رہنے کا وعدہ کیا ہے۔ بابا جان جب اجازت دیں گے تو وہ اپنی ماں اور بہن کو لے کر آ جائے گا۔ باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ مختصر سا گھرانا ہے۔

’’بیٹا اس شادی کے بعد یہ گھر اور ہم لوگ تم سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائیں

گے۔'' بڑی بھابھی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''کیسی بات کرتی ہیں آپ بھی۔ میں سال میں دو پھیرے لگاؤں گی۔'' نادرہ نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں۔''اور یہ ندرت بھی تو بیاہ کر امریکا چلی جائے گی۔'' ندرت کا رشتہ ایک قریبی عزیز طاہر سے طے تھا جو نیویارک میں رہتا تھا' اس نے انہیں یاد دلایا۔

''امریکا اور پاکستان کا مقابلہ نہ کرو۔'' بڑی بھابھی کا لہجہ تیکھا تھا۔

''کیوں نہ کروں؟ امریکا ہزاروں میل دور ہے اور پاکستان تو پہلے ہندوستان کا حصہ تھا۔ اب بھی دلی سے فاصلہ ہی کتنا ہے۔'' نادرہ نے کہا۔

''تمہیں شاید یاد نہیں کہ 65ء میں دونوں ملکوں کے بیچ لڑائی ہوئی تو یہاں سے بیاہ کر جانے والیاں اپنے گھر والوں کے خط کو بھی ترس گئی تھیں۔'' بڑی بھابھی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور اپنی آنکھوں میں آنے والے آنسو ساری کے پلو سے خشک کرتی ہوئی اٹھ گئی تھیں۔

بات بابا جان تک پہنچی تو وہ تڑپ کر رہ گئے۔ وہ ان کی لاڈلی تھی' ماں کی جان لے کر دنیا میں آئی تھی' بڑی ہوگئی تھی تب بھی ان کے سینے پر سر رکھ کر سوتی تھی۔ اس کی کوئی بات انہوں نے کبھی نہیں ٹالی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ نادرہ کھیلنے کے لیے انگارے مانگ رہی ہے۔ انہوں نے اس سے بات کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اس کی سرخوشی کا عالم کچھ ایسا تھا کہ انہوں نے اس کی خواہش کے سامنے سر جھکا دیا۔

تین لوگوں پر مشتمل برات کراچی سے آئی جسے ''اشوکا'' میں ٹھہرایا گیا اور وہیں نادرہ کی شادی کا ریسپشن ہوا۔ اور وہ جنہیں اس کی شادی کا کیسا ارمان تھا' دل مسوس کر رہ گئے۔ ان کا جگر خون ہوتا رہا لیکن پیشانی پر شکن تک نہ آئی اور انہوں نے اسے پورے اہتمام کے ساتھ رخصت کر دیا۔

وہ وداع ہو کر کراچی پہنچی تو اسے معلوم ہوا کہ عمران بینک میں ملازمت کرتا ہے اور کرائے کے گھر میں رہتا ہے جس کا تمام سامان نیا ہے۔ اسے آبائی مکان میں اور

قرول باغ کی کوٹھی میں ان مسہریوں' الماریوں اور آرام کرسیوں کی عادت تھی جن پر سے زمانہ گزرا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل کا اور جا نماز کی چوکی کا دادا' دادی سے اور بعض چیزوں کا پردادا اور پردادی سے رشتہ تھا۔ کتنی ہی چیزیں 1857ء سے بھی پہلے کی تھیں۔ چاندی کے برتن' چینی کا سامان' واقعی اینٹیک۔ 47ء میں قرول باغ لٹا تو اس وقت بھی ان کی کوٹھی محفوظ رہی تھی۔ کرنل گجندر سنگھ نے کوٹھی پر گارد بٹھا دی تھی۔ گجندر چاچا نے پٹنہ کالج میں دادا جان سے فارسی پڑھی تھی۔ وہ جب بھی نادرہ سے ملتے اسے نادر شاہ درانی کہہ کر اس کے کان کھینچتے۔ ''اوئے نادر شاہ بچپن بہاری! میں سنا تھا پڑھو فارسی' بیچو تیل۔ پر تمہارا گجندر چاچا تیل بیچنے کی بجائے لام پر چلا گیا۔'' پھر زور کا قہقہہ لگاتے۔

عمران اور اس کے گھر والوں کے بارے میں سوچنے کا موقع ذرا بعد میں آیا۔ وہ کراچی پہنچی تو گلی گلی جشن کا سماں تھا۔ سہروردی خاندان کی بیٹی ثروت کی شادی اردن کے ولی عہد شہزادہ حسن بن طلال سے ہو رہی تھی۔ ثروت اور حسن طلال کی ملاقات بھی انگلستان میں ہوئی تھی۔ پریوں کی کہانی کی طرح ثروت راتوں رات شہزادی بن گئی۔ ہر شخص اس جوڑے کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ ٹیلی ویژن پر جب ثروت کی برأت کے منظر نظر آئے تو نادرہ کو دلی کے اشوکا ہوٹل میں ہونے والی اپنی شادی یاد آنے لگی۔ سنگ سرخ سے بنا ہوا اشوکا' اس کی محرابیں' اس کے در' اس کی آرائش و زیبائش مغلوں کی یاد دلاتی تھی۔ بابا جان نے اس کی شادی پر روپیا پانی کی طرح بہایا تھا اور اسے سچ مچ بدیس بیاہ دیا تھا۔ ماہ و سال کی گپھاؤں میں گونجتی ہوئی مراثنوں کی آواز اس تک آئی...... ڈولی کا پردہ اٹھا کر جو دیکھا...... نہ بابل' نہ بابل کا دیس...... اس کے دل پر گھونسا لگا۔

کراچی آنے کے چند دنوں بعد ہی عمران کی والدہ اور بہن واپس امریکا چلی گئیں۔ نادرہ نے انہیں کچھ اور دنوں روکنے کی بات کی تو عمران کا موڈ خراب ہو گیا۔ اس کا اندازہ تو اسے کراچی آتے ہی ہو گیا تھا کہ عمران اور اس کی والدہ کے درمیان کوئی گرم جوشی' کسی طرح کی بے تکلفی نہیں تھی۔ وہ خود ایک ایسے گھر میں پلی بڑھی تھی جہاں

سب شیروشکر تھے۔ اسے تو حیرت اس بات پر ہوتی کہ بہن بھائی بھی ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے رہتے۔ ان دونوں کے جانے کے بعد عمران نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ لیکن ان کے جانے کے بعد اسے تنہائی کا احساس ہوا۔ عمران صبح کا گیا رات کو آتا۔ رشتہ دار کراچی میں نہیں رہتے تھے۔ چند دوست تھے اور بس۔ نادرہ کو گھر کاٹنے کو دوڑنے لگا اور پھر ایک روز وہ منہ اٹھا کر اس کالج کی پرنسپل سے ملنے چلی گئی جو اس کے گھر کے قریب تھا۔ یہ اس کی خوش نصیبی تھی کہ وہاں تاریخ کی لیکچرر ڈھونڈی جا رہی تھی۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کی ڈگری کی ان لوگوں کے لیے کوئی اہمیت نہ تھی لیکن آکسفورڈ کا معاملہ کچھ اور تھا۔ اسے فوراً ملازمت مل گئی لیکن جب کاغذی کارروائی شروع ہوئی تو آفس سپرنٹنڈنٹ کو حیرت ہوئی کہ شادی کے اتنے مہینوں بعد بھی اس نے پاکستانی شہریت کے لیے درخواست نہیں دی ہے۔

''تو عمران مجھے اپنی ہندوستانی شہریت ترک کرنی پڑے گی؟'' اس شام نادرہ نے عمران سے پوچھا۔

''ظاہر ہے تم دہری شہریت تو نہیں رکھ سکیں۔ یہ کام تو مجھے پہلے ہی کرالینا چاہیے تھا۔'' عمران یہ کہہ کر ٹیلی وژن کی طرف متوجہ ہوگیا جیسے یہ کوئی اہم بات ہی نہ ہو۔ نادرہ نے اسے حیرت سے دیکھا لیکن ان چند مہینوں میں ہی نادرہ کو اندازہ ہوگیا تھا کہ عمران کو اخبار، ٹیلی وژن اور اسکریبل کے علاوہ دوسری کسی چیز سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ دوستوں سے ملنے جاتا تو لڑکھڑاتا ہوا آتا۔ نادرہ نے آکسفورڈ یا لندن میں اسے ایک مرتبہ بھی پب جاتے نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ وہی عمران تھا جس پر وہ ہزار جان سے عاشق ہوئی تھی؟ سینے میں ایک پھانس کھٹکنے لگی تھی لیکن وہ کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی اور یوں بھی اس کے آس پاس تھا کون جس سے کچھ کہتی۔ عمران سے گفتگو اور تعلق کا سلسلہ کم ہوتا چلا گیا۔ لیکن ایسا کیوں تھا؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ عمران سے وہ کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن اسے اب عمران سے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

جس روز اس کی پاکستانی شہریت کا سرٹیفکٹ اس کے ہاتھ میں آیا تو اس کی عجیب

سی کیفیت تھی۔ وہ اس نے کالج میں جمع کرادیا اور پڑھاتی رہی لیکن یہاں تاریخ پڑھانا بھی کیسا عجیب مرحلہ تھا۔ یہ تاریخ محمد بن قاسم سے شروع ہوکر جنرل ایوب اور جنرل یحییٰ پر ختم ہوجاتی تھی۔ اس کو وحشت ہوتی' کالج میں ساتھ پڑھانے والیوں سے بھی گفتگو نہیں کی جاسکتی تھی۔

بی بی سی کی اردو اور ہندی سروس سے دہشت ناک خبریں آنے لگیں۔ الیکشن کا جو نتیجہ آیا تھا مغربی پاکستان کے لیڈر اسے ماننے کو تیار نہ تھا۔

''ہم ان بنگالیوں کو حکومت کیسے دے دیں؟'' ایک پروفیسر نے اسٹاف روم میں چیخ کر کہا۔

''لیکن ان بنگالیوں نے اگر پاکستان کے لیے ووٹ نہ دیے ہوتے تو بٹوارا نہیں ہوسکتا تھا'' نادرہ نے دھیمے لہجے میں انہیں یاد دلایا۔

''ہاں بھئی تم تو انڈین ہو یہی کہو گی۔ یہ ساری آگ لگائی ہوئی تمہارے انڈیا کی ہے۔'' پروفیسر نے اتنے تیکھے لہجے میں کہا کہ نادرہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔ وہ چورسی بن گئی اور اس لمحے اس نے طے کیا کہ وہ سیاست پر کوئی بات نہیں کرے گی اور یہ بھی کہ کوئی دوسری ملازمت تلاش کرے گی۔ تاریخ یہاں نہیں پڑھائی جاسکتی تھی۔

وہ ندرت کی شادی میں جانے کے لیے کیسی تڑپی تھی لیکن جانا ممکن نہیں تھا۔ اس کا پاسپورٹ پاکستانی تھا اور پاکستانیوں کو ہندوستان کا ویزا نہیں مل رہا تھا۔ اسے بڑی بھابھی کی بات یاد آگئی اور ان کی آنکھوں میں آنے والے آنسو بھی۔ ندرت کی رخصت کی رات وہ بلک بلک کر روئی۔ عمران لڑکھڑاتا ہوا گھر میں داخل ہوا اور اس نے آنسوؤں سے اس کا بھیگا ہوا چہرہ دیکھا تو بھڑک اٹھا۔ ''یہ تم کیا ہر وقت ٹسوے بہاتی رہتی ہو۔ میں ابھی مرتو نہیں گیا جو اس قدر ماتم ہے۔'' اس کے لہجے میں کیسی سفا کی تھی۔

نادرہ اس بات پر تڑپ اٹھی ''کیوں نحس باتیں کرتے ہو؟ تمہیں معلوم ہے میں کیوں رو رہی ہوں۔'' نادرہ کے اندر طیش ابلنے لگا۔

یہ کیسا کٹھور شخص تھا۔ اس کی سمجھ میں رشتے اور ان رشتوں سے محبتیں کیوں نہیں آتی تھیں۔؟

''میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ آئندہ تمہیں روتے ہوئے نہ دیکھوں۔ تم عورتیں یہ ناٹک خوب رچاتی ہو۔ میں آج مر جاؤں تو تم چھ مہینے بعد دوسری شادی رچالو گی'' اس کی آنکھوں میں اور لہجے میں نفرت تھی۔

نادرہ اپنا غم بھول کر سناٹے میں بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ ''تم ہوش وحواس میں تو ہو کیسی باتیں کر رہے ہو۔'' نادرہ نے تیز آواز میں کہا۔

''میں ہوش میں ہوں' میں نے اپنی ماں کو دیکھا ہے۔ میرا باپ ختم ہوا تو دھاڑیں مارتی رہی۔ سال بھر بعد دوسرے مرد سے شادی کر کے امریکا چلی گئی۔ میری بہن کو بھی ساتھ لے گئی۔ مجھے بورڈنگ ہاؤس میں ڈال گئی۔ پھر سے بیوہ ہوگی تو تیسری کر لے گی۔'' وہ دھاڑتا رہا اس کی زبان سے زہر بہہ رہا تھا۔ سرکتی جائے ہے رخ سے نقاب آہستہ آہستہ۔ نادرہ کا سارا بدن ٹھنڈا تھا اور وہ آنکھ بند کر کے دعا کر رہی تھی کہ اس خواب سے اس کی آنکھ کھل جائے۔ لیکن زندگی کے خواب سے آنکھ موت کے بعد ہی کھلتی ہے۔ اس نے کئی بار سوچا کہ عمران کی والدہ کو نیویارک فون کرے لیکن پھر خیال آیا کہ انہوں نے جانے کے بعد ایک بار بھی فون نہیں کیا تھا۔ نند نے پکچر پوسٹ کارڈ بھی نہیں بھیجا تھا۔ اسے ہمت ہی نہیں ہوئی کہ ان سے بات کرے۔ جانے وہ کیا کہہ دیں اور کون سی خوفناک بات اسے سننے کو ملے۔ اب بہتر یہی تھا کہ وہ کچھ اور نہ جانے۔

مارچ میں ملٹری ایکشن شروع ہوا تو اس کا دم لبوں پر آ گیا۔ وہ ہر وقت ریڈیو سے جڑی ہوئی بیٹھی رہتی۔ بی بی سی اردو سروس اور اس سے پہلے ہندی سروس۔

''تمہیں ہر وقت ہندی سروس سننے کی کیا ضرورت ہے؟۔'' عمران نے تلخ لہجے میں کہا۔ اس کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا۔

''ہر وقت تو سن ہی نہیں سکتی اور میں تو اردو سروس بھی سنتی ہوں۔'' نادرہ نے بے سبب کی اس بات پر اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"تو بی بی سی کی اردو سروس والے کون سے ہمارے دوست ہیں۔ ان کے دل میں بھی ہر وقت انڈیا کا درد رہتا ہے' 65ء میں انہوں نے لاہور فتح کروادیا تھا۔" عمران کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"لیکن عمران سوچو تو سہی وہاں قتل عام ہو رہا ہے۔ یونیورسٹی میں پروفیسر مارے گئے ہیں۔ سب کے نام آرہے ہیں۔" نادرہ کی آواز رندھ گئی۔ "ہمیں اس ظلم کے خلاف آواز تو اٹھانی چاہیے۔ کوئی احتجاج' کوئی جلوس۔" اس نے لندن میں کتنے ہی مظاہرے دیکھے تھے۔ 10 ڈاؤننگ اسٹریٹ کے سامنے ہاتھ میں احتجاجی کتبے اٹھائے آٹھ دس لوگ خاموش کھڑے ہیں اور اس خاموشی کے شور سے وزیر اعظم برطانیہ ہلکان ہیں اور پٹنہ' دلی' کلکتے میں نکلنے والے جلوسوں کی تو بات ہی الگ تھی۔ ہزار' دس ہزار اور پچاس ہزار لوگ مردہ باد' مردہ باد کرتے ہوئے سڑکوں سے گزر رہے ہیں۔

نادرہ کو اندازہ نہیں ہوا کہ عمران اسے کن نظروں سے دیکھ رہا ہے "تم کس کے خلاف مظاہرہ کرنا چاہتی ہو؟" عمران کی آواز کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔

"حکومت کے اور کس کے خلاف؟ شیخ مجیب کو حکومت کیوں نہیں بنانے دی جا رہی؟ ملٹری ایکشن کیوں ہو رہا ہے مشرقی پاکستان میں۔" نادرہ روانی میں بولتی چلی گئی۔

عمران نے وہسکی سے بھرا ہوا گلاس دیوار پر دے مارا اور دھاڑا "دماغ خراب ہوا ہے تمہارا؟ یہ کالے ٹھنگنے ہم پر حکومت کریں گے؟ ہم ان مردود بنگالیوں کے لیے احتجاج کریں گے؟ جلوس نکالیں گے؟ انہیں چن چن کر قتل کر دینا چاہیے۔ کتے' نمک حرام۔ کھاتے پاکستان کا اور گاتے ہندوستان کا ہیں"۔

نادرہ یوں بیٹھی رہی جیسے اس پر فالج گر گیا ہو۔ فرش پر کانچ کے ٹکڑے تھے یا اس کی ذات کے ذرے؟

"میں نے کسی عورت سے شادی کی ہے یا انڈین ایجنٹ سے" وہ پیر پٹختا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

نادرہ کو اپنے آپ پر ہنسی آئی۔ آل انڈیا ریڈیو اور ریڈیو سیلون سے فرمائشی گانے سننے والی قصباتی لڑکیوں میں اور خود اس میں بھلا کیا فرق تھا؟ اس نے جے این یو اور آکسفورڈ سے پڑھ کر بھاڑ جھونکا تھا۔ ان ہی کی طرح سیاں پر دم دیتی ہوئی۔ ندیا دھیرے بہو...... مورے سیاں جی اتریں گے پار...... گھونگھٹ کے پٹ کھول گوری تو ہے پیا ملیں گے آج...... سیاں اور پیا۔ مائی فٹ......

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ عمران کے دل میں بنگالیوں یا ہندوستان کے لیے زہر ہلاہل ہے۔ پھر اس نے ایک ہندوستانی لڑکی سے شادی کیوں کی تھی؟۔ یہ باتیں کبھی لندن اور آکسفورڈ میں تو نہیں ہوئی تھیں۔ پہروں اس نے سوچنے کی کوشش کی کہ ان دنوں جب وہ ایک دوسرے سے ملتے تھے تو انہوں نے کیا باتیں کی تھیں؟ بہت مشکل سے اسے یاد آیا کہ بولتی تو وہ رہتی تھی۔ کون سی کتابیں اور موسیقی کے مجموعے خریدیں گے، کن شہروں میں بسرام کریں گے۔ کون سی فلمیں دیکھیں گے...... عمران اس کی سنتا رہتا اور مسکراتا رہتا۔

اب وہ جس عمران کے ساتھ رہتی تھی۔ یہ لندن اور آکسفورڈ والا عمران نہیں تھا۔ سیاسی حالات خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔ مشرقی پاکستان میں پروفیسر، آرٹسٹ، ادیب اور شاعر چن چن کر مارے گئے۔ اسے وہی گھسا پٹا مصرعہ یاد آتا رہا۔ جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے...... قابل باڑھ ہے...... ہاں مشرقی پاکستان میں ابھی کچھ دنوں پہلے ایسی باڑھ آئی تھی کہ لاکھوں غارت ہوگئے لیکن ملک کے مغربی حصے سے کوئی ان کی مدد کو نہ پہنچا...... شکایتوں کے پہاڑ کھڑے ہوتے گئے۔ ایسے میں ان ناشکروں کے لیے گولیوں کی باڑھ ہی درست ہے...... یہ جنرل ٹکا خان کا فیصلہ تھا۔

اس کی جان پر بن آئی تھی وہ بابا جان کو یاد کرتی اور طعنے سنتی...... اگر اپنے باپ سے اتنا ہی عشق تھا تو ایک پاکستانی سے شادی کیوں کی تھی؟ عمران کا استہزائیہ لہجہ اسے چھلنی کر دیتا۔ وہ اسے یاد دلانے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی کہ شادی کی درخواست خود اس نے کی تھی، نادرہ کی خطا تو صرف اتنی تھی کہ اس نے وہ درخواست قبول کر لی تھی۔

دسمبر آیا۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان لڑائی شروع ہوئی اور زندگی تلخ سے تلخ تر ہوتی گئی۔ سرشام سے صبح صادق تک بلیک آؤٹ ہوتا۔ گھر کی تمام کھڑکیوں پر اس نے سیاہ کاغذ چپکا دیے تھے۔ ہوائی حملے کا سائرن بجتا اور عمران کے زہریلے جملے شروع ہوجاتے ''تم اپنے ہوائی جہازوں کو روشنی تو نہیں دکھا رہیں''۔ وہ سر پکڑ کر سوچتی کہ نفرت کیا اس انتہا تک بھی کی جاسکتی ہے؟ کالج میں بھی اس کے ساتھ پڑھانے والیوں کا کچھ عجیب سا رویہ تھا۔ یہ سوال اس کے سامنے اکثر آ کھڑا ہوتا کہ یہ لوگ سندھ کے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں رہنے والے ہندوؤں کے ساتھ کیا کرتے ہوں گے۔ اسے اپنے یہاں کے جنونی یاد آتے جن کا مسلمانوں کے ساتھ یہی رویہ تھا۔ دونوں ملکوں کے بہت سے لوگ مذہب اور مسلک الگ ہونے کے باوجود ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔

رمنا ریس کورس گراؤنڈ میں جنرل نیازی نے شکست کی دستاویز پر دستخط کرنے کے بعد جنرل جگجیت سنگھ اڑوڑا کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

سارے شہر میں اور سارے ملک میں ہُو کا عالم تھا۔ ہر فرد سوگوار تھا۔ گھروں میں چولہے ٹھنڈے پڑے تھے۔ نادرہ جانتی تھی کہ اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کے سر کس طرح جھکے ہوئے ہوں گے اور وہ کیسے طنز و طعنے سن رہے ہوں گے۔ ان میں سے بہت سوں کے لیے پاکستان ایک مضبوط لنگر تھا۔ آج وہ ٹوٹ گیا تھا تو ان پر کیا گزری ہوگی۔ دوقومی نظریے کی دھجیاں اڑ گئی تھیں۔ وہ ان کے لیے...... ڈھاکا اور مشرقی بنگال کے دوسرے شہروں میں اپنے رشتہ داروں کے لیے روتی رہی۔ وہ اپنے لیے اور اپنے گھر والوں کے لیے آنسو بہاتی رہی جو اس وقت اس کے لیے بے قرار ہوں گے لیکن کچھ نہیں کرسکتے تھے۔

نیویارک سے ندرت کا فون آیا' اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو تاریخ کے اس مذاق کا پرسہ دیتی رہیں' ندرت نے کچھ دیر پہلے بابا جان سے' بڑے بھیا سے بات کی تھی' وہ سب اس کے لیے پریشان تھے۔

آدھی رات کو عمران گھر آیا تو اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ اسے انڈین ایجنٹ اور بہاری کہتا رہا۔ پھر اس نے پہلی مرتبہ نادرہ پر ہاتھ اٹھایا۔ وہ اسے گالیاں دے رہا تھا۔ نادرہ بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہوگئی۔ اس کے اعصاب شل تھے۔ جو کچھ ہورہا تھا۔ وہ کسی اور کے ساتھ ہورہا تھا۔ عمران اس سے عشق کرتا تھا پھر وہ یہ سب کیسے کرسکتا تھا۔ یہ کوئی اور تھا۔

صبح ہوئی تب بھی اس نے خوف سے دروازہ نہیں کھولا' دس بجے کے قریب جب عمران کی گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تو اس نے باہر نکلنے کی ہمت کی۔

اس کے بعد کے دن ایسے تھے جیسے کوئی فلم فاسٹ فارورڈ میں چل رہی ہو۔ دو دن تک عمران نہ آیا اور وہ سولی پر ٹنگی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ پھر عمران کے دو دوست آئے۔ وہ اس کے کپڑے' جوتے اور روزمرہ استعمال کا سامان لینے آئے تھے۔ وہ لوگ ابھی گھر میں موجود تھے اور اس کی چیزیں اکٹھی کررہے تھے کہ عمران کا فون آیا ''میرا تمام ذاتی سامان ان لوگوں کو دے دو۔'' اس کا لہجہ سرد تھا۔ ''دو ہفتے بعد یہ لوگ آکر گھر کی چابی لے جائیں گے۔ اس دوران اپنا انتظام کرلو۔'' عمران نے اسے کچھ کہنے یا کچھ پوچھنے کی مہلت ہی نہ دی اور فون بند کردیا۔

گھنٹے بھر بعد فون کی گھنٹی بجی تو چند لمحوں تک وہ ٹیلی فون سیٹ کو دیکھتی رہی' عمران اب اسے کیوں فون کررہا تھا؟ گھنٹی بجتی چلی گئی' اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف عمران کی والدہ تھیں جو نیو یارک سے بول رہی تھیں۔ اسے ان کی آواز سن کر حیرانی ہوئی۔ کراچی سے جانے کے بعد یہ ان کا پہلا فون تھا۔ وہ بے تکاں بول رہی تھیں اور نادرہ کی آنکھوں کے سامنے سے پردے اٹھ رہے تھے۔

''مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ تم سے بات کرتی۔ لیکن چند گھنٹوں پہلے عمران کا فون آیا تھا۔ وہ تمہیں برا بھلا کہہ رہا تھا۔ مجھے گالیاں دے رہا تھا۔'' پھر وہ رونے لگیں۔

نادرہ کا دل ان کے لیے کٹنے لگا۔ اسے وہ پہلی نظر میں ہی اچھی لگی تھیں' شاندار' شفیق اور مہربان گھریلو خاتون۔ انہوں نے اگر دوسری شادی کرلی تھی تو گناہ تو نہیں کیا

تھا۔

''بیٹا تم ہی بتاؤ میں کیا کرتی' میں بی اے' ایم اے پاس نہیں تھی کہ کہیں کام کر لیتی۔ میں تنہا عورت' دو چھوٹے بچوں کا ساتھ۔ ہر طرف بھیڑیے گھومتے تھے۔ عمران کے والد کچھ چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔ گھر بھی ہمارا کرائے کا تھا۔ بذل الرحمان صاحب تمہارے انکل کے پرانے دوست تھے۔'' وہ کہہ رہی تھیں۔

''بذل الرحمان؟'' نادرہ کی ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈک کی لہر سی دوڑ گئی۔

''تم جانو بنگال میں تو ایسے ہی نام ہوتے ہیں۔ ان کی بیوی کا شادی کے فوراً بعد انتقال ہوگیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے شادی کے لیے کہا تو میں ٹالتی رہی لیکن جب میرے زیور بھی ختم ہونے لگے تو......''

''میں سب کچھ سمجھ گئی' آپ آگے کچھ نہ کہیں۔'' نادرہ نے اپنی سسکی ضبط کی۔ آنسو اس کا چہرہ بھگو رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ عمران کو بنگالیوں سے اتنی زہریلی نفرت کیوں تھی۔ وہ اتنا جاہل تھا کہ اس نے اپنی ماں کی مجبوری کو غداری فرض کیا تھا۔ نادرہ کی سمجھ میں سب کچھ آرہا تھا اور یہ بھی کہ آکسفورڈ کی تعلیم عمران کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی۔

''بذل الرحمان صاحب کو عمران سے بہت محبت تھی اور عارفہ سے بھی' لیکن عمران نے ان سے بدتمیزی کی حد کر دی۔ وہ مجھے گالیاں دیتا' برتن توڑتا۔ تنگ آ کر ہم نے اسے برن ہال میں داخل کرا دیا۔ ہم تینوں امریکا چلے گئے۔ بذلل صاحب نے عارفہ کا اور میرا جس طرح خیال رکھا ہے' تم سوچ نہیں سکتیں''۔ شاید نادرہ وہ پہلی فرد تھی جس کے سامنے انہیں دل کھول کر رکھ دینے کا موقع ملا تھا۔

''لیکن مجھ سے شادی کے وقت وہ آپ کو اور عارفہ کو کیوں ساتھ لایا تھا؟'' نادرہ نے پوچھا۔

''اس کے بغیر تمہارے باپ اس سے شادی کیسے کر دیتے؟ کون کسی اٹھائی گیرے کو اپنی بیٹی دیتا ہے اور وہ بھی جیسا تمہارا خاندان ہے۔ نادرہ بیٹی میں تم سے اتنی شرمندہ

ہوں۔ لیکن میں بالکل مجبور ہوں۔'' ان کی آواز میں گریے کا نم تھا۔

''آپ غم نہ کریں آنٹی۔ میں سب کچھ سمجھ گئی ہوں اور آپ کو شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''جب اس نے مجھے فون کر کے دلی چلنے کے لیے کہا تو میں خوش ہوگئی۔ اس نے بس یہ کہا تھا کہ میں اپنی دوسری شادی کا کوئی ذکر نہ کروں۔ میں سمجھی کہ وہ بدل گیا ہے۔ شادی ہو جائے گی تو بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن میرے نصیب۔''

وہ اپنے نصیبوں کو روتی رہیں اور نادرہ یہ سوچنے کی کوشش کرتی رہی کہ وہ اپنی داستان غم کس کو سنائے۔ عمران کے نزدیک ہر بنگالی بزدل الرحمان تھا اور ہر عورت غدار۔ سب سے بڑا بزدل اور غدار تو وہ تھا جو اپنی ماں کا جذباتی سہارا نہیں بن سکا تھا اور اس مرد کی عزت نہ کر سکا تھا جو اس کے گھرانے کے لیے سائبان ثابت ہوا تھا۔

نادرہ کو وہ وقت یاد آیا تو اس لمحے بھی اس کے بدن میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ چند دنوں کے اندر زندگی سر کے بل کھڑی ہوگئی تھی۔ کوئی دوست نہیں۔ کوئی رشتے دار نہیں۔ کرے تو کیا کرے...... جائے تو کہاں جائے۔ عمران کی والدہ نے اسے جو کچھ بتایا تھا' اس کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ عمران نفسیاتی مریض ہے۔ ماں کی دوسری شادی کے بعد وہ ہر عورت سے نفرت کرتا تھا۔ لیکن پھر اس نے خود شادی کیوں کی تھی؟ شاید اسے ایک انسانی پنچنگ بیگ کی ضرورت تھی جس پر اپنے اندر کا سارا غصہ' تمام زہر نکال سکے۔

وہ جب سوچتے سوچتے تھک گئی اور پندرہ دن کی مہلت میں سے ایک دن گزر گیا تو اس نے ندرت کو فون کیا۔ اب کچھ بھی چھپانا بے کار تھا۔ اسے سب کچھ بتا دینے کے بعد اس نے بہن سے یہ ضرور کہا کہ ابھی گھر میں کسی کو کچھ نہ بتائے۔ ندرت نے اسے دلاسے دیے۔ یہی کہا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا لیکن یہ نہیں بتایا کہ کیسے ٹھیک ہو جائے گا۔ دو دن تک ندرت کا فون نہ آیا تو نادرہ نے گھبرا کر اسے ایک بار پھر فون کیا۔ لیکن اب آنسرنگ مشین پر ندرت کی آواز یہ کہہ رہی تھی کہ وہ گھر پر نہیں ہے' اس کے لیے پیغام چھوڑ دیا جائے۔ یہ پیغام سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ ندرت سے

اس رویے کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ کراچی میں رات تھی نیویارک میں اس وقت دن نکل رہا ہوگا۔

اس رات نادرہ نے فیصلہ کیا کہ صبح اٹھ کر وہ سب سے پہلے بینک جائے گی اور معلوم کرے گی کہ اس کے اکاؤنٹ میں کتنے روپے ہیں۔ ان برسوں میں اس نے کبھی کوئی حساب نہیں رکھا تھا۔ بابا جان نے دو مرتبہ اسے انگلینڈ سے کسی جاننے والے کے ذریعے رقم بھجوائی تھی۔ وہ بھی محفوظ تھی۔ اب بینک اکاؤنٹ ہی اس کے کام آئے گا۔ اس نے شریک حیات کے انتخاب میں جو فاش غلطی کی تھی۔ اس کی قیمت اسے خود ہی ادا کرنی تھی۔ کسی سے شکایت کا اسے کوئی حق نہ تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گرتے رہے۔ تکیہ نم ہوتا رہا پھر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

آنکھ گھنٹی کی آواز سے کھلی اس نے ہڑ بڑا کر سرہانے رکھا ہوا فون اٹھایا تو اندازہ ہوا کہ کوئی گھر کی گھنٹی بجا رہا ہے۔

اس کا دل ڈوب گیا۔ کھڑکی سے باہر ملگجا سا اندھیرا تھا۔ اس وقت بھلا کون ہوسکتا ہے۔ کیا عمران واپس آ گیا؟ اس نے ڈرتے ڈرتے بالکنی میں جا کر جھانکا' گیٹ پر کوئی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ جانے کون تھا؟ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

گھنٹی ایک بار پھر بجی' اس مرتبہ کوئی اس کا نام بھی لے رہا تھا۔ اس نے ہمت کی اور آگے بڑھ کر پوچھا ''کون ہے؟''

''ارے آپا دروازہ کھولو'' یہ ندرت کی آواز تھی۔ نادرہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پیروں کے نیچے زمین ڈول رہی ہے۔ اسے یاد نہیں تھا کہ وہ کیسے دروازے تک پہنچی اور کب ندرت کے گلے میں بانہیں ڈال کر اپنے ہوش و حواس سے بے گانہ ہوگئی۔ ندرت کے ساتھ طاہر بھی آیا تھا اور پھر سب کچھ طاہر نے کیا۔ اس کے کئی رشتہ دار کراچی میں رہتے تھے' اس نے سب سے پہلے ایک رشتہ دار کے گھر کی انیکسی میں نادرہ' ندرت اور اپنے رہنے کا بندوبست کیا۔ نرسری مارکیٹ سے بنیادی ضرورت کا سامان خرید کر ڈالا گیا۔ نادرہ نے اپنے کپڑے سمیٹے' عمران کے گھر میں اس کا تو کچھ تھا ہی نہیں' گھر بند

کر کے چابی پڑوسیوں کے سپرد کی اور ان سے کہا عمران صاحب کے دوست آئیں تو انہیں دے دی جائے۔ کالج سے استعفیٰ اس نے ندرت کے آنے کے تیسرے دن ہی دے دیا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ یہاں تاریخ پڑھانے کا مطلب صرف جھوٹ بولنا ہے۔ طاہر چند دنوں میں چلا گیا۔ ندرت اس کے پاس دو ہفتے رہی۔ اس دوران ندرت نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ جتنا نادرہ نے بتادیا وہ سن لیا۔

''آپا تم اب ہندوستان واپس نہیں جاسکتیں، ابھی تو ویزا بھی نہیں مل سکتا۔ دونوں ملکوں میں سفارتی تعلقات ہی نہیں۔ اب تم یہاں کوئی بہتر ملازمت تلاش کرو اور کچھ دنوں بعد یہاں سے انگلینڈ، امریکا یا کینیڈا چلی جاؤ۔ لیکن وہاں جا کر بھی تمہارا مسئلہ فوراً حل نہیں ہوگا۔ وہاں کچھ دنوں کام کرو، پھر نیشنلٹی کے لیے درخواست دو۔ وہ ہو جائے گی تب ہی تمہارا پاسپورٹ بدلے گا۔ تب ہی تم گھر جاسکوں گی۔۔'' ندرت جو عمر میں اس سے چھوٹی تھی کیسی سمجھداری کی باتیں کرتی تھی، پھر وہ واپس چلی گئی۔

نادرہ کی مٹھی میں پشیمانی کی راکھ تھی۔ رام جی نے بن باس لیا تو سیتا ہار دی تھی۔ اس نے عشق کیا تو عمر بھر کا بن باس اس کا مقدر ہوا اور اس نے اپنے رشتے، اپنی دھرتی ہار دی۔

دل پر یادوں کا ایسا حملہ تھا کہ کسی پہلو قرار نہیں آ رہا تھا۔ اسے بابا جان بار بار یاد آ رہے تھے اس کی سمجھ میں جب کچھ نہ آیا تو اس نے بابا جان کے وہ نقشے نکالے جو وہ تبرک کے طور پر ساتھ لائی تھی۔

بابا جان کو تصوف اور فلکیات سے عشق تھا۔ ان کی زندگی ستاروں کی چال کے نقشے بناتے اور تصوف کے اعلیٰ مباحث پڑھتے اور ان پر گفتگو کرتے گزری تھی۔ ان کے بنائے ہوئے نقشے اس کے سامنے کھلے رہے، ان سے سنی ہوئی باتیں اسے اپنے حصار میں لیے رہیں۔ اس نے ان کی کھینچی ہوئی قوسوں اور لکیروں پر اپنی انگشت شہادت پھیری۔ شاید اس طرح وہ انہیں چھونا، انہیں محسوس کرنا چاہتی تھی۔ اسے یاد آیا، بابا جان کہتے تھے: مریخ جنگ وجدال اور کشت وخون کی خبر دیتا ہے، زحل کے اثرات نحس ہیں

اور زہرہ محبت اور امن کا ستارہ ہے۔

وہ قالین پر بابا کے بنائے ہوئے کرم خوردہ اور بوسیدہ نقشے پھیلائے بیٹھی رہی۔ اس نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے بارہ برجوں کے نشان دیکھے۔ یہ اسد ہے' یہ سنبلہ ہے' یہ میزان ہے۔ میزان عدل کا نشان ہے لیکن عدل کہاں تھا اور سرشاری کہاں تھی۔

باباجان کے کشیدہ خط اور قوسیں اس کی نگاہوں کے سامنے تھے اور وہ خود اس سے سینکڑوں میل کی دوری پر وجود اور عدم کی سرحد پر کھڑے تھے۔ غنودگی کی کہر میں لپٹا ہوا ان کا ذہن اس وقت کیا سوچتا ہوگا۔؟ کیا انہوں نے اپنی لاڈلی نادرہ کو معاف کردیا تھا؟ انہیں اس کی یاد کتنی ستاتی تھی؟ نادرہ نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ یہ آنسو' وہ ان کے قدموں میں بہانا چاہتی تھی لیکن ان کے اور اس کے درمیان نوری برسوں جیسے فاصلے تھے۔

☆☆☆
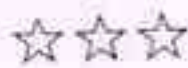
تیسرا دن طلوع ہورہا تھا جب اس نے ایئر سیلون کے طیارے میں کولمبو کا رخ کیا جہاں جانے کے لیے ویزا درکار نہ تھا' کسی خصوصی اجازت نامے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ یہی بڑی بات تھی کہ ان دنوں آفتاب اس شہر میں تھے جہاں سے ہندوستان کا ویزا تین دن میں ملتا تھا اور جہاں سے تمام راستے 'بمبئی' دلی' پٹنہ اور سہسرام کو جاتے تھے۔

نادرہ نے کھڑکی سے باہر دیکھا' سورج اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اور بادلوں سے اوپر پرواز کرتے ہوئے جہاز کی ہیبت ناک گرج محض ایک ہلکی سی سنسناہٹ بن کر پہنچ رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے جہاز تھرتھرایا۔ وہ سب موت سے کس قدر قریب تھے اور یوں بھی کون کس وقت موت سے قریب نہ تھا۔

کاک پٹ سے اعلان ہوا ہم بمبئی پر سے گزر رہے ہیں۔ نادرہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نیچے دیکھا لیکن اسے کچھ نظر نہ آیا۔ دھنکی ہوئی روئی جیسے بادلوں کے نیچے بمبئی آرام کررہا تھا۔ اس وقت وکٹوریہ ٹرمینس پر کیسی رونق اور کیسی چہل پہل ہوگی۔ ٹرینیں اسٹیشن میں داخل ہورہی ہوں گی۔ ٹرینیں روانہ ہورہی ہوں گی۔ ہاوڑہ ایکسپریس'

راجدھانی اور جنتا ایکسپریس۔ یہ ٹرینیں جو دلی جاتی تھیں اور جہاں سے سہسرام کو راستہ جاتا تھا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ بیسویں صدی تھی اور یہ اسی صدی کا کرم تھا کہ اس نے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کو گھر سے بے گھر کیا تھا۔ اپنے شہروں اور اپنے موسموں سے دور کیا تھا۔ نادرہ کی نگاہوں میں پراجیکٹ ہوپ' یو این ایچ سی آر اور دوسرے ایسے ہی بہت سے بین الاقوامی اداروں کے دل گداز اشتہار گھوم گئے۔ پراجیکٹ ہوپ کی پناہ میں آنے والے وہ مفلوج' معذور' بے بضاعت اور بے سہارا بچے' بوڑھے' جوان اور عورتیں جن کے لیے زمین سخت تھی اور آسمان دور۔ یونائیٹڈ نیشنز ہائی کمشنر فار ریفیوجیز کا ایمبلم اس کی نگاہوں کے سامنے جھلملایا' زیتون کی شاخ کے حصار میں دو توانا ہاتھ جو ایک انسان کو تحفظ دے رہے تھے۔ لیکن امان کہاں تھی اور جائے امان کہاں؟ اس کے برابر میں ایک گوانیز نن بیٹھی ہوئی تھی۔ بدن پر سرمئی رنگ کے موٹے سوتی کپڑے کا ٹخنوں کو چھوتا ہوا لبادہ' سر پر لبادے سے جڑی ہوئی ٹوپی اور گلے میں صلیب' اس کے ہاتھ میں نیوز ویک کا پرچا تھا جس کے کھلے ہوئے صفحے پر جلی حروف میں لکھا تھا: ''آج خاندان اپنی نسل یا عقیدے کی بناء پر اپنے گھروں کو ترک کرنے کے لیے مجبور کر دیے گئے ہیں' اگر وہ زندہ بچ جائیں تو انہیں تارکینِ وطن کہا جاتا ہے۔''

لیکن مجھے تو کسی نے گھر ترک کرنے پر مجبور نہیں کیا تھا' تارکِ وطن ہونا تو میرا اپنا انتخاب تھا۔

یہ بیسویں صدی تھی' مہذب دنیا کے عروج' ایجادات اور فتوحات کی صدی ''گھروں سے نکالے ہوئے'' اور ''تارکینِ وطن'' کی سیاسی اور سماجی اصطلاح اسی صدی میں ابھر کر سامنے آئی۔ انسان کو یہ صدی مبارک ہو۔ برابر کی نشست پر بیٹھی ہوئی نن سے اپنے آنسو چھپانے کے لیے وہ آگے کو جھکی' ایک آنسو کافی کی پیالی میں ٹپک گیا۔ چند لمحوں تک وہ اس اشک آلود کافی کو دیکھتی رہی پھر وہ اسے پی گئی۔

☆☆☆

وہ کولمبو میں نادرہ کا تیسرا دن تھا۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا تھا کہ پاکستان سے ''رفیوجیز'' کی بڑی تعداد ویزا کے لیے کولمبو پہنچنے لگی تھی اس لیے وہاں کے انڈین ہائی کمشنر شری گربچن سنگھ نے ان کی حوصلہ شکنی کے لیے ویزا دینے کی مدت تین دن سے بڑھا کر پندرہ دن کردی ہے۔ نادرہ نے کولمبو کی ایک پرانی اور سیلن زدہ عمارت کی تیسری منزل پر قطار میں لگے ہوئے بہت سے پاکستانیوں کو دیکھا۔ ان کے چہروں پر مایوسی اور تلخی تھی۔ اس نے انہیں دیکھا اور ایک بار پھر قطار میں لگ گئی۔ تالپور صاحب کا تعارفی خط اس کے ہاتھ میں رہا۔ کمانڈر کشن چند گائیروالا چھٹیوں پر تھے۔

دلی میں بڑے بھیا کے گھر فون کیا تو بڑی بھابھی سے بات ہوئی۔ بڑے بھیا بابا جان کو لے کر سہرام جا چکے تھے۔ بچوں کے امتحان ہو رہے تھے اس لیے وہ گھر میں بچوں کو لیے بیٹھی تھیں۔ انہوں نے نادرہ کی آواز سنی تو ان کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو چھ برس سے نہیں دیکھا تھا' نہ ایک دوسرے کی آواز سنی تھی۔

اور پھر نادرہ کو صبر آ گیا۔ وہ اپنی بساط بھر سب کچھ کر چکی تھی۔ بابا جان کو آخری نظر دیکھنے کے لیے' ان کے جھریوں بھرے ہاتھ کو تھام کر معافی مانگنے کی خواہش میں وہ یہاں تک چلی آئی تھی۔ اب کچھ بھی اس کے بس میں نہ تھا۔ اسے انتظار کرنا تھا' محض انتظار۔ شاید بابا جان اس وقت تک اس کا انتظار کرلیں۔

شاید کسی شب سہرام پر سے پرواز کرتے ہوئے صاحبِ خدمت' رجال الغیب چپکے سے انہیں پیغام دیتے ہوئے چلے جائیں کہ ابھی انہیں اور انتظار کرنا چاہیے' اپنے خون کی راہ چند دن اور دیکھنی چاہیے۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو پو پھٹ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اسے یہ گمان گزرا کہ وہ اپنے گھر میں ہے۔ ابھی دالان سے کوئی مانوس' کوئی آشنا آواز آئے گی اور اس سے

بستر چھوڑنے کو کہے گی لیکن پھر اسی لمحے اس کی نگاہیں چھت کی طرف اٹھیں اور نیچی سی سفید چھت کو دیکھ کر وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ ابھی گھر بہت دور تھا۔ ابھی آشنا چہرے اور مانوس آوازیں بہت فاصلے پر تھیں۔

اس نے کروٹ بدل کر سونا چاہا لیکن نیند نے جانے کس جنگل میں ڈیرے ڈال دیے تھے۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ چند منٹ بعد جب وہ تیار ہو کر اپنے کمرے سے باہر نکلی تو سارے گھر میں نیند کا سکوت اور استراحت کا عالم پھیلا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے' اسے خیال آیا کہ بہتر یہی ہے کہ باہر نکل جائے' گلیوں میں ٹہلے اور خیالوں کی یورش سے پناہ مانگے۔ وہ باہر نکلی' گریگریز روڈ سوئی ہوئی تھی۔ ہر طرف پھولوں کی' پتوں اور ہریالی کی خوشبو تھی' اور صبح کا جادو تھا۔ کچھ آشنا اور کچھ اجنبی پرندے ڈار ڈار چہک رہے تھے۔ صبح دم طائرانِ خوش الحان۔ پڑھتے ہیں کل ومن علیہا فان۔ ہر چیز فانی تھی' ہر رشتہ فانی تھا۔ بابا جان کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ ان کے بدن نے دواؤں سے کنارہ کر لیا تھا اور اب محض دعاؤں کا طالب تھا۔ صوفی منش' اشراقی اور فلاطونی بابا جان' عالمِ امثال میں آباد شہر جابلسا کا رخ کر رہے تھے۔ وہ مشرق سے آئے تھے اور مغرب کی طرف سفر کر رہے تھے۔ وہ مراتبِ تنزلات سے گزر چکے تھے' اب ان کے سینے میں پھڑ پھڑاتا ہوا پرندہ مراتبِ معارج کی طرف مائل ہونے کے لیے بے تاب تھا۔

وہ چلتی رہی اور بلند وبالا درخت اسے دیکھتے رہے۔ گھٹے ہوئے سروں اور کیسری چادروں والے بدھ بھکشو کھڑاویں بجاتے اور بعض ننگے پیر گزر رہے تھے۔ ناک پر ٹکے ہوئے چشمے' بغلوں میں دبی ہوئی کتابیں' ہاتھوں میں چھتریاں۔ یہ لوگ جانے گیان دھیان کے لیے جا رہے تھے یا گیان دھیان کے بعد لوٹ رہے تھے' ان لوگوں کو دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ چلتے ہوئے بھی اپنے آپ میں گم اور اپنے اندرون کے طلسم میں گرفتار ہوں۔

وہ وقت اور مسافت کے احساس سے آزاد چلتی رہی۔ سڑکوں پر چہل پہل شروع

ہوگئی تھی۔ سائیکلیں، بسیں، ٹیکسیاں، پیدل چلنے والے۔ سب ہی جانے کس طرف جا رہے تھے اور جانے کہاں سے آ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تو صرف بابا جان کا چہرہ تھا۔ اس کی شہریت نے ان کے اور نادرہ کے درمیان آگ اور خون کی وہ لکیر کھینچ دی تھی جسے عبور کرنا ہفت خواں طے کرنے کے برابر تھا۔ وہ چہرہ جسے اس نے برسوں سے نہیں دیکھا تھا، وہ چہرہ اب نہ جانے کس دنیا میں گم ہونے والا تھا۔

چلتے چلتے اس کے سامنے وہارا مہادیوی پارک آ گیا۔ وہ اس میں داخل ہوگئی۔ ہر طرف سکون تھا اور سبزہ تھا۔ پارک میں کچھ لوگ ٹہل رہے تھے۔ وہ ایک پیڑ کے سائے میں بیٹھ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ جب ثروت اور آفتاب جاگیں گے اور اسے کمرے میں نہ پائیں گے تو پریشان ہوں گے۔ لیکن اس سے بھلا کیا فرق پڑتا تھا۔ کسی بھی بات سے بھلا کیا فرق پڑتا تھا۔ بے بسی اور نارسائی کا اتنا شدید اور بے دست و پا کر دینے والا احساس اسے کبھی نہیں ہوا تھا۔ پیڑوں اور پودوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں کو دیکھ کر اس کی آنکھیں دھندلائیں اور پھر الم کے بپھرے ہوئے سیلاب نے صبر و ضبط کی تمام دیواریں گرادیں۔

وہ سر جھکائے گھاس کی پتیوں کو نوچتی رہی، جانے کتنے لمحے گزر گئے۔ پھر کسی نے اسے انگریزی میں مخاطب کیا۔ اس نے جل تھل آنکھیں اٹھا کر دیکھا، سامنے ایک سفید فام نوجوان کھڑا تھا، ملگجی قمیص، بدرنگ جینز، کینوس کے مٹیالے جوتے اور شانے پر نیلے رنگ کا ائیر بیگ۔

''کیا تم کسی مشکل میں ہو؟'' اس نے پوچھا۔ نادرہ کی آواز اس کے قابو میں نہ تھی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''میرے خیال میں تم سیلونی نہیں ہو؟'' اس نے نادرہ کو غور سے دیکھا، نادرہ سے کوئی جواب نہ پا کر وہ چند لمحوں تک اس کے سامنے کھڑا رہا، پھر اس نے اپنا ائیر بیگ سبزے پر رکھا اور آلتی پالتی مار کر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ نادرہ نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اس کی آنکھوں کو دیکھا جن میں اداسی تھی، ہمدردی تھی، لیکن تجسس کا شائبہ

نہ تھا۔ چند منٹ تک وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''تم اس شہر میں شاید اجنبی ہو۔ اگر تم راستہ بھول گئی ہو تو......''

''نہیں میں راستہ نہیں بھولی ہوں لیکن مجھے اپنے باپ کے پاس جانے کی اجازت نہیں۔'' نادرہ کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''یہ تو عجیب سی بات ہے۔'' اس کی آنکھوں میں پہلی مرتبہ حیرت ابھری۔ اس لمحے میں جانے کیا بات تھی یا شاید یوں تھا کہ نادرہ میں ضبط کا یارا نہیں رہا تھا۔ وہ کچھ سوچے سمجھے بغیر بولتی رہی' وہ سنتا رہا۔ پھر وہ خاموش ہوگئی' اب اس کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔

دھوپ کی چادر شبنمی سبزے پر بچھتی گئی اور وہ دو اجنبی انسان ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے رہے' جانے وہ کون تھا اور کہاں سے آیا تھا اور نہ جانے کیوں اس نے نادرہ کے عذاب کو اتنے احترام سے سنا تھا۔

''تمہیں اپنے گھر پلٹ جانا چاہیے' ورنہ تم جن لوگوں کے یہاں ٹھہری ہوئی ہو وہ پریشان ہو جائیں گے۔'' اس نے کہا اور کھڑا ہو گیا پھر جھک کر اپنا ائیر بیگ اٹھایا اور نہایت یقین سے نادرہ کو دیکھا۔ ان اجنبی آنکھوں میں اپنی کہی ہوئی بات پر اتنا یقین اور ایسا اعتبار تھا کہ نادرہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ یوں بھی اس کے پاس یہاں بیٹھے رہنے کا بھلا کیا جواز تھا؟۔ وہ کب تک یہاں بیٹھی رہ سکتی تھی؟ کتنے گھنٹے وہ آفتاب اور ثروت کے گھر سے دور رہ سکتی تھی؟ کب تلک؟

وہ دونوں دہارا مہادیوی پارک سے نکل آئے۔ اس نوجوان نے ایک گزرتی ہوئی ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ نادرہ سے آفتاب کا پتہ پوچھ کر ٹیکسی والے کو بتایا اور پھر خود بھی ساتھ بیٹھ گیا۔

پلک جھپکتے وہ گریگریز روڈ پر تھے' ٹیکسی آفتاب کے گھر کے سامنے رکی' باہر پورچ میں آفتاب کی مرسڈیز کھڑی تھی اور اس کا انجن چل رہا تھا۔ ڈرائیور پچھلی نشست کا دروازہ کھولے کھڑا تھا اور آفتاب گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔ ٹیکسی سے اسے اترتے دیکھ

کر آفتاب گاڑی سے باہر آ گئے اور اس کی طرف لپکے۔ ''حد کر دی تم نے' کہاں چلی گئی تھیں بغیر بتائے' میں اور ثروت اس قدر پریشان ہو رہے تھے۔ اب میں گاڑی لے کر نکل ہی رہا تھا۔'' پھر آفتاب کی نظر اس نوجوان پر پڑی جو ٹیکسی والے کو پیسے دے رہا تھا۔

''ان موصوف کی تعریف؟'' آفتاب نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے اس کا نام معلوم نہیں۔ میں وہارا مہادیوی پارک تک چلی گئی تھی' وہیں یہ مل گیا۔'' نادرہ اچانک شرمندہ ہوگئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ آفتاب کو ساری بات کس طرح سمجھائے۔ اتنی دیر میں وہ ٹیکسی والے کو رخصت کر چکا تھا۔

وہ آفتاب کی طرف بڑھا۔ ''میرا نام مائیکل والکاٹ ہے۔ یہ گھر کا راستہ بھول گئی تھیں۔ اس لیے میں ان کے ساتھ چلا آیا۔'' اس نوجوان نے جس کا نام نادرہ کو اسی لمحے معلوم ہوا تھا اسے ندامت سے بچانے کے لیے روانی سے غلط بیانی کی۔

یہ سنتے ہی آفتاب اس کے سامنے بچھ گئے پھر مائیکل کے انکار کے باوجود آفتاب اور ثروت اسے بہ اصرار اندر لے گئے۔ اس روز ان لوگوں نے صبح کا ناشتا دس بجے کیا۔ ناشتے کی میز پر مائیکل بھی ان کے ساتھ تھا۔ آفتاب اور مائیکل دونوں سری لنکا کے مختلف شہروں اور قصبوں کا ذکر کرتے رہے۔ نگمبو' کالوتارا' انورادھا پورا' سگریا' فلاں پہاڑ' فلاں دریا' فلاں جنگل' نامانوس نام نادرہ کے کانوں میں پڑتے رہے۔ اور وہ ناشتا کرنے کا سوانگ رچاتی رہی۔

ثروت کا موڈ خراب تھا' وہ مکھن' پنیر یا شہد بڑھاتے ہوئے' ٹوسٹر سے گرم ٹوسٹ نکالتے ہوئے نادرہ کو سناتی رہی ''گھومنے کا شوق ہوا تھا جناب کو' اور کہیں ادھر ادھر ہو جاتیں تو ساری آئی گئی ہمارے سر آتی۔'' وہ جانے کیا کیا کہتی رہی۔ اس کی آواز' اسکے جملے نادرہ کے کانوں تک آ رہے تھے لیکن وہ بابا جان کو سن رہی تھی۔ انہیں دیکھ رہی تھی' انہیں چھو رہی تھی۔ وہ اپنے پیاروں کی گرفت سے پھسل رہے تھے۔ وہ شمع ساں پگھل رہے تھے' بجھ رہے تھے اور اسے شمع کی آخری بھڑک دیکھنے سے بھی شاید محروم ہی

رہنا تھا۔

نادرہ نے کسی سے کوئی بات نہ کی۔ مائیکل جب آفتاب سے رخصت ہوا تو نادرہ نے اس کا شکریہ تک ادا نہ کیا۔ اس سے اخلاقاً بھی یہ نہیں کہا کہ کم ازکم ٹیکسی کا کرایہ تو مجھے ادا کرنے دو۔ اس لمحے وہ شاید تمام آداب بھول چکی تھی۔ آفتاب کے اور اس کے درمیان اس مسئلے پر گفتگو ہوئی لیکن وہ ایک نہ مانا' آخر میں آفتاب نے اس سے وعدہ لیا کہ ایک دو دن میں وہ پھر آئے گا۔

اس روز نادرہ نے انڈین ہائی کمیشن کے ویزا افسر کو فون بھی نہیں کیا' اس دن وہ اسٹیٹ بینک آف انڈیا بلڈنگ بھی نہیں گئی جس کی تیسری منزل پر انڈین ویزا آفس تھا اور اس کے کسی کمرے میں اس کے ویزا فارم کسی افسر کی نظرِ کرم کے منتظر تھے۔

آفتاب اور ثروت اسے بہلانے کے لیے مختلف جگہوں پر لیے پھر رہے تھے۔ اس رات جب تینوں ڈاکٹر اختر امام کے گھر گئے تو اختر چچا اس سے کتابوں' ادیبوں اور شاعروں کی باتیں کرتے رہے۔ نواب امداد امام اثر' سر علی امام اور حسن امام کے قصے' کاشف الحقائق کا تذکرہ' عزیزہ امام کا ذکر اور پھر جانے کس طرح منصور حلاج کی باتیں ہونے لگیں جس کے بارے میں ایک روایت یہ بھی تھی کہ وہ لنکا آیا تھا' ڈاکٹر اختر امام اسے جرمن اور فرانسیسی کتابوں کے حوالے دیتے رہے' ادق نام' ثقیل موضوعات۔ بابا جان کے پسندیدہ مصنفین اور ان کی لکھی ہوئی کتابیں' وہ سمجھ رہی تھی کہ اختر چچا اس کا دھیان بٹانا چاہتے ہیں۔ بابا جان سے ان کا یارانہ تھا' دونوں ہم نوالہ و ہم پیالہ رہے تھے لیکن اس رات انہوں نے بابا جان کے بارے میں نادرہ سے ایک لفظ نہیں پوچھا' ان سے متعلق کوئی قصہ نہیں سنایا۔ وہ معاملے کو اور وقت کی رائیگانی کو سمجھتے تھے۔

وہ تینوں اختر چچا کے گھر سے نکلے' اندھیری رات میں مینہ اس طرح برس رہا تھا کہ کار کی طاقتور ہیڈ لائٹوں میں بھی چند گز سے آگے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ تاریکی میں تاریکی برس رہی تھی۔ پانی کی آواز ہر آواز پر غالب تھی۔ پانی ازل سے تھا اور ازل میں خدا کی روح پانیوں میں جنبش کرتی تھی۔ وہی پانی اس وقت شور مچاتا ہوا پیڑ اور پودوں پر

اونچائیوں اور نیچائیوں پر' سوتے ہوئے گھروں اور بازاروں پر برس رہا تھا۔

وہ لوگ گھر پہنچے تو رات کے بارہ بج گئے تھے۔ ان تینوں کو نیند نہیں آ رہی تھی' تینوں لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ گھر کی اور گھر والوں کی باتیں کرتے رہے۔ قبرستانوں کا ذکر' گلیوں' بازاروں' پہاڑوں اور دریاؤں کا تذکرہ۔ ہار سنگھار' لیچی' ناریل' رمبوتان' فرنجی پان' اناناس اور آم کے پیڑوں پر بوندیں برس رہی تھیں اور جل ترنگ بج رہا تھا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی اور نادرہ کا دل بیٹھ گیا۔ آفتاب نے لپک کر ریسیور اٹھایا' چند لمحوں تک وہ دوسری طرف سے کی جانے والی بات سنتے رہے۔ پھر انہوں نے ریسور اس کی طرف بڑھایا اور اسے شانوں سے تھام لیا۔ دوسری طرف بڑی بھابھی تھیں۔

''بیٹا' کھیل ختم ہوگیا'' انہوں نے کہا۔

اس نے خشک آنکھوں سے آفتاب اور ثروت کو دیکھا جن کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

کھیل ختم ہوگیا تھا۔ وقت نے بابا جان کو اور اسے شہ مات دے دی تھی۔

☆☆☆

مینہ اب تک برس رہا تھا' باہر رات اپنا دامن سمیٹ رہی تھی' نادرہ نے بے تاب ہوکر اپنی پیشانی کھڑکی کے شیشے سے ٹکا دی۔ مینہ کے قطروں سے دھندلایا ہوا شیشہ ٹھنڈا تھا۔ بابا جان کا بدن بھی اسی طرح ٹھنڈا ہوگا۔ ان کے فراخ سینے میں چہکتا ہوا پرندہ پرواز کر گیا تھا۔ اس نے وحشت زدہ ہوکر کھڑکی کھول دی اور بابا جان کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن وہ بہت دور تھے۔ گھنی بھوؤں کے سائے میں مسکراتی ہوئی آنکھوں نے اسے دیکھا اور اس کی نارسائی پر مسکرادیں' جھریوں سے ڈھکے ہوئے دو ہاتھوں نے لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کے شانوں کو چھوا پھر وہ آنکھیں اور وہ ہاتھ دھند میں کھو گئے۔

کھجور کے پیڑوں سے گھری ہوئی' بیری اور نیم کی چھاؤں میں بچھی ہوئی قبرستان کی مٹی کل ان آنکھوں' ان ہاتھوں اور فراخ سینے کو اپنے اندر سمیٹ لے گی اور پھر وہ شخص جو بہت چوڑی مسہری اور بہت نرم و گداز بستر پر آرام کرتا تھا اور جس کے سفید

براق لباس پر کوئی دھبا، کوئی شکن نہ ہوتی تھی۔ کل وہی شخص تنگ لحد میں خاک کے بستر پر لیٹے گا، پھر اسے مٹی سے ڈھک دیا جائے گا۔ اور اس کی جنبشِ ابرو پر جان دینے والے اسے زمین میں رینگتے ہوئے کیڑوں کے سپرد کر آئیں گے۔

☆☆☆

دوسرے دن ثروت نے صبح سے ہی پاکستان ایمبسی، پی آئی اے اور دوسرے اداروں میں کام کرنے والے پاکستانیوں کے گھروں پر فون کرنا شروع کر دیا۔ سہ پہر کو بابا جان کے لیے قرآن خوانی کا انتظام ہونے لگا۔ ڈرائنگ روم سے صوفے ہٹائے گئے۔ آرائشی اشیاء، گوتم بدھ کے اور دیگر مجسمے دوسرے کمروں میں رکھے گئے۔ قالین بچھے، ان پر سفید چاندنیاں کھنچیں، مختلف پاکستانی گھروں سے قرآن اور تسبیحیں اکٹھی ہونے لگیں۔

شام ہوئی تو ثروت کا ڈرائنگ روم عورتوں اور لان مردوں سے بھر گیا۔ عورتیں سروں کو ساری کے پلو اور دوپٹے کے آنچل سے ڈھانپے ہوئے تھیں اور مرد رنگ برنگے رومال باندھے ہل ہل کر قرآن پڑھ رہے تھے۔ تسبیح کے دانے انگلیوں سے پھسل رہے تھے اور بابا جان کے عذاب کم ہو رہے تھے۔

کیا واقعی بابا جان کے عذاب کم ہو رہے تھے؟

نادرہ وحشت زدہ سارے گھر میں گھومتی رہی۔ کبھی اوپر، کبھی نیچے۔ ان سب لوگوں کو دیکھ کر اسے اختلاج ہو رہا تھا۔

''ذرا حوصلہ کرو، کم از کم یہ تو کرو کہ ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھ جاؤ۔ عورتوں کے ساتھ یوں بھی ہزار حیلے ہیں۔ بہت برا لگ رہا ہے۔ تمام عورتیں تمہیں پوچھ رہی ہیں۔'' ثروت نے نادرہ کو بچوں کے کمرے میں آ گھیرا۔

نادرہ خاموش رہی، اس لمحے اس میں بحث کی ہمت نہ تھی۔ اسے ثروت پر رشک آ رہا تھا۔ وہ عقیدے کے بلند و بالا محل میں محفوظ و مامون تھی، ہر بات کسی کی طرف سے تھی، ہر کام میں کسی کا اشارہ تھا۔ دوسری طرف وہ خود تھی کہ اس کے سینے میں تشکیک کی

دھول اڑتی تھی' منافقت سے بھلا کیا فائدہ۔ یوں بھی بابا جان کو ٹکے بندھے جملوں کے دہرائے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر خدا تھا' نکیرین تھے اور اگر جنت اور جہنم کا واقعی وجود تھا تو یقیناً بابا جان پل صراط سے محفوظ و مامون گزریں گے۔

☆☆☆

کولمبو میں وہ نادرہ کا ساتواں دن تھا۔

اسے اب ویزا کا انتظار نہیں تھا۔ گھر جانے کے لیے اب وقت کے تعین کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ان دنوں بابا جان سے وہ بس اتنی سی بات کہتی تھی کہ ''تیری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی''

آفتاب ایمبسی جا چکے تھے' ثروت بازار گئی ہوئی تھی۔ نادرہ وحشت اور بے قراری کے عالم میں ادھر سے ادھر پھرتی رہی' پھر آفتاب کی کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ اتنے میں ملازم نے اسے کسی کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ باہر آئی تو پورچ میں سیڑھیوں کے پاس مائیکل کھڑا ہوا تھا۔ ملگجی پتلون' ادھڑی ہوئی قمیص' کینوس کے بدرنگ جوتے' شانے پر وہی بڑا سا بیگ۔ جس میں اس قدر سامان بھرا ہوا تھا کہ سلائی کئی جگہ سے جواب دے چکی تھی۔

''تم ابھی تک یہاں ہو؟ میں تو یہاں سے گزرتے ہوئے تمہارے بارے میں پوچھنے بس یونہی چلا آیا تھا''۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ وہ تین سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں آ گیا۔ وہاں بید کی چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ ان ہی میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر تھکن تھی اور لباس پسینے سے تربتر تھا۔

نادرہ برآمدے کی منڈیر سے ٹک گئی۔ یہ مائیکل بھی عجیب خبطی تھا' جانے کولمبو میں کیا کر رہا تھا؟ وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

''تمہارے والد کیسے ہیں؟'' اس نے نادرہ کی خاموشی سے اکتا کر پوچھا۔

''انہوں نے میرا انتظار نہیں کیا''

''آئی ایم سوری۔ تمہیں کب معلوم ہوا؟''

''پرسوں رات۔ ٹرنک کال آئی تھی۔''

''تمہارا یہاں تک آنا تو پھر رائیگاں ہی گیا'' مائیکل کے لہجے میں اداسی تھی۔

''یہاں آنے پر ہی کیا منحصر ہے۔ میرے خیال میں تو پیدا ہونے کا مطلب ہی محض رائیگانی کا سفر ہے'' نادرہ کے لہجے میں تلخی تھی۔

مائیکل سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اچانک نادرہ کو احساس ہوا کہ وہ تھکا ہوا اور گرمی سے نڈھال ہے اور یہ بھی کہ وہ خود نہایت بداخلاق ہے۔ وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہوگئی۔ ''آؤ تھوڑی دیر اندر بیٹھتے ہیں' یہاں تو بہت حبس ہے'' وہ اسے ڈرائنگ روم کی خنک اور راحت بخش فضا میں لے گئی۔ وہ صوفے پر بیٹھنے کے بجائے قالین پر پیر پھیلا کر بیٹھ گیا۔ نادرہ بھی صوفے سے ٹیک لگا کر اس کے سامنے بیٹھ گئی اس کی نظر اس کے جوتوں پر پڑی جن کے تلوں میں کئی سوراخ تھے۔

نادرہ نے سیلونی ملازم کو آواز دے کر اس کے لیے ٹھنڈا پانی منگوایا۔ ملازم ایک ٹرے میں پانی کا جگ اور گلاس لے کر آیا تو اس نے اتنی بے تابی سے پانی پیا کہ وہ اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے بہہ کر اس کی قمیص پر گر گیا۔ پھر جگ سے انڈیل کر اس نے دوسرا گلاس پیا۔

''تم اپنے والد سے کب سے نہیں ملی تھیں؟''

''میں ان سے آخری مرتبہ چھ برس پہلے ملی تھی گویا وہ میرے لیے اب سے چھ برس پہلے ہی ختم ہو گئے تھے۔ حتمی نارسائی کا دوسرا نام موت ہی تو ہے۔ مجھے حیات بعد موت کا علم نہیں' نہ آواگون میری سمجھ میں آتا ہے۔ اس لیے اب جبکہ وہ ختم ہوگئے ہیں تو واقعی ختم ہوگئے ہیں۔ وہ نہ اس زندگی سے پہلے کہیں موجود تھے اور نہ اس کے بعد کہیں رہے ہیں۔''

''گویا تم مانتی ہو کہ زندگی کی حقیقت چراغ کی لو جیسی ہے۔ چراغ کی لو بجھ جائے تو نہ وہ زمین کی گہرائیوں میں کہیں چھپتی ہے نہ آسمان کی بلندیوں میں گم ہوتی ہے اور نہ مکان کی کسی بھی جہت میں قیام کرتی ہے۔ بس یوں ہے کہ چراغ میں تیل کے خاتمے

کے ساتھ ہی لو جلنا چھوڑ دیتی ہے۔'' مائیکل کے جملوں میں نادرہ کو کسی صوفی کے خیالات کی بازگشت محسوس ہوئی۔

جانے مغرب پر کیا افتاد نازل ہوئی ہے کہ اس کے نوجوان اپنی تمام ذہانتوں کے ساتھ دنیا میں بھٹکتے پھر رہے ہیں' نادرہ نے سوچا اور خیال کی اسی رو میں بہتے ہوئے میں اس سے باتیں کرتی رہی۔ پھر باتوں کا رخ ایشیا اور برصغیر کے منقسم خاندانوں' تقسیم شدہ رشتوں کی طرف مڑ گیا۔

''تم لوگ' ہم ایشیائیوں سے مختلف مسائل کا شکار ہو' جدید صنعتی عہد نے تمہارے لیے بہت سی الجھنیں پیدا کی ہیں۔ پھر بھی تمہارے عذاب ہم سے کم ہیں' ہم سراب کے پیچھے لپکے اور اب بے زمینی کے صحرا میں ہیں'' نادرہ کے لہجے میں تلخی تھی۔

''شاید تم نہیں جانتیں کہ عذاب کسے کہتے ہیں اور انسان' انسان پر اور کبھی کبھی خود اپنے آپ پر جہنم کے در کس طرح کھول دیتا ہے۔'' مائیکل کا لہجہ ٹھنڈا تھا پھر وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ''میں تمہیں دنیا کے بے شمار انسانوں کے بارے میں نہیں بتا سکتا۔ میں تمہیں اس لڑکی کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں جسے میں نے جی جان سے زیادہ چاہا اور اب اسے بھلانا چاہتا ہوں۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنا ایئر بیگ گھسیٹا' کھینچ تان کر اس کی زپ کھولی' اس میں سے کئی ملی دلی قمیصیں نکلیں' پھر سیاہ رنگ کی ایک نوٹ بک برآمد ہوئی۔ جسے اس نے نادرہ کے سامنے قالین پر رکھ دیا۔

'' کچھ دنوں پہلے میرا نام کینیڈا اور امریکا کے بڑے اخبارات میں چھپتا تھا۔ میں نے انسانوں کے بارے میں' ان کے دکھوں اور ان کے مسائل کے بارے میں بہت کچھ لکھا تھا۔ لیکن لکھنا اب مجھے ایک بے کار سی بات لگتی ہے۔ کیا لکھوں؟ کیوں لکھوں؟ زندگی ٹی وی کے کسی سیریل کی طرح ہے جو مسلسل چل رہا ہے۔ اس سیریل میں شارٹ بریک نہیں' اشتہار نہیں چلتے' اس میں وقفے کی کوئی گنجائش نہیں۔ زندگی میں صرف ماضی موجود ہے۔ حال جس کا اتنا چرچا ہے' وہ کہاں ہے ''حال'' تو انسان نے محض وقت کی دہشت کو کم کرنے کے لیے ایجاد کیا ہے۔ اور مستقبل؟'' اس کے لہجے میں کڑواہٹ

تھی۔ ''مستقبل...... زمین و آسمان کے درمیان کہاں رہتا ہے؟''

سیلونی ملازم کو ثروت نے اچھی طرح آداب میزبانی سکھائے تھے تب ہی وہ نادرہ کے کچھ کہے بغیر شربت لے آیا تھا۔ نادرہ نے ایک گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے دوسرا خود اٹھالیا۔ وہ شربت کا گھونٹ لے کر سانس لینے کو رکا'' میں بھی وقت کی دہشت میں مبتلا رہا ہوں لیکن اب دہشت نہیں ہوتی۔ بس ہوک سی اٹھتی ہے۔ کچھ چہرے آنکھوں کے سامنے تیرتے رہتے ہیں۔ جب بہت بے تاب ہو جاتا ہوں تو اس نوٹ بک کو کھول کر بیٹھ جاتا ہوں اور اپنی باتیں لکھنے لگتا ہوں' پہلے کی لکھی ہوئی باتیں پڑھنے لگتا ہوں۔ یہ نوٹ بک تم رکھو' کل پرسوں آ کر تم سے لے لوں گا۔'' اس نے شربت کا گلاس ختم کیا اور اٹھ کھڑا ہوا' نادرہ نے فرش سے اٹھتے ہوئے نوٹ بک اٹھالی۔

''تم کہاں ٹھہرے ہو؟''

''میں کہیں نہیں ٹھہرا اور ہر جگہ ٹھہرا ہوا ہوں۔ جب رات ہو جاتی ہے اور چلتے چلتے تھک جاتا ہوں تو کہیں بھی لیٹ کر سو جاتا ہوں۔'' وہ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر برآمدے میں نکل گیا۔

''لیکن مائیکل بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ چند دن پہلے تمام رات بارش ہوتی رہی تھی' تم اس رات کہاں تھے؟''

''وہ رات میں نے سلیوز آئی لینڈ میں ایک قصائی کی بند دکان کے چھجے کے نیچے گزاری تھی۔ یوں بھی بھلا بارش یا دھوپ میرا کیا بگاڑ لے گی۔ جب بھی ایسی کوئی افتاد پڑتی ہے میں مراقبے میں مصروف ہو جاتا ہوں پھر مجھے کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا۔''

''مراقبہ؟'' نادرہ نے اسے حیرت سے دیکھا ''یعنی تم مراقبہ کرتے ہو؟'' باہر کس قدر گرمی اور حبس تھا۔

''ہاں بھکشوؤں سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ بدھ نے کہا تھا کہ خواہشوں کا پورا جنگل کاٹ ڈالو' ایک پیڑ کاٹنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میرے لیے یہ کام وقت نے کیا۔ اس نے میرے اندر کی خواہشوں کا سارا ہرا بھرا جنگل کاٹ دیا۔ خودرو جھاڑیاں

بھی اکھاڑ پھینکیں۔ میں بودھ گیا جاؤں گا اور پھر کسی دن سنگھ میں شامل ہو جاؤں گا'' وہ ہنسا پھر چلا گیا۔ نادرہ پورچ میں کھڑی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ یہ مائیکل واقعی سنکی تھا' جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ اس نے اپنا سر جھٹکا اور اندر کی خنک فضا میں لوٹ گئی۔

ثروت ابھی نہیں آئی تھی۔ اس کے آنے تک اس نوٹ بک کو ہی پڑھ لیا جائے۔ اس کے صفحوں پر لکھے ہوئے لفظ اسے ایک اجنبی کا قصہ سنانے بیٹھے تھے۔

☆☆☆

ہر طرف اندھیرا ہے اور کمرے میں ائیر کنڈیشننگ ڈکٹس سے نکلنے والی خنک ہوا کی سرسراہٹ ہے۔ دیواروں پر' بستر پر' ہر طرف اندھیرا اچھا ہوا ہے۔ میں اندھیرے اور سناٹے کے ساتھ تنہا ہوں۔ مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ میں اپنا چہرہ ٹٹولتا ہوں۔ میری پیشانی اور آنکھیں پٹیوں سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ سرجن جولیس سمیوندے کی سبک انگلیوں نے کل ان پر اپنا ہنر دکھایا تھا لیکن اس کا نتیجہ آنے میں وقت لگے گا۔

ذہن میں بھنور بنتے ہیں۔ میں یہاں کیوں ہوں؟ مجھے یاد کیوں نہیں رہتا؟ میں ہنریتا کے خواب کی تلاش میں نکلا تھا...... مشین گن کا برسٹ' چوڑی سڑکوں پر گشت کرنے والے ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ' گلیوں اور بازاروں سے اٹھتی ہوئی خون اور گوشت کی سڑاند۔

ایسی بُو تو میں نے اپنے باپ کے باورچی خانے میں بھی نہ سونگھی تھی' وہاں ہر قسم کا گوشت کولڈ اسٹوریج میں رکھا جاتا تھا۔ وہ کتنا صاف ستھرا اور کیسا اجلا تھا۔ جب میں ایک مرتبہ وہاں گیا تو حیران رہ گیا تھا۔ سلوفین میں لپٹے ہوئے گوشت کے پارچے' ان پر چٹیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ ہم جانوروں کا گوشت زیادہ اہتمام اور احتیاط سے رکھتے ہیں لیکن اپنے جیسے انسانوں کا مردہ بدن رکھنے یا پھینکنے کا سلیقہ بھی ہمیں نہیں آتا۔

پھر وہی میں تھا کہ سانتیاگو کی گلیوں میں ہر لڑکی کی لاش کو غور سے دیکھتا پھرا تھا' پھر جب میں اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہار گیا تو میں نے سرکاری مردہ خانے کا رخ

کیا۔ وہ لاشوں سے پٹا ہوا تھا۔ آڑے ترچھے بدن' بے لباس' بے روح' کچلے ہوئے سر' کھلی اور ٹھہری ہوئی بے نور آنکھیں۔ بھنبھوڑے ہوئے سینے۔ خون سے لت پت نچلے دھڑ' اپنے ہی فوجیوں کا شکار ہونے والی لڑکیاں۔ اس روز میں نے دیوار کا سہارا لے کر کھایا پیا نہیں الٹا۔ میرا معدہ بھرا ہوا تھا لیکن روح خالی ہوگئی تھی۔ خالی روحوں والے قے نہیں کرتے۔

اس روز میں پہلی نظر میں تمہیں پہچان نہیں پایا اور پہچانتا بھی کیسے۔ میں نے تمہیں کبھی بے لباس نہیں دیکھا تھا۔ تم تک سفر کرتے ہوئے میں تو بس تمہارے ہونٹوں کی سرائے تک ہی پہنچا تھا۔ ان ہونٹوں سے خون کی ایک پتلی سی لکیر بہہ نکلی تھی۔ یہ صرف ایک دن پہلے کتنے نرم' کتنے شیریں اور کیسے جان لیوا تھے۔ میں تمہارے ہونٹوں کی کس حالت کو یاد کروں۔ اذیت کی شدت سے ٹھٹھرے ہوئے بے جان اور ٹھنڈے نیلے ہونٹ یا میرے بوسوں کی گرمی سے پگھلتے ہوئے' آگ لگاتے اور آگ بجھاتے ہوئے ہونٹ۔

میں جب بیروت میں زخمی ہوا اور ہوش میں آنے کے بعد جب مجھے اپنی آنکھیں جانے کا علم ہوا تو اس اذیت کے عالم میں مجھے پہلا خیال یہی آیا تھا کہ یہ آنکھیں اس لمحے سے پہلے کیوں نہ گئیں جب انہوں نے تمہیں آخری بار دیکھا تھا۔

اس لمحے اگر تم خود بھی اپنے آپ کو دیکھتیں تو نہ پہچانتیں' تمہاری پیشانی کے وسط میں ایک سیاہ داغ تھا۔ اور وہ بدن جس کے کنوار پن پر تمہیں ناز تھا وہ کہیں نہیں رہا تھا۔ میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اپنا کوٹ اتارا تھا' تمہارے بدن کو اس سے چھپا دیا تھا اور واپس ہوگیا تھا۔

اس کارپورل نے مجھے حیرت سے دیکھا جو میرے ساتھ تھا اور جس نے میرا پریس کارڈ اور اس کے نیچے تہہ کیے ہوئے سو ڈالر کے نوٹ کو دیکھ کر مجھے مردہ خانے میں داخل ہونے کی اجازت دی تھی۔ میں ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے باہر کی طرف چلا۔ دروازے پر پہنچ کر میں مڑا تو میں نے دیکھا کہ کارپورل نے وہ کوٹ اٹھالیا ہے اور تم

ایک بار پھر برہنہ ہو۔ میں نے اس فوجی کو دیکھا وہ آنے والے دنوں میں یقیناً بہادری کے کئی تمغے لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

تم نہ رہیں، تم جیسی بہت سی دوسری ہنرمندیاں نہیں رہیں۔ میں رہا۔ مجھ ایسے دوسرے بہت سے مائیکل نہ رہے۔ میں سانتیاگو میں کسی بدروح کی طرح چکراتا پھرا۔ میں نے اپنے اخبار کو ایک سطر نہ بھیجی۔ میں نے کسی شخص سے کلام نہیں کیا۔ اس رات میں سانتیاگو کی ایک سڑک پر کسی لاش کے برابر ڈھیر ہوا اور سو گیا۔

تیسرے دن وہ شخص بھی مر گیا جس سے تمہیں عشق تھا۔ جس پر چلی کے لوگ فدا تھے۔ پابلو نرودا مر گیا۔ وہ جو ہر سطر سبز روشنائی سے لکھتا تھا، سبز رنگ جو بہار کا، امید کا اور زندگی کا رنگ تھا۔

میں تم سے پہلی بار پابلو نرودا کے گھر پر ہی ملا تھا۔ وہی ہمارے عشق کا سبب بنا تھا۔ ساں کرسٹوبل کی پہاڑی پر وہ گھر جس میں ہم پہلی مرتبہ ملے تھے۔ وہ کشادہ ڈرائنگ روم جس کی ایک دیوار پر پکاسو کا ایک شاہکار آویزاں تھا اور دوسری دیوار میں بنے ہوئے طاقچوں میں قدیم انڈین سرامک کے نادر نمونے تھے، کتابیں تھیں۔ پابلو کی اپنی تحریر میں اس کی نظمیں تھیں، یادداشتیں اور خطوط تھے۔ ساں کرسٹوبل کی پہاڑی پر بنے ہوئے اس دلکش گھر کو مشرق و مغرب اور شمال و جنوب سے چلنے والی چاروں ہوائیں چھوتی تھیں اور اس چھت کے نیچے لافانی سطریں لکھی جاتی تھیں۔

اس شاندار گھر کو میری آنکھوں نے پھر اس حال میں دیکھا کہ دروازے فوجی بوٹوں کی ٹھوکروں اور رائفلوں کے کندوں سے توڑ دیے گئے تھے۔ کھڑکیوں کا کوئی شیشہ سلامت نہ تھا، وہ کینوس جس پر پکاسو نے رنگوں اور خطوط کی مدد سے ایک شاہکار بنایا تھا۔ اسے سنگین کی نوک سے چاک کر دیا گیا تھا۔ پابلو کی تحریریں اور اس کی کتابیں راکھ کا ڈھیر تھیں۔ وہ صوفہ جس پر میں نے تمہیں پابلو کے پہلو میں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا اسے ادھیڑ دیا گیا تھا۔ پھر انہوں نے اس گھر میں پانی چھوڑ دیا۔ پانی جو حیات کی اصل ہے اور جس میں پہلا ذی حیات خلیہ کلبلایا تھا۔ اسی حیات آفریں پانی سے زندہ چیزوں پر

موت مسلط کردی گئی تھی۔

پابلو کا جنازہ اٹھا۔ دنیا بھر کے اخبار نویسوں کا ایک ہجوم تھا۔ میں بھی اپنی دو ٹانگوں پر اپنے وجود کا تابوت اٹھائے جنازے کے جلوس میں تھا۔ شہر میں کرفیو تھا' اس کے باوجود میں نے تمہارے شہر کے ہزاروں لوگوں کو اکٹھے ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ عوام کے شاعر کی برات کس شان سے اٹھتی ہے۔ میں پابلو کے جنازے کے ساتھ چلتا رہا۔ پھر میں گر گیا۔ میری آنکھ اسپتال میں کھلی تھی۔

اس وقت بھی تم میری نگاہوں میں ہو۔ اس دو پہر کا ایک ایک لمحہ میرے ذہن پر نقش ہے جب میں پابلو سے اپنے اخبار کے لیے ایک خصوصی انٹرویو لینے کے لیے اس کے گھر گیا تھا۔ پابلو کی نظمیں میں نے اسپینش میں پڑھی تھیں۔ تقدیر کا تیر ہمیں کہاں اور کیسے شکار کرتا ہے ہم کچھ نہیں جانتے۔ اس دو پہر تقدیر نے مجھے شکار کیا۔ اس کی نظم ''دنیا میں پیدا ہونا'' میں نے بار بار پڑھی تھی لیکن اس دو پہر میں نے یہ نظم بہ آواز بلند لحن میں سنی۔ یہ آواز تمہاری تھی۔ لفظ زندہ ہو گئے تھے۔ فاختہ میرے ہاتھوں میں سانس لے رہی تھی۔ جنگل میرے وجود میں جھوم رہے تھے۔ اگست کا خوبصورت اور گرم مہینہ میری مٹھی میں تھا۔

تم اپنے لوگوں کے لیے اور دنیا کے تمام لوگوں کے لیے آزادئ اظہار کا حق مانگتی تھیں۔ تمہارا خیال تھا کہ فطرت نے انسان کو گویائی اس لیے دی ہے کہ وہ اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات کو الفاظ اور آواز کی مدد سے ظاہر کر سکے۔ انگلیاں اس لیے دی ہیں کہ وہ کاغذ پر اختلاف اور انقلاب کی آگ کاشت کر سکیں۔

تم حسین نہ تھیں لیکن تمہاری ذہانت' تمہارے بوہمین رویے اور تمہاری انسان پرستی نے تمہیں ان گنت حسیناؤں سے کہیں زیادہ حسین بنا دیا تھا۔ میں اس وقت بھی تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ پابلو کے فلیٹ میں ہنستے ہوئے' سانتیا گو کے سرکاری مردہ خانے میں سوتے ہوئے۔ میں تمہارے بدن کو اپنے کوٹ سے ڈھانپنے کے لیے جھکتا ہوں' تم آنکھیں کھول کر مجھے دیکھتی ہو لیکن ان آنکھوں میں پہچان کا بس ایک سایہ ہے۔ یوں

جیسے کوئی بہت دور سے کسی کو پہچاننے کی کوشش کرے۔ تمہاری سیاہ آنکھیں جاگتی ہیں، وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں، تمہارے لب ہلتے ہیں جو پابلو کی نظمیں سناتے نہیں تھکتے تھے، جو میرے ہونٹوں کو شہد کی اور شراب کی رسد تقسیم کرتے تھے۔ لیکن نہیں، یہ سب جھوٹ ہے، فریب ہے، ٹھٹھرے ہوئے لب کچھ نہیں کہتے، پتھرائی ہوئی آنکھیں کوئی خواب نہیں دیکھتیں۔

پابلو کا فلیٹ سراب ہے۔ تمہارے کانپتے ہوئے ہونٹ سراب ہیں، تمہاری ٹوٹتی ہوئی آواز فریب ہے۔ کوئی میری رگوں میں نیند انڈیل دے۔ میں آرام چاہتا ہوں، میں تمہیں دیکھنا نہیں چاہتا، میں سوچنا بھی نہیں چاہتا، سرجن سموندے تم صرف قرنیہ کیوں بدلتے ہو۔ اس قرنیے سے دیکھے جانے والے مناظر کو مٹا کیوں نہیں دیتے۔ دماغ کے خلیوں کو بھی کھرچ دو جن میں پہلے کی یادیں ہوں۔ وہ خواب ہوں جن میں زندگی کے تمام آدرش ابھی محفوظ ہوں، جن خوابوں کی پیشانی پر گولی کا سیاہ داغ نہ ہو، جنہیں ابھی کتوں نے بھنبھوڑا نہ ہو۔

نادرہ نے نوٹ بک بند کی۔ آنسو اس کے چہرے سے ٹپک رہے تھے۔ مائیکل والکاٹ اور ہنریتا کے لیے، بابا جان کے لیے، اپنے لیے، ان لوگوں کے لیے جو دنیا کے مختلف شہروں میں مارے گئے، مارے جا رہے تھے۔ وہ آنسو سب کے لیے تھے۔ بابا جان اس کے برابر آبیٹھے۔ انہوں نے اسے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ میری جان مارے جانے والوں کے ہجوم ہیں۔ گھروں سے کھدیڑ دیے جانے والوں کے غول ہیں۔ میں اپنے گھر کی چھت کے نیچے، اپنے پیاروں کی سسکیوں کی آواز سنتے ہوئے ختم ہوا۔ غم ان کا مناؤ جو بے گور و کفن رہے۔ جن کے سرہانے رونے والا کوئی نہ تھا۔ اس نے بابا جان سے لپٹنا چاہا اور وہ اس کو اپنے بازوؤں سے رہا کر کے چلے گئے۔ اس نے آنکھیں کھولیں، کھڑکیوں پر پردے کھنچے ہوئے تھے۔ کمرے میں ایئرکنڈیشنر کی ٹھنڈک تھی اور اس خنک فضا میں وہ اپنے اور دنیا کے غموں کے ساتھ تنہا تھی۔ لیکن کیسی عجیب بات تھی کہ بابا جان کا اصل پرسہ اسے ایک اجنبی کے لکھے ہوئے لفظوں نے دیا

تھا۔

اپنے غلط فیصلوں کے سبب بابا جان کی زندگی میں ان تک نہ پہنچ پانا اور پھر ان کی رخصت کیا کم قیامت تھی کہ مائیکل بھی اپنے غموں کا پشتارہ اس کے سپرد کر گیا تھا۔ بابا جان سے' گھر سے' اپنی زمین اور اپنے آسمان سے جدائی اس نے خود منتخب کی تھی۔ اسے ہنریتا پر رشک آیا۔ وہ نہیں رہی تھی لیکن مائیکل کو اس کے عشق سے رہائی نہیں ملی تھی' اور ایک وہ تھی جس نے عمران کے لیے سب کچھ تج دیا اور وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ یہ کیسا عشق تھا؟ تمام عمر ساتھ نباہنے کے یہ کیسے وعدے تھے؟ اس کی آنکھوں میں پچھتاوے کی ریت چبھتی رہی۔

☆☆☆

دو دن بعد مائیکل اپنی ڈائری واپس لینے آ گیا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا تمہیں کن الفاظ میں ہنریتا کا پرسہ دوں؟'' نادرہ نے اس کی ڈائری واپس کرتے ہوئے کہا۔

''کچھ مت کہو۔ ہم میں سے کون کس کو کس کا پرسہ دے گا۔ سب ہی پر بہت کچھ گزری ہے۔ ہم سب بے پایاں الم کے جال میں پھڑ پھڑاتے ہیں۔'' اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''میں ان دنوں یہ سوچتا رہا کہ اپنی ڈائری تمہیں کیوں دے آیا' شرمندہ ہوتا رہا۔''

''کیسی بات کرتے ہو۔ تمہارے الم نے مجھے اپنا غم برداشت کرنے کا حوصلہ دیا۔ موت سے کسے پناہ ہے۔ بابا جان کو جانا ہی تھا لیکن ہنریتا جس طرح گئی اسے جان کر میرا دل ٹکڑے ہوتا رہا۔ تم نے بہت اچھا کیا جو اسے میرے پاس چھوڑ گئے تھے۔''
دونوں برآمدے میں بیٹھے رہے اور شام کو پیڑوں' پودوں اور سبزے پر بچھتے ہوئے دیکھتے رہے۔

مائیکل اٹھنے ہی والا تھا کہ آفتاب ایمبیسی سے آ گئے۔ پھر ان چاروں نے چائے برآمدے میں پی' مائیکل نے آفتاب سے آہستگی سے کچھ کہا اور وہ دونوں اٹھ کر لان پر ٹہلنے لگے۔ مائیکل کچھ کہہ رہا تھا اور آفتاب توجہ سے اس کی بات سن رہے تھے۔

ثروت برآمدے میں بیٹھی ان دونوں کو دیکھتی رہی۔ ''کمال ہے ان دونوں میں تو ایسی گھٹنے لگی ہے جیسے نہ جانے کب کی دوستی ہو۔''

''چلو اچھا ہے۔ مائیکل شاید ابھی کچھ دن اور کولمبو میں رہے گا۔ ہوسکتا ہے کبھی تمہاری طرف آجائے۔ دکھیارا بالکل تنہا ہے۔ کروڑ پتی باپ کا اکلوتا بیٹا۔ لازم تو نہیں کہ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہونے والے سونے کے اس چمچے سے خوشیوں کا کیک بھی کھاسکیں۔'' نادرہ کو اس کی ڈائری یاد آرہی تھی۔

کچھ دیر بعد مائیکل رخصت ہوا تو نادرہ اداسی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ مائیکل والکاٹ سے اب اس کی کبھی ملاقات نہیں ہوگی۔

☆☆☆

پندرہویں دن شام کو آفتاب آئے تو اس کا پاسپورٹ اور ایئر سیلون سے بمبئی کے لیے اس کا کنفرم ٹکٹ ساتھ لائے۔ اس رات جب اس نے اپنے چند جوڑے سمیٹ کر سوٹ کیس میں رکھے تو سوچتی رہی کہ بمبئی سے دلی اور پھر وہاں سے گھر کا سفر کس طرح کرے گی جب سے اس نے دلی چھوڑی تھی وہ سفر میں تھی۔ اس بار سفر کا حکم موت نے دیا تھا۔ بابا جان کے جانے کے بعد گھر میں سناٹا رہتا ہوگا۔ یہ بے سبب نہیں خالی گھروں کے سناٹے...... مکان یاد کیا کرتے ہیں مکینوں کو۔ ڈیڑھ سو برس پرانا وہ گھر جس کی دیواروں پر جگہ جگہ کائی جمی ہوئی تھی جس کی درزوں سے گھاس اُگ آئی تھی۔ وہ در و دیوار کیا انہیں یاد کرتے ہوں گے؟ بابا جان کو انیس سے عشق تھا۔ کیسی پرسوز آواز میں اچانک گنگناتے لگتے ...... انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ...... چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے...... ہوا نے چراغ بجھا دیا تھا اور لو جانے کہاں چلی گئی تھی۔

☆☆☆

آفتاب اور ثروت دونوں ہی اسے چھوڑنے ایئر پورٹ آئے۔ وہ لوگ امیگریشن کاؤنٹر کی طرف بڑھ رہے تھے کہ نادرہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ مائیکل جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ اس سے زندگی میں اب کبھی ملاقات نہیں ہوگی' وہی اپنے شانے پر اپنا

بیگ لٹکائے تیز تیز قدموں سے ان کی طرف آ رہا تھا۔

''تم؟'' نادرہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''مجھے انڈیا تو جانا ہی تھا۔ میں نے سوچا کہ چند ہفتوں بعد جانے کی بجائے کیوں نہ تمہارے ساتھ ہی چلا چلوں۔'' اس نے آفتاب کی طرف دیکھا اور نادرہ کی سمجھ میں آ گیا کہ اس شام مائیکل سبزے پر ٹہلتے ہوئے آفتاب سے کیا کہہ رہا تھا۔ نادرہ جانتی تھی کہ آفتاب اس کے تنہا جانے پر فکرمند ہیں' شاید اسی لیے انہوں نے مائیکل کے ساتھ کو غنیمت جانا ہو لیکن اس کا نادرہ کو یقین تھا کہ یہ پیشکش مائیکل نے کی ہوگی۔

اس نے مائیکل یا آفتاب سے کچھ نہ پوچھا' ثروت اور آفتاب سے رخصت ہوئی تو آنکھوں میں آنسو تھے' ان دونوں نے جس طرح بابا جان کی ماتم داری اور اس کی دل داری کی تھی وہ یاد رہنے والی تھی۔

طیارہ بلند ہوا اور بحر ہند کے پانیوں سے گھرا ہوا وہ سرسبز جزیرہ دور ہونے لگا جس کے اور ہندوستان کے درمیان صرف تیس سمندری میلوں کا فاصلہ تھا۔ جہاں سے اس نے بابا جان تک پہنچنے کی کوشش کی تھی اور پہنچ نہیں پائی تھی۔ اس کی آنکھ بھر آئی۔ ایئر ہوسٹس نے اس کی خاطر کرنی چاہی لیکن اس نے معذرت کر لی' مائیکل نے بھی کچھ کھانے سے انکار کرتے ہوئے اس کے اور اپنے لیے کافی کی فرمائش کی۔

کافی آ گئی۔ وہ بے دلی سے کڑوی کافی کے گھونٹ بھرتی رہی۔ نادرہ کو یاد آیا کہ مائیکل نے پابلو نرودا کا اپنی ڈائری میں خاص طور سے ذکر کیا تھا۔

''تم نے اپنی ڈائری میں نرودا کا بہت ذکر کیا ہے۔''

''میرے اخبار نے 72ء کے نومبر میں اس پر اکسکلیو سو اسٹوری لکھنے کے لیے مجھے سان تیاگو بھیجا تھا' میری اسپینش اتنی اچھی تھی کہ مادری زبان والے مجھ پر رشک کرتے تھے۔ نرودا کو نوبیل انعام ملے ہوئے کچھ دن ہوئے تھے۔ یہ خبر بھی گشت کر رہی تھی کہ اسے کینسر ہو گیا ہے اور وہ جلد رخصت ہونے والا ہے۔ نوجوانوں نے اس کے گھر کو زیارت گاہ بنا لیا تھا۔'' مائیکل دھیمی آواز میں اسے بتاتا رہا۔ اور نادرہ نہ چاہتے

ہوئے بھی مائیکل کی باتوں میں ڈوب سی گئی۔

''جوش سے ہانپتی ہوئی لڑکیاں اور لڑکے صبح وشام اپنے سازوں کے ساتھ اس کے گھر آ جاتے' ڈرم' گٹار' جھانجھنیں اور جانے کون کون سے ساز۔ نرودا کے لکھے ہوئے لفظ ان کی آوازوں میں زندہ ہوجاتے۔ پراسرار جنگلوں کی گہری سانسیں' دریا میں لہروں کی ہم آغوشی کا وفور' تھرکتی ہوئی کشتیوں کا رقص' فاصلوں کو اپنے پروں سے سمیٹتے ہوئے پرندوں کے شہپروں کی گرمی' ماچو پیچو کی بلندیوں سے لپٹ کر آتی ہوئی ہوا' سب کچھ زندہ ہوجاتا۔ سب عالم وحشت میں رقص کرتے' ہنریتا بھی ان میں ہوتی۔ تمتماتے ہوئے رخسار' چہرے پر پسینے کی نمی' میں اسے دیکھتے ہوئے دیوانہ ہوجاتا۔

میں نرودا کی طویل نظم ''ماچو پیچو کی بلندیاں'' کے عشق میں گرفتار تھا اور ہنریتا بھی۔ ہم نے طے کیا تھا کہ شادی کریں گے تو ہنی مون منانے پیرو جائیں گے۔ انکا قبیلے کے اس شاندار قلعے کے آثار دیکھیں گے۔ اس کی بلندیوں پر کھڑے ہوکر دیکھیں گے کہ وادیوں سے آتی ہوئی ہوا چھ سو برس پرانی ان دیواروں سے کس طرح لپٹتی ہے اور قلعے کی بلندیوں سے پستیاں کیسی دکھائی دیتی ہیں۔'' وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہوگیا جیسے تھک گیا ہو۔ ''لیکن جنرل پنوشے نے ہمیں شادی اور ہنی مون کی مہلت ہی نہ دی۔''

''تمہاری بینائی کیا سیان تیاگو میں گئی تھی؟'' نادرہ نے پوچھا۔

''میں بیروت میں اپنے ایک لبنانی دوست طلحہ کریمی سے باتیں کرتے ہوئے چل رہا تھا۔ پھر اچانک سہ پہر کا سکوت مشین گنوں اور بزوکا کی دہشت ناک آواز سے ریزہ ریزہ ہوگیا۔ فدائین اور فلانجسٹوں میں ایک بار پھر ٹھن گئی تھی۔ ہم نے سنگتروں کے ایک ٹھیلے کی آڑ لینی چاہی لیکن ہمیں دیر ہوگئی تھی۔ بزوکا کے گولے نے طلحہ کا اسی لمحے کام تمام کیا میں دھماکے کی شدت سے اچھل کر دور جا گرا۔

''مجھے ہوش آیا تو میں بیروت کے امریکن اسپتال میں تھا اور دونوں آنکھوں کی بینائی جاچکی تھی۔ میری آنکھوں میں سری لنکا سے آنے والے قرنیوں کی گرافٹنگ سرجن سمونڈے نے کی جو اس میں بہت مہارت رکھتا ہے۔''

''میری مما کو خبر ہوئی تو وہ بیروت آئیں، مجھے سمجھاتی رہیں، کہ میں واپس ونکوور چلوں، ڈیڈ کے کاروبار کو دیکھوں، شادی کروں، بچے ہر زخم کا مرہم ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تم اپنے بچوں کو ہنستے دیکھو گے تو دنیا تمہیں پھر سے اچھی لگے گی۔ لیکن میری روح فگار ہے۔ میں شادی نہیں کرسکتا، اپنے بچے اس خوفناک دنیا میں چھوڑ کر جانے کے خیال سے ہی میری روح لرز جاتی ہے۔'' وہ بولتے بولتے خاموش ہوگیا۔

''لیکن مائیکل تم سری لنکا کیوں آئے؟'' نادرہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

''یہاں میں یہ جاننے کے لیے آیا کہ آخر یہاں سے ہر دوسرے چوتھے روز اتنے قرینے ساری دنیا کو بھیجے جاتے ہیں تو کیوں؟ بدھسٹ مرنے کے بعد دوسروں کے کام کیوں آنا چاہتے ہیں؟ ان ہی سوالوں نے مجھے مہاتما بدھ کی زندگی اور فلسفے کی طرف مائل کیا، یہاں میں نے خاصا وقت گزارا ہے اور اب بودھ گیا جاکر سنگھ میں شامل ہوجاؤں گا۔'' وہ خاموش ہوگیا۔

نادرہ نے گردن گھما کر اسے دیکھا اور حیران ہوتی رہی وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ تم اپنا سر گھٹوا کے، ابرو صاف کروا کے بودھ گیا کے مندر میں جا بیٹھو گے، سنگھ میں شامل ہوجاؤ گے۔ کیسری لبادہ پہن کر بدھم سرنم گچھامی کا جاپ کرتے ہوئے شاید ترائی کے جنگلوں میں دکھشنا مانگتے پھرو، تو کیا تمہیں ہنریتا کی یادوں سے نجات مل جائے گی؟ یادوں سے نجات نہ تپسیا اور تیاگ میں تھی اور نہ دنیا کے جھمیلوں میں۔

اس کے سینے میں درد کی لہر اٹھی۔ بابا جان کو بدھ مت سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ کبھی کبھی اسے حیرت ہوتی کہ وہ جو دو چار صدی پہلے کے فرد تھے ایک ایسی صدی میں کیوں پیدا ہوئے جس میں بیشتر انسانوں کے ذہن مشین سے ڈھل کر نکلتے ہیں۔ آٹو مین، روبوٹ۔ وہ جنگلوں میں پھرنے والوں اور گپھاؤں میں رہنے والوں کے اس قبیلے سے تھے جو وقت کی بھول بھلیاں میں پھرتا تھا۔ کبھی ستاروں کی چال میں کھوئے ہیں، کبھی رجال الغیب کا تذکرہ ہے جو نہ پہچانے جاتے ہیں اور نہ وصف ان کا بیان کیا جاسکتا ہے۔ کبھی کسی دوست سے ذکرِ ناسوتی اور ذکرِ ملکوتی میں گم ہیں۔ ان کے دوست

بھی ان ہی جیسے تھے۔ وہ گھر کی چھت پر کھلے آسمان کے نیچے براق بستر پر لیٹے ہیں اور ستاروں کو دیکھ رہے ہیں‘ ان کے پائینتی وہ آرام کرسی پر بیٹھی ہے اور تاروں کے روشن غبار میں انہیں تک رہی ہے۔ کبھی وہ فارسی یا اردو کی کوئی غزل گنگنا رہے ہیں اور ہر طرف ان کی گہری اور گمبھیر آواز کی گونج ہے۔

اس کا جی چاہا مائیکل سے پوچھے تم اس گمان میں کیسے ہو کہ تمہارے گیان دھیان کی آگ میں ہنریتا کی یادیں جل جائیں گی؟ تمہاری ماں کی محبتیں اور مہربانیاں خاکستر ہو جائیں گی؟ کچھ نہیں جلتا‘ سارے احساسات‘ تمام جذبات ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔ آخری سانس تک۔ بابا جان چلے گئے لیکن میں جب تک موجود ہوں وہ میرے ساتھ زندہ ہیں۔ مجھ سے باتیں کر رہے ہیں۔ آنکھیں بند کروں تو دکھائی دے رہے ہیں۔ نیند کی چادر اوڑھ لوں تو اس چادر میں سے ان کا چہرہ جھلکتا ہے۔ ہم جن سے محبت کرتے ہیں وہ ہماری یاد سے بس اسی وقت جاتے ہیں جب ہم خود چلے جائیں۔ اور اگر کسی کو ہم سے بھی ایسی ہی محبت ہو تو ہم اس کے لیے موجود رہتے ہیں۔ وجود اور عدم کا کھیل کسی چیستاں سے کم نہیں۔

اس کا جی چاہا مائیکل سے کہے کہ مانا تمہاری بینائی کسی بدھسٹ کی عطا ہے تو کیا لازم ہے کہ بودھ گیا میں تمہیں دل کا چین بھی مل سکے۔ بدھ نے کہا تھا پیدائش غم...... عمر غم...... موت غم...... ہر خواہش جو پوری نہ ہو سکے غم ہے۔

ان غموں سے کسے فرار ہے مائیکل جو تم بھاگ کر لنکا گئے اور اب ہندوستان جا رہے ہو۔ لیکن وہ خاموش رہی۔۔ طیارہ اڑتا چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

کیسی مسافرت تھی۔ کراچی سے کولمبو‘ بمبئی اور اب دلی جہاں سب اسے لینے آئے ہوئے تھے اور جس سے آخری ملاقات کے لیے وہ بے قرار تھی‘ وہی جا چکا تھا۔ اس نے آنسوؤں کو ضبط کرنا چاہا لیکن وہ امڈے چلے آ رہے تھے۔ مائیکل کا اس نے بڑے بھیا سے تعارف کرایا۔

''یہ بودھ گیا جائیں گے''

بڑے بھیا نے سر ہلایا۔ ''لیکن ابھی تو ہمارے یہاں ٹھہریں گے۔'' انہوں نے کہا اور مائیکل کے انکار کے باوجود اس کا بیگ نادرہ کے سوٹ کیس کے ساتھ ڈگی میں رکھ دیا گیا۔

''ارے پرشوتم یہ کدھر چلے تم؟'' نادرہ نے ڈرائیور کو ٹوکا۔

''تھانے جا رہے ہیں بٹیا'' پرشوتم نے موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔ ان چھ برسوں میں اس کے بالوں اور مونچھوں پر وقت کی بہت سی برف گر گئی تھی۔

''تھانے؟ کیوں خیریت؟'' نادرہ نے حیرت سے پوچھا۔

''تم شام کو پٹنہ جا رہی ہو پھر وقت نہیں ملے گا۔ اسی لیے میں نے پرشوتم سے کہا تھا کہ پہلے پولیس ہیڈ کوارٹر کی طرف چلے۔ پاکستانی پاسپورٹ والوں کو 24 گھنٹے کے اندر اپنے آنے کا اندراج کرانا پڑتا ہے۔'' بڑے بھیا کی آواز اس کا جگر چیر گئی۔

گاڑی پولیس ہیڈ کوارٹر کے سامنے رکی۔

''لاؤ اپنا پاسپورٹ مجھے دو'' بڑے بھیا نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

کسی نے دل میں برما چلایا۔ ''بھیا میں بھی ساتھ چلوں گی۔'' نادرہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر گئی۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے نادرہ'' بھیا نے اترتے ہوئے اسے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن اس نے دروازہ بند کر کے قدم بڑھایا۔ اسی دلی میں وہ دلہن بنی تھی۔ یہیں سے رخصت ہوئی تھی، غلطی کی سزا تو پوری سہنی چاہیے۔

آج بازار میں پا بجولاں چلو...... وہ بڑے بھیا کے ساتھ پولیس ہیڈ کوارٹر میں داخل ہوئی۔ سیڑھیاں، راہداریاں، تیکھی نظریں، راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو...... پاسپورٹ پر اس کے آنے کی تاریخ لکھی گئی، انٹری کی مہر لگی۔

کیسا عجیب عالم تھا، سینکڑوں برس سے یہاں رہنے والی کو تھانے میں اپنے آنے کے اندراج کی ضرورت تھی اور ونکوور سے آیا ہوا مائیکل گاڑی میں بیٹھا تھا......

عمران تم جہاں بھی رہو خوش رہو۔ تمہیں اپنی ماں سے نفرت تھی اس کا حساب تم نے مجھ سے لیا۔

بڑے بھیا چاہتے تھے کہ وہ ہوائی جہاز سے پٹنہ چلی جائے' وہاں سے کار اسے گھر لے جائے گی۔

''نہیں بڑے بھیا...... میں ریل سے پٹنہ جاؤں گی۔'' اس نے حتمی انداز میں کہا اور وہ خاموش ہو گئے۔ وہ ان سے کیسے کہتی کہ تمام منظر' شہر' بستیاں' کھیت' دریا' لوگ میں اپنی آنکھوں میں رکھ لینا چاہتی ہوں۔

وہ نظام الدین سے پٹنہ کے لیے روانہ ہوئی تو بڑی بھابھی ساتھ تھیں' مائیکل بھی موجود تھا۔ ''میں بنارس جا رہا ہوں'' اس نے اطلاع دی اور چلا گیا۔

دلی سے پٹنہ اور پھر کار سے گھر کا سفر...... سب کچھ ناقابل یقین تھا' ہر چیز اس کی تھی اور کوئی چیز اس کی نہ تھی...... وہ خواب کے سے عالم میں سفر کرتی رہی۔ گھر...... قبرستان...... وہ جو اس سفر میں بار بار روئی تھی بابا جان کی لحد پر جا کر اس کی آنکھ سے ایک آنسو نہ گرا۔ مٹی کا ڈھیر جسے اس نے' بڑی بھابھی نے اور دوسروں نے پھولوں سے ڈھک دیا۔ اس نے قبر پر ہاتھ رکھا تو بابا جان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے ان سے پوچھا...... اپنے عشاق سے کوئی کہیں یہ کرتا ہے؟ بابا جان مسکرائے۔ دنیا چھوڑ کر سب ہی جاتے ہیں' لیکن تم تو اپنا گھر چھوڑ کر چلی گئیں۔ وہ گم صم بیٹھی رہی۔ بڑی بھابھی نے اس کا ہاتھ تھام کر اٹھایا تو وہ کچھ کہے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی۔

کئی دن اسی طرح گزر گئے' رات کو بابا جان کے بستر پر لیٹ کر آسمان پر سانس لیتے ستاروں کو دیکھنا اور دن میں کئی گھنٹے قبرستان میں مٹی کے اس ڈھیر کے پاس بیٹھے رہنا۔

بڑے بھیا کا دلی سے فون آیا۔ ''نادرہ تم فوراً دلی پہنچو۔ تمہارا ویزا ختم ہونے میں صرف دو دن رہ گئے ہیں۔ بائی ایئر آؤ...... میں نے بمبئی اور پھر وہاں سے کراچی کے لیے تمہاری سیٹ کنفرم کرالی ہے۔''

اس کا دل ڈوب گیا۔ ''بڑے بھیا میرا ویزا بڑھوا دیجئے۔'' اس نے التجا کی۔

''نہیں بٹیا۔ یہ ممکن نہیں' ابھی تو دونوں ملکوں میں سفارتی تعلقات بھی نہیں۔ تم خوش نصیب ہو کہ یہاں آ سکیں۔ میں تمہارے کچھ کہے بغیر اپنی سی کوشش کر چکا ہوں۔'' ان کا لہجہ تھکا ہوا تھا۔

''نادرہ تم نے اپنے ہی نہیں' ہم سب کے ہاتھ کٹوا دیے اور وہ بھی کس بدبخت کے لیے۔'' بڑی بھابھی نے اتنے دنوں میں صرف ایک جملہ کہا' ورنہ اس سے تو کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ کچھ نہیں پوچھا تھا۔ وہ لوگ پوچھتے بھی کیا' عمران نے طلاق کے کاغذات کی کاپی بابا جان کے نام قرول باغ کے پتے پر بھیج دی تھی۔ وہ کاغذات سب سے پہلے ان ہی نے پڑھے تھے اور دل تھام کر بیٹھ گئے تھے۔

وہ واپس دلی پہنچی۔ مائیکل اس سے پہلے موجود تھا۔ ''میں تم سے الوداعی ملاقات کے لیے آیا ہوں' آج ہی بودھ گیا چلا جاؤں گا''

اس نے مائیکل کو دیکھا اور ہنریتا پر رشک کیا۔

ایئر پورٹ پر سب ہی اسے رخصت کرنے آئے تھے۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تھے' اس نے سر اٹھا کر کسی سے آنکھیں نہیں ملائیں۔ وہ ڈر رہی تھی' دل تو ایوبی ہوا آنکھیں ہوئیں یعقوبیاں والا عالم نہ ہو جائے۔ ایمگریشن کاؤنٹر پر اس کے پاسپورٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھا گیا' ایک نگاہِ غلط انداز اس پر ڈالی گئی پھر ایگزٹ کی مہر لگی۔ پاسپورٹ کے صفحے پر یا اس کے دل پر؟...... ہوا پھر سے حکم صادر...... کہ وطن بدر ہوں ہم تم...... رخصت کے کتنے ہی مرحلے تھے۔ وہ سارے بدن سے لرزتی رہی۔ آنسوؤں کو ضبط کرتی رہی۔ اس کی نگاہوں میں مائیکل کا چہرہ ابھرا' جو بودھ گیا چلا گیا تھا' اب وہاں رہے گا جو اس کا دیس نہیں تھا...... اور وہ جس کا خمیر اس مٹی سے اٹھا تھا' یہاں نہیں رہ سکتی تھی۔ پیدائش غم...... زندگی غم...... موت غم...... اور جو خواہش پوری نہ ہو سکے وہ غم ہے۔

روانگی کا اعلان ہو رہا تھا' قطار بن رہی تھی۔ وہ بھی قطار میں لگ گئی۔ سب بس

میں چڑھ رہے تھے' اس نے بھی دوسروں کی پیروی کی۔ جہاز کی سیڑھیاں طے کر کے وہ اندر پہنچی اور اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔ اب کوئی اس کے ساتھ نہیں تھا جو اس سے باتیں کرتا جائے۔ جہاز نے اڑان بھری' اس نے کھڑکی سے نیچے دیکھا' دل دار اور دل ستاں دلی نیچے بچھی ہوئی تھی' یہیں اشوکا ہوٹل میں اس کی شادی ہوئی تھی' خاندانی مراثنوں نے بابل گایا تھا۔ ڈولی کا پردہ اٹھا کر جو دیکھا...... نہ بابل...... نہ بابل کا دیس۔ بابل منوں مٹی تلے سوتا تھا اور دیس' بدیس ہو گیا تھا۔ دل پر دہری دھار کا خنجر چلا لیکن قرول باغ میں بابا جان کی کوٹھی تو اپنی جگہ تھی جسے 47ء میں گجندر چاچا نے لٹنے نہیں دیا تھا۔ جہاں اب بڑے بھیا رہتے تھے' اسی دلی میں جے این یو تھی جہاں سے اس نے پڑھا تھا' یہیں قدیم ہندوستان کی تاریخ اسے پروفیسر رومیلا تھاپر نے پڑھائی تھی جن کا ساری دنیا میں ڈنکا بجتا تھا۔ ان سب کو اس نے کس آسانی سے کھو دیا تھا۔ اسی جے این یو سے وہ سال بھر کے لیے آکسفورڈ گئی تھی جہاں اس کی ملاقات عمران سے ہوئی تھی۔ ایسی ملاقات جس کے بعد اسے محض سفر میں رہنا تھا۔ ...... ہوا پھر سے حکم صادر...... کہ وطن بدر ہوں ہم تم...... ہر اک اجنبی سے پوچھیں...... جو پتا تھا اپنے گھر کا......

❖❖❖

زاہدہ حنا کی سب سے بڑی تخلیقی قوت، وہ روشن خیال نقطۂ نظر ہے جو برصغیر کی تاریخ، تہذیب اور انسانی مستقبل کے حوالے سے کوئی پیچاک نہیں رہنے دیتا۔ وہ خود منقسم ہونے والے خانوادے کے کرب سے گزری ہے اور پھر ایک باشعور قلم کار کے طور پر دنیا کو "گلوبیت" کے فریب میں جکڑ کر اسے نسلی، معاشی اور تہذیبی اعتبار سے تقسیم کرنے والوں کی حکمتِ عملی سے بھی واقف ہے اور اس امتیاز واستحصال کا نشانہ بننے والے مسلمانوں سے ہمدردی کے باوجود وہ مسلم معاشرے کو پسماندہ رکھنے والی حکمران قوتوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ وہ طالبان کی ذہنیت کو ہدف تنقید بناتی ہے تو انہیں چابی کا کھلونا بنانے والوں کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے اور مسلمانوں کے "عظیم فکری ورثے" کی جذباتی مجاوری کرنے والوں کو بھی تاریخی شعور کا آئینہ دکھاتی ہے۔ اس کی کہانیوں کی نئی کتاب "رقصِ بسمل ہے" کی ہر کہانی اذیت اور عقوبت کی زد میں آئے ہر نگر کی کہانی ہے۔ غیروں کی لگائی آگ میں جھلستے افغانستان اور عراق کے ساتھ ساتھ 'اپنوں' کے یک چشم عدل کی لپیٹ میں آنے والے پاکستان، ایران، بنگلہ دیش اور برما کی روداد بھی اس طرح بیان ہوئی ہے کہ طاقت کے زعم میں مبتلا قوتیں اکیسویں صدی میں بھی عورتوں اور بچوں کے جسم وجاں کو گھاؤ لگانا ہی اپنی فتح مندی خیال کرتی ہیں۔ زاہدہ حنا سوال اٹھاتی ہے کہ تاریخ کے المیوں کا بوجھ، امریکا کی بے مہاری، اور 'اپنوں' کا جہل مرکب ایک دردمند اور حساس ناظر کو جس رقصِ بسمل کو دیکھنے پر مجبور کرتا ہے وہ کرب ناک منظر لازوال تو نہیں؟

انوار احمد

ریسرچ انسٹیٹیوٹ آف ورلڈ لینگو ایجز، اوساکا یونیورسٹی، جاپان